اوباما کی آپ بیتی

بارک اوباما ترجمہ: یاسر جواد

حمیدی

اوباما کی آپ بیتی

بارک اوباما

مترجم: یاسر جواد

BOOK HOME

DREAMS FROM MY FATHER
By: Barack Obama

اوباما کی آپ بیتی

مصنف: بارک اوباما
مترجم: یاسر جواد

اہتمام	رانا عبدالرحمٰن
پروڈکشن	ایم سرور
سرورق	ریاظ
کمپوزنگ	محمد انور
پرنٹرز	آب وتاب
اشاعت	2009ء
ناشر	بک ہوم لاہور

بک سٹریٹ 46- مزنگ روڈ لاہور
فون: 7231518-7245072 فیکس: 042-730854
E-mail:bookhome1@hotmail.com - bookhome 1@yahoo.com

فہرست

تیسرا حصہ: کینیا

پیش لفظ

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن شائع ہوئے کوئی پندرہ برس گزر چکے ہیں۔ یہ کتاب لکھنے کا موقعہ لا سکول میں پڑھنے کے دوران ملا جب میں ''ہارورڈ لا ریویو'' کا پہلا افریقی امریکی صدر منتخب ہوا۔ تھوڑی بہت شہرت کی بدولت مجھے ایک پبلشر سے ایڈوانس مل گیا اور میں اپنے خاندان کی کہانی لکھنے اور اس کہانی کو سمجھنے کی کوششوں میں مصروف ہو گیا۔ شاید کہیں کہیں یہ کہانی امریکی تجربے کے کردار میں شامل نسلی افتراق اور شناخت کی سیال حالت بھی لیے ہوئے ہو جو ہماری جدید زندگی کو جزو ہیں۔

پہلی کتاب لکھنے والے تمام مصنفین کی طرح میں بھی اشاعت کے وقت امید اور مایوسی سے بھرا ہوا تھا...... یہ امید کہ کتاب میرے تصور سے بھی زیادہ کامیاب رہے گی، اور یہ مایوسی کہ میں کوئی قابل قدر بات بیان کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ حقیقت کہیں بین بین ہی ہے۔ تبصرے بس ٹھیک ہی آئے۔ فروخت زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھی۔ اور چند ماہ بعد ہی میں اپنی زندگی میں مصروف ہو گیا۔ میں نے جان لیا تھا کہ بطور مصنف میرا کیریئر طویل نہیں۔ مگر اس بات پر خوشی تھی کہ میں نے یہ مرحلہ عزت کے ساتھ طے کر لیا۔

آئندہ دس برس کے دوران میرے پاس سوچ بچار کے لیے بہت کم وقت تھا۔ میں نے 1992ء میں ایک ووٹر رجسٹریشن پروجیکٹ کے لیے انتخاب لڑا، سول حقوق کی پریکٹس شروع کی اور شکاگو یونیورسٹی میں آئینی قانون پڑھانے لگا۔ میری بیوی اور میں نے ایک گھر خریدا، دو بیٹیوں کی رحمت پائی اور بلوں کی ادائیگی کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ 1996ء میں ریاستی مقننہ میں ایک نشست پر انتخابات کا انعقاد ہوا تو کچھ دوستوں نے مجھے اس میں بطور امیدوار حصہ لینے کو کہا۔ میں
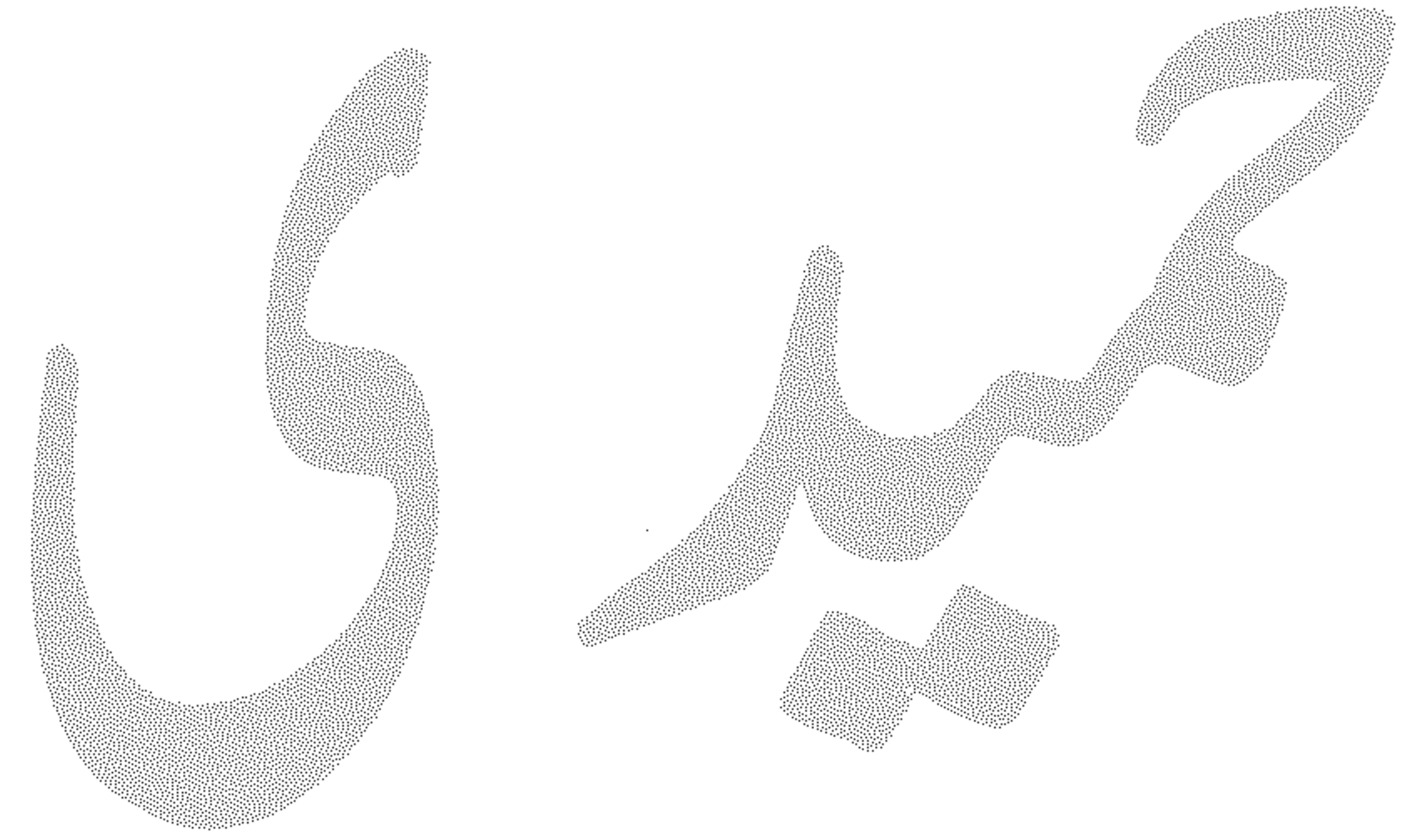
جیت گیا۔ عہدہ سنبھالنے سے قبل مجھے خبردار کیا گیا تھا کہ ریاستی سیاست میں واشنگٹن والی سیاست جیسی شان وشوکت نہیں تھی۔ بہرحال مجھے اپنا کام تسلی بخش لگا کیونکہ آپ کی کاوشوں کے نتائج بہت ٹھوس صورت میں سامنے آتے تھے۔

2004ء میں میں نے الینائی سے یو ایس سینیٹر کے طور پر ڈیموکریٹک امیدوار کے طور پر کامیابی حاصل کی۔ یہ ایک مشکل مقابلہ تھا کیونکہ حریف وسیع فنڈز کے مالک، ماہر اور ممتاز افراد تھے؛ کسی تنظیمی پشت پناہی کے بغیر، عجیب سے نام والے ایک سیاہ فام آدمی کی کامیابی ہرگز ممکن نہیں لگتی تھی۔ چنانچہ جب میں نے ڈیموکریٹک پرائمری میں زیادہ تر ووٹ حاصل کر لیے تو مخالفین نے وہی ردعمل دیا جو ''لاریویو'' جریدے میں میرے انتخاب کے وقت دیا گیا تھا۔ مرکزی مبصرین نے حیرت اور حقیقی امید کا اظہار کیا کہ میری فتح ہماری نسلی سیاست میں ایک وسیع تر تبدیلی کا اشارہ تھی۔ سیاہ فام برادری میری کامیابی کے حوالے سے فخر کرتی تھی۔

اس نئے جوش وخروش نے کتاب کی دوبارہ اشاعت پر اکسایا۔ سالوں بعد پہلی مرتبہ میں نے ایک کاپی نکال کر چند ابواب پڑھے اور غور کیا کہ ان برسوں میں میری آواز میں کتنی تبدیلی آ گئی تھی۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ اکثر جگہوں پر اپنے استعمال کردہ الفاظ پر مجھے غصہ آیا یا کہیں کہیں کوئی جملہ جذباتیت سے بھرپور یا ناقص معلوم ہوا۔ میرا دل کیا کہ کتاب کی قطع وبرید کر کے صرف پچاس صفحات باقی رہنے دوں، کیونکہ میں اختصار کو بہت زیادہ اہمیت دینے لگا تھا۔ تاہم، میں ایمان داری سے نہیں کہہ سکتا کہ اس کتاب میں موجود آواز میری نہیں...... کہ اگر میں آج اپنی کہانی لکھوں تو وہ بہت مختلف انداز میں ہوگی۔

آج اس کتاب کو پڑھتے وقت ایک بہت بڑی اور ڈرامائی تبدیلی کو یاد رکھنا چاہیے۔ جب میں نے لکھنا شروع کیا تو سلیکون ویلی کا مسئلہ زوروں پر تھا اور سٹاک مارکیٹ تیزی سے عروج کی جانب جا رہی تھی۔ دیوار برلن کا گرنا، منڈیلا کا قید سے رہا ہونا، اوسلو میں امن معاہدوں پر دستخط بھی قابل ذکر واقعات ہیں۔ اندرونی ملک بندوقوں اور اسقاط حمل اور ریپ گانوں کی شاعری پر بھی زبردست ثقافتی بحثیں ہونے لگیں۔ بین الاقوامی سطح پر اہل قلم نے تاریخ کے اختتام، فری مارکیٹس

اور لبرل جمہوریت کے سعود کا اعلان کیا۔

اور تب 11 ستمبر 2001ء کے دن دنیا میں دراڑیں پڑ گئیں۔

اس دن کے بارے میں کچھ لکھنا میرے بس سے باہر ہے: جہازوں کا بھوتوں کی طرح فولاد اور شیشے سے ٹکرانا؛ ٹاورز کا آہستہ آہستہ منہدم ہونا؛ گلیوں بازاروں میں راکھ سے بھری ہوئی شبیہیں؛ غیض وغضب اور خوف۔ میں اس برہنہ انکاریت (nihilism) کو سمجھنے کا دکھاوا بھی نہیں کرتا جس کے تحت دہشت گردوں نے یہ کام کیا اور ان کے بھائی اب بھی اسی قسم کے کاموں میں مصروف ہیں۔

میں بس اتنا جانتا ہوں کہ اس روز تاریخ اپنا انتقام لینے آئی تھی؛ کہ درحقیقت (فاکنر کے الفاظ میں) ماضی کبھی مردہ اور مدفون نہیں ہوتا...... وہ کبھی ماضی نہیں گزرتا۔ یہ اجتماعی تاریخ، یہ ماضی براہ راست میرے اپنے ماضی سے منسلک ہے۔ صرف القاعدہ کے بم اپنی سرزمین پر پھٹنے کی وجہ سے ہی ری پبلکن کارندوں نے مخصوص ویب سائٹس پر میرے نام کو بنیاد بنا کر مذاق نہیں اڑایا۔ اس کی وجہ زیر سطح جاری کشمکش بھی ہے...... کثرت اور احتیاج کی دنیا کے درمیان: جدید اور قدیم دنیاؤں کے درمیان۔

میں جانتا ہوں کہ میں نے بے اختیار لوگوں کی مایوسی اور انتشار کو دیکھا ہے: یہ چیز کس طرح جکارتہ یا نیروبی کی گلیوں میں بھی بچوں کی زندگیوں کو اسی طرح مسخ کرتا ہے جیسے شکاگو کی ساؤتھ سائیڈ میں پرورش پانے والے بچوں کو۔ میں جانتا ہوں کہ ذلت اور بے لگام غضب کے درمیان راستہ کس قدر تنگ ہے، کہ وہ کس قدر آسانی سے تشدد اور مایوسی کی راہ پر آ سکتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ صاحب اقتدار لوگ ان رویوں کے جواب میں قید کی سزاؤں کی میعاد بڑھانے اور زیادہ حساس عسکری آلات استعمال کرنے کے سوا کچھ نہیں کرتے۔ میں جانتا ہوں کہ کٹریت، بنیاد پرستی اور قبیلے سے وابستگی ہم سب کے لیے باعث تباہی ہے۔

ان سب چیزوں کے حوالے سے پالیسی پر ایک علیحدہ کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ یہاں میں ایک ذاتی سا نوٹ ہی دوں گا۔

میری اس کتاب کے زیادہ تر کردار بدستور میری زندگی کا حصہ ہیں۔ ماسوائے میری ماں کے، جو کتاب کی اشاعت کے چند ماہ بعد کینسر کا شکار ہوگئی۔ اس نے گزشتہ دس سال اپنے پسندیدہ کاموں اور مشغلوں میں صرف کیے: ایشیا اور افریقہ کے دور دراز دیہات میں فلاحی کام؛ طویل فاصلہ پیدل چلنا، چاند کو گھنٹوں تکنا، دہلی اور مراکیش کے بازاروں میں خریداری کرنا، رپورٹیں لکھا، ناول پڑھنا اور پوتوں کے خواب دیکھنا۔

ہم ایک دوسرے سے اکثر ملتے تھے اور ہمارا تعلق قائم رہا۔ یہ کتاب لکھنے کے دوران اس نے مسودہ پڑھا، کچھ کہانیوں کو درست کیا، اپنے یا میرے باپ کے بارے میں لکھی ہوئی باتوں پر کوئی رائے دینے سے محتاط گریز کیا۔ اس نے اپنی بیماری کو بڑے صبر اور حوصلے سے جھیلا۔ وہ آخری دم تک مجھے اور میری بہن کو زندگی میں آگے بڑھنے کا حوصلہ دلاتی رہی۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر مجھے اس کے زندہ نہ رہنے کا اندازہ ہوتا تو شاید ایک مختلف قسم کی کتاب لکھتا اور اپنی زندگی کے اس مستقل کردار کو محور بناتا۔ میں اپنی بیٹیوں کی شخصیت میں ہر روز اپنی ماں کو دیکھتا ہوں۔ میں یہ بیان کرنے کی کوشش نہیں کروں گا کہ مجھے اس کی موت کا کتنا دکھ ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ میری زندگی میں آنے والی شفیق ترین اور نہایت فراخدل روح تھی، اور یہ کہ میری تمام خوبیاں اسی کی دین ہیں۔

پہلا حصہ

نام و نسب

پہلا باب

اجداد

میری اکیسویں سالگرہ سے چند ماہ بعد کسی اجنبی نے فون کر کے کہا کہ وہ مجھے کوئی خبر سنانا چاہتا ہے۔ اس وقت میں نیویارک میں رہتا تھا...... سیکنڈ اور فرسٹ کے درمیان نائنٹی فورتھ میں جو مشرقی ہارلیم اور بقیہ مین ہیٹن کے درمیان بنتی مٹتی سرحد کا بے نام حصہ تھا۔ یہ بلاک غیر پرکشش، بے درخت اور ویران تھا۔ دونوں طرف راکھ کے رنگ کی، ایلیویٹر سے محروم عمارتیں تھیں جن کا سایہ دن کے زیادہ تر حصے میں پڑتا رہتا۔ ہمارا اپارٹمنٹ چھوٹا سا تھا۔ اس میں حرارت کا خاطر خواہ انتظام نہیں تھا۔ زینے سے نیچے لگی گھنٹی کام نہیں کرتی تھی لہٰذا مہمانوں کو نکڑ پر ایک گیس سٹیشن پہ جا کر فون کرنا پڑتا، جہاں کالے رنگ کا بھیڑیے جتنا ڈابرمین رات کے وقت سخت پہرہ دیتا اور بیئر کی کوئی بھی خالی بوتل اپنے دانتوں میں جکڑ لیتا تھا۔

ان میں سے کسی بھی بات کا میرے ساتھ کوئی زیادہ تعلق نہیں، کیونکہ مجھے زیادہ ملنے والے نہیں آتے تھے۔ ان دنوں میں بے قرار رہتا، میں کام اور ادھورے منصوبوں میں مصروف تھا، اور دوسرے لوگوں کو غیر ضروری خیال کیا کرتا تھا۔ ایسا نہیں کہ مجھے محفل بالکل ہی پسند نہ تھی۔ میں اڑوس پڑوس میں رہنے والے متعدد پیورٹو ریکن افراد کے ساتھ ہسپانوی کھانوں کا تبادلہ بہت خوشی سے کیا کرتا تھا اور کلاسز سے واپس آتے ہوئے اکثر راستے میں رک کر لڑکوں سے گپ شپ کر لیتا تھا۔ اچھے موسم میں میں اور میرا ہم کمرہ ساتھی انگیٹھی کے سامنے بیٹھ کر سگریٹ پیتے اور شہر پر چھائے ہوئے کہر آلود نیلے آسمان کا جائزہ لیتے، یا پڑوس کے بہتر علاقوں میں مقیم گورے لوگوں کو کتوں کے ہمراہ اپنے بلاک سے گزرتے اور انہیں پیشاب وغیرہ کرواتے ہوئے دیکھتے رہتے
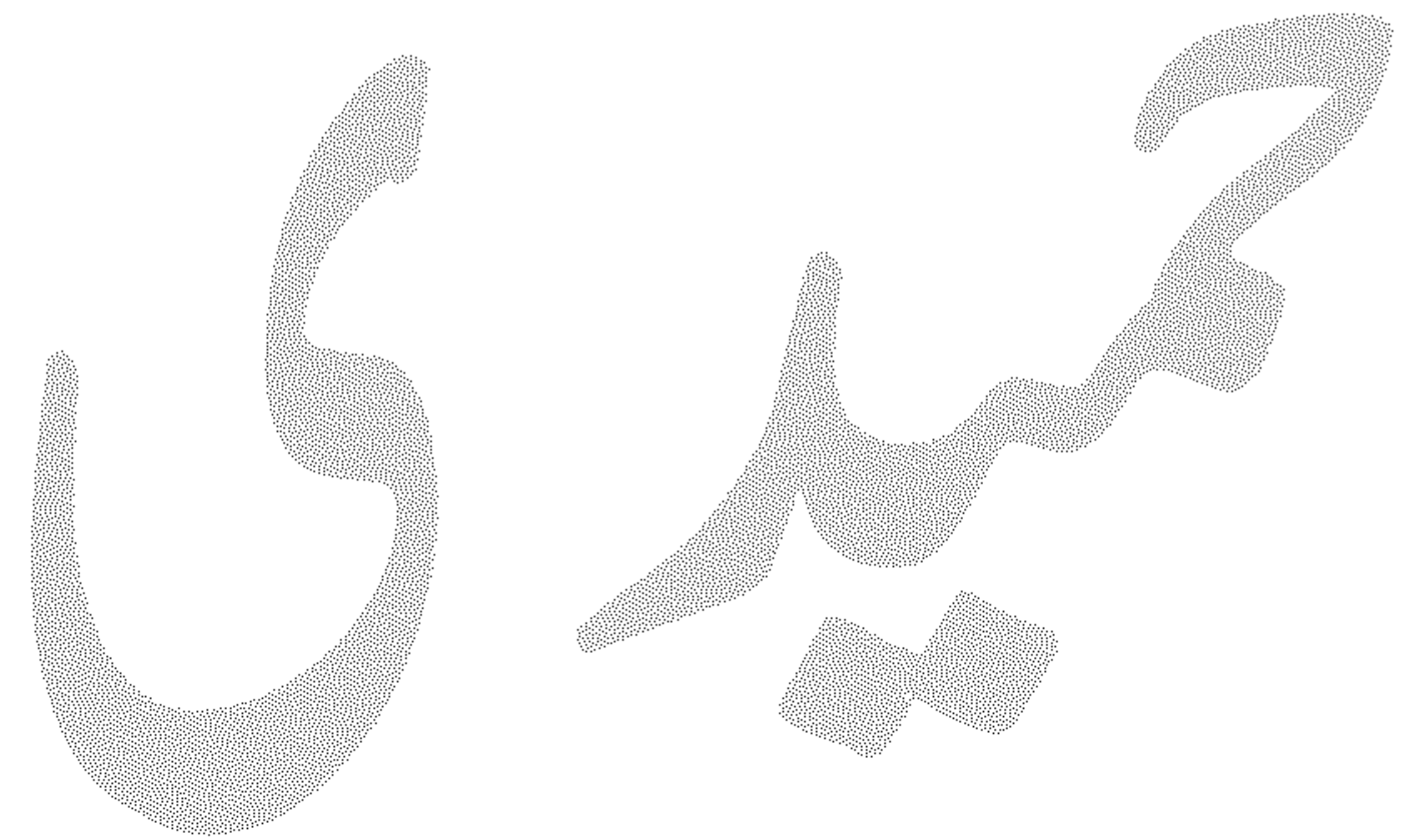
......''تمہارے منہ میں گند، حرام زادو!'' میرا ساتھی متاثر کن انداز میں دھاڑتا اور ہم کتے اور اس کے مالک دونوں پر ہنستے جو سنگدلانہ اور غیر معذرت خواہانہ انداز میں آگے بڑھ جاتے۔

ایسے لمحات میں مجھے بہت لطف محسوس ہوتا، مگر بہت مختصر وقت کے لیے۔ اگر گفتگو بہک جاتی یا سرحد عبور کر کے انسیت میں داخل ہونے لگتی تو میں جلد ہی کوئی بہانہ کر کے اٹھ جاتا۔ میں اپنی محفوظ ترین تنہائی کی راحت کا عادی ہو گیا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ ساتھ والے اپارٹمنٹ میں مقیم ایک بوڑھا بھی میرے جیسے مزاج کا تھا۔ وہ دبلا پتلا، خمیدہ کمر والا بڈھا اکیلا رہتا تھا۔ شاذ و نادر اپنے اپارٹمنٹ سے باہر نکلنے پر اس نے ایک بھاری کالا اوور کوٹ اور بد ہیئت فیڈارا ہیٹ پہن رکھا ہوتا۔ اکثر اوقات جب وہ سٹور سے واپس آ رہا ہوتا تو میرا اس کا سامنا ہو جاتا، اور میں سامان اوپر تک پہنچانے کی پیش کش کرتا۔ وہ میری طرف دیکھ کر کندھے اچکا دیتا۔ تب ہم زینہ چڑھنے لگتے اور ہر منزل پر پل بھر کو رکتے تا کہ وہ اپنی سانس بحال کر لے۔ آخر کار اس کے اپارٹمنٹ کے سامنے پہنچ کر میں تھیلوں کو احتیاط سے فرش پہ رکھ دیتا اور وہ سر ہلا کر شکریہ ادا کرتے ہوئے اندر داخل ہوتا اور چٹخنی چڑھا لیتا۔ ہم نے آپس میں کبھی کوئی بات نہ کی اور نہ ہی کبھی اس نے میری خدمات کا شکریہ ادا کیا۔

بڈھے کی خاموشی میرے لیے متاثر کن تھی؛ میں نے اسے ایک پر محبت روح خیال کیا۔ بعد ازاں میرے ہم کمرہ نے اسے تیسری منزل کی سیڑھیوں پر پڑے پایا...... آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی، ٹانگیں اکڑی ہوئی اور کسی بچے کی طرح گچھا مچھا۔ لوگ جمع ہو گئے؛ چند ایک عورتوں نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور چھوٹے بچوں نے جوش بھری سرگوشیاں کیں۔ انجام کار پیرا میڈیکل کارکن لاش کو اٹھانے آئے اور پولیس بڈھے کے اپارٹمنٹ میں داخل ہوئی۔ وہ کافی ساتھ ستھرا، تقریباً خالی تھا -- ایک کرسی، ایک ڈیسک، گھنی بھنوؤں اور مدھم مسکراہٹ والی ایک عورت کی وقت رسیدہ تصویر آتش دان پر رکھی ہوئی۔ کسی شخص نے ریفریجریٹر کھولا اور میونیز و اچار کی بوتلوں کے پیچھے تقریباً ایک ہزار ڈالر کے نوٹ اخبار میں لپٹے ہوئے ملے۔

منظر کی تنہائی نے مجھ پر اثر ڈالا۔ لمحہ بھر کے لیے مجھے خواہش ہوئی کہ کاش میں اس بڈھے کا نام جانتا۔ تب، تقریباً اچانک مجھے اپنی خواہش پر پچھتاوا ہوا اور دکھ محسوس ہونے لگا۔ مجھے لگا کہ جیسے ہمارے درمیان ایک معاہدے کی خلاف ورزی سرزد ہو گئی ہو...... کہ جیسے اس ویران کمرے

میں بڈھا میرے کان میں ایک ان کہی تاریخ بول رہا تھا، ایسی باتیں بتاتے ہوئے جنہیں سننے کو میں ترجیح نہیں دیتا تھا۔

کوئی ایک ماہ بعد سرد، بے مہر نومبر کی صبح کو سورج بادلوں کے آنچل میں چھپ کر مدھم ہو گیا، اور تب دوسری صدا آئی۔ میں اپنے لیے ناشتہ بنا رہا تھا، چولہے پر کافی رکھی تھی اور دو انڈے فرائی پین میں تھے۔ ہم کمرہ ساتھی نے مجھے فون پکڑایا۔

''باری؟ باری۔ یہ تم ہو نا؟''

''ہاں..... آپ کون ہیں؟''

''ہاں، باری..... میں تمہاری خالہ جین ہوں۔ نیروبی سے۔ تم میری آواز سن رہے ہو نا؟''

''معذرت چاہتا ہوں.... آپ نے کیا بتایا کہ آپ کون ہیں؟''

''خالہ جین۔ سنو، باری، تمہارے باپ کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہ کار حادثے میں مارے گئے ہیں۔ ہیلو؟ تم میری آواز سن رہے ہو نا؟ میں کہہ رہی ہوں کہ تمہارا باپ مر گیا ہے۔ باری، پلیز بوسٹن میں اپنے انکل کو فون کرو اور اسے بتاؤ۔ میں اب بات نہیں کر سکتی، او کے، باری۔ میں تمہیں دوبارہ کال کرنے کی کوشش کروں گی......''

بس اتنی سی بات ہوئی۔ لائن کٹ گئی، اور میں صوفے پر بیٹھ کر کچن میں جلتے ہوئے انڈوں کی خوشبو سونگھنے لگا۔ میں پلستر میں رخنوں پر نظریں گاڑے اپنے نقصان کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

میرا باپ اپنی موت کے وقت تک میرے لیے ایک فسانہ رہا۔ وہ محض ایک انسان نہیں تھا۔ اس نے 1963ء میں ہوائی کو خیر باد کہا جب میری عمر صرف دو سال تھی۔ لہٰذا بچپن میں میں اسے صرف اپنی ماں اور نانا نانی کی سنائی ہوئی کہانیوں کے ذریعے سے جانتا تھا۔ ان سب کہانیوں میں اپنی اپنی خاص بات تھی، ہر ایک دوسری سے جڑی ہوئی اور بار بار استعمال سے ملائم ہو چکی۔ وہ منظر اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے جب گرامپس ڈنر کے بعد اپنی پرانی کرسی سے ٹیک لگا کر وہسکی پیتے اور سگریٹ پیکٹ کے سیلوفین سے دانت صاف کرتے ہوئے اس موقعے کا ذکر کرتا جب میرے باپ نے محض ایک پائپ کی خاطر کسی آدمی کو اٹھا کر Pali Lookout سے باہر پھینک

دیا تھا۔

''سنو۔تمہاری ماں اور باپ نے اس شخص کو جزیرے کی سیر کرانے کا فیصلہ کیا تھا۔ چنانچہ وہ گاڑی میں بیٹھ کر اوپر Lookout کی طرف گئے، اور بارک تقریباً سارا راستہ غلط سائیڈ پر چلتا رہا.....''

ماں نے مجھ پر واضح کیا،''تمہارا باپ خوفناک ڈرائیور تھا۔ وہ برطانوی ڈرائیو کی طرح بائیں طرف چلتا تھا اور اگر آپ کچھ کہتے تو وہ امریکی قواعد اور قوانین کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیتا.....''

''ہاں تو اس موقعے پر وہ بغیر کسی رکاوٹ کے اوپر پہنچے اور ریلنگ پہ کھڑے ہو کر منظر کو سراہنے لگے۔ بارک وہ پائپ پی رہا تھا جو میں نے اسے سالگرہ پر بطور تحفہ دیا تھا۔ اس نے کسی بحری کپتان کی طرح پائپ کو سرے سے پکڑ کر مختلف مناظر کی طرف اشارے کیے.....''

ماں نے دوبارہ لقمہ دیا،''تمہارے باپ کو یہ پائپ واقعی بہت پسند تھا۔ وہ ساری رات پڑھتے ہوئے اس میں تمبا کو نوشی کرتا اور کبھی کبھی......''

''این، تم خود کہانی سنانا چاہتی ہو، یا مجھے اسے مکمل کرنے دوگی؟''

''سوری ڈیڈ، آپ سنائیں۔''

''بہر حال وہ بیچارہ شخص ایک افریقی طالب علم ہی تھا نا؟ تازہ تازہ ڈگری یافتہ۔ بیچارہ نوجوان بارک کو اس انداز میں پائپ پکڑے دیکھ کر متاثر ہوا ہوگا۔ چنانچہ اس نے خود بھی ایسا کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ تمہارے باپ نے لمحہ بھر کے لیے سوچا اور پائپ اسے دے دیا۔ پہلا کش لگانے پر ہی نوجوان کو کھانسی کا شدید دورہ پڑ گیا۔ اسے اتنی زور سے کھانسی آئی کہ پائپ ہاتھ سے نکل کر ریلنگ کے پرے سینکڑوں فٹ نیچے جا گرا۔''

گرامپس نے آگے بتانے سے قبل ٹھہر کر اپنے فلاسک سے ایک اور چسکی بھری۔''اچھا، تو تمہارا باپ اتنا مہربان ضرور تھا کہ اس نے نوجوان کی کھانسی رکنے کا انتظار کیا اور پھر کہا کہ وہ نیچے اترے اور پائپ واپس لائے۔ نوجوان نے آگے جھک کر نیچے جھانکا اور بارک سے کہا کہ وہ اسے نیا پائپ خرید دے گا.....''

''بات بھی ٹھیک تھی،''توت نے کچن سے ہی لقمہ دیا۔ (ہم نانی توتو کو پیار سے توت کہتے تھے جس کا ہوائی کی زبان میں مطلب ''بڑی اماں'' بنتا ہے۔ میری پیدائش کے وقت وہ اتنی کم عمر تھی

کہ اسے نانی کہنا مناسب نہ لگتا تھا۔) گرامپس نے ناگواری کا تاثر دیا مگر اس کی بات کو ان سنا کر گیا۔

''.....لیکن بارک اڑ گیا کہ اسے اپنا پائپ ہی چاہیے کیونکہ وہ ایک تحفہ تھا جس کا کوئی نعم البدل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا نوجوان نے ایک مرتبہ پھر نیچے جھانکا اور دوبارہ انکار کر دیا۔ تب تمہارے باپ نے اسے ہوا میں اوپر اٹھا لیا اور ریلنگ سے پرے پھینکنے کے لیے ہلارے دینے لگا!''

گرامپس نے ہوہو کی آواز نکالی اور اپنی ران پر ہاتھ مارا۔ جب وہ ہنس رہا تھا تو میں نے تصور کیا کہ سورج کے سامنے میرے گہری رنگت والے باپ نے نوجوان کو اوپر اٹھا رکھا ہے اور اس کے بازو ہوا میں جھول رہے ہیں۔ انصاف کا ایک خوفناک منظر۔

ماں نے کچھ تشویش کے ساتھ میری جانب دیکھتے ہوئے کہا،''ڈیڈ، اس نے نوجوان کو ریلنگ کے اوپر نہیں اٹھایا ہوا تھا،'' لیکن گرامپس نے وہسکی کا ایک اور گھونٹ لیا اور آگے بڑھا۔

''اس وقت دوسرے لوگ بھی دیکھنے لگے تھے اور تمہاری ماں بارک کی منتیں کر رہی تھی کہ اسے چھوڑ دے۔ میرا خیال ہے کہ بارک کا دوست بس اپنی سانس روکے دعائیں مانگ رہا تھا۔ بہر حال کوئی دو منٹ بعد تمہارے باپ نے نوجوان کو واپس نیچے آنے دیا، اس کی کمر پر تھپتھپایا اور کہا کہ سب جا کر اپنے لیے بیئر لائیں۔ اور تمہیں معلوم نہیں کہ باقی کی سیر کے دوران تمہارا باپ کیا تاثر دیتا رہا---کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ یقیناً، جب وہ گھر پہنچے تو تمہاری ماں کچھ پریشان تھی۔ دراصل وہ تمہارے باپ سے بات ہی نہیں کر رہی تھی۔ بارک ان معاملات میں کوئی ساتھ نہیں دیتا تھا، کیونکہ جب تمہاری ماں نے ہمیں سارا واقعہ بتانے کی کوشش کی تو اس نے محض تردید میں سر ہلایا اور ہنسنے لگا۔'آرام سے، اینا...'بارک نے اس سے کہا---تمہارے باپ کی آواز بہت گرج دار تھی، اور لہجہ برطانویوں جیسا۔'' نانا نے بھرپور تاثر دینے کے لیے ٹھوڑی گردن کے ساتھ لگا لی۔'' 'آرام سے اینا' وہ بولا۔ 'میں تو اس نوجوان کو صرف سبق سکھانا چاہتا تھا کہ دوسرے لوگوں کی چیزوں کا خیال کیسے رکھتے ہیں۔' ''

گرامپس کھانسی کا دورہ پڑنے تک ہنستا رہتا اور توت بڑبڑاتی کہ اس کے خیال میں بارک کا یہ تسلیم کر لینا اچھی بات تھی کہ پائپ غلطی سے نیچے گرا تھا۔ میری ماں اپنی آنکھیں گھما کر کہتی کہ وہ مبالغہ آرائی کر رہے تھے۔

"تمہارے باپ کو خودسر کہا جا سکتا ہے، لیکن بات صرف اتنی سی ہے کہ وہ نہایت ایماندار شخص ہے۔ یہ چیز کبھی کبھی اسے اکھڑ بنا دیتی ہے،" ماں مسکرا کر مجھے بتاتی۔

وہ میرے باپ کی ایک نسبتاً مہربان تصویر پیش کرنے کو ترجیح دیتی تھی۔ وہ اس موقعے کی کہانی سناتی جب وہ اپنے پسندیدہ لباس......جینز اور چیتے کی کھال جیسے پرنٹ والی پرانی شرٹ...... میں Phi Beta Kappa چابی وصول کرنے آیا تھا۔ "کسی نے اسے نہیں بتایا تھا کہ یہ کتنا بڑا اعزاز ہے، چنانچہ وہ چلتا ہوا سیدھا اندر گیا اور اس خوب صورت کمرے میں موجود ہر شخص کو نفیس لباس میں کھڑے پایا۔ یہ واحد موقعہ تھا جب میں نے اسے بوکھلایا ہوا دیکھا۔"

گرامپس اچانک سوچ میں ڈوب کر اپنے آپ سے اتفاق کرنے لگتا۔ وہ کہتا، "یہ حقیقت ہے، باری! تمہارا باپ کسی بھی صورت حال سے نمٹ سکتا ہے، اور یوں ہر چیز اس کے لیے آسان ہو جاتی ہے۔ یاد ہے جب اسے انٹرنیشنل میوزک فیسٹیول میں گلوکاری کرنا پڑی تھی؟ وہ کچھ افریقی گیت گانے پر رضامند ہو گیا، لیکن وقت آنے پر یہ کام بہت بڑا معلوم ہوا، اور اس سے پہلے فن کا مظاہرہ کرنے والی عورت نیم پروفیشنل گلوکارہ تھی، بھرپور بینڈ کے ساتھ ایک ہوائی کی لڑکی۔ جانتے ہو، کوئی اور ہوتا تو وہیں ہمت ہار دیتا اور بھاگ جاتا۔ لیکن بارک ایسا نہیں تھا۔ وہ سٹیج پر گیا اور وسیع مجمعے کے سامنے گانے لگا --- اور میں بتاتا چلوں کہ یہ کام آسان نہیں --- وہ کوئی اچھا گلوکار نہیں تھا، لیکن اپنے اوپر اس قدر یقین رکھتا تھا کہ آن کی آن میں ہر کوئی اسے سراہنے لگتا۔"

میرا نانا اپنا سر جھٹکتا اور کرسی سے اٹھ کر ٹی وی سیٹ آن کرتا۔ وہ مجھے بتاتا، "ایک چیز ہے جو تم اپنے باپ سے سیکھ سکتے ہو۔ خود اعتمادی۔ کسی بھی انسان کی کامیابی کی کنجی۔"

تمام کہانیاں اسی قسم کی تھیں --- جامع، مبالغہ آمیز، ایک ہی شام میں یکے بعد دیگرے سنائی جا سکنے والی۔ کبھی کبھی یہ کہانیاں میرے خاندان کے حافظے میں مہینوں یا ہفتوں پڑی رہتیں۔ گھر میں میرے باپ کی چند ایک تصویریں ہی باقی بچی تھیں، پرانی بلیک اینڈ وائٹ سٹوڈیو تصاویر جو الماریوں سے کوئی چیز تلاش کرنے کے دوران سامنے آ جاتیں۔ جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے تو میری ماں اپنے مستقبل کے دوسرے شوہر کے ساتھ معاشقہ شروع کر چکی تھی۔ اور میں نے کسی وضاحت کے بغیر محسوس کر لیا کہ تصاویر کو سنبھال کر کیوں رکھ دینا چاہیے۔ لیکن کبھی کبھار

میں اپنی ماں کے ساتھ فرش پہ بیٹھ کر بھربھرے البموں پر پڑی گرد سونگھتا۔ میں اپنے باپ کی مشابہت پر غور کرتا --- گہری رنگت والا ہنستا ہوا چہرہ، نمایاں پیشانی اور موٹے شیشوں والے چشمے جو اسے اپنی عمر سے بڑا دکھاتے تھے --- اور اس کی زندگی کے واقعات کو ایک کہانی میں پروئے ہوئے سنتا۔

مجھے پتا چلا کہ وہ ایک افریقی تھا۔ Luo قبیلے کا ایک کینیائی جو جھیل وکٹوریہ کے کنارے Alego نامی مقام پر پیدا ہوا۔ گاؤں غریب تھا، مگر اس کا باپ...... میرا دادا حسین اونیانگو اوباما...... ایک سرکردہ کاشت کار، قبیلے کا بزرگ، جڑی بوٹیوں سے کرنے کا علاج کا ماہر تھا۔ میرا باپ اپنے باپ کی بکریوں کو چراتے اور برطانوی نوآبادیاتی انتظامیہ کے قائم کردہ مقامی سکول میں پڑھتے ہوئے جوان ہوا اور بڑی حوصلہ افزا کارکردگی دکھائی۔ انجام کار اس نے نیروبی میں پڑھنے کے لیے سکالرشپ حاصل کر لیا؛ اور پھر کینیائی آزادی کی شام کو وہ کینیائی راہنماؤں اور امریکی سپانسرز کی جانب سے یو ایس میں ایک یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے منتخب کر لیا گیا تھا۔ وہ مغربی ٹیکنالوجی سیکھنے اور واپس آ کر جدید افریقہ متشکل کرنے کی خاطر بھیجے گئے افریقیوں کی پہلی کھیپ میں سے شامل تھا۔

1959ء میں تیئس سال کی عمر میں وہ ہوائی یونیورسٹی پہنچا اور اس ادارے کا پہلا افریقی طالب علم تھا۔ اس نے اکانومیٹرکس پڑھی، بے مثال توجہ کے ساتھ کام کیا اور تین سال بعد کلاس میں اول پوزیشن کے ساتھ گریجوایشن کر لی۔ اس نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر انٹرنیشنل سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن بنائی اور اس کا پہلا صدر بنا۔ روسی زبان کے ایک کورس میں اس کی ملاقات انیس سالہ بے ڈھنگی، شرمیلی امریکی لڑکی سے ہوئی اور دونوں محبت میں گرفتار ہو گئے۔ لڑکی کے والدین نے شروع میں تو اعتراض کیا، لیکن اس کی مسحور کن شخصیت اور ذہانت کے آگے ہار مان گئے؛ نوجوان جوڑے نے شادی کر لی اور ایک بیٹے کو جنم دیا۔ اسے ایک اور سکالرشپ ملا --- اس مرتبہ ہارورڈ سے پی ایچ ڈی کرنے کے لیے --- لیکن اپنے نئے خاندان کو ساتھ لیجانے کے پیسے نہیں۔ علیحدگی ہو گئی اور وہ براعظم افریقہ کے ساتھ اپنا کیا ہوا وعدہ نبھانے واپس چلا گیا۔ ماں اور بچہ پیچھے ہی رہے، لیکن محبت کے بندھن پر فاصلے اثرانداز نہ ہو سکے۔

وہاں البم بند ہو جاتا اور میں ایک کہانی کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگتا جس نے مجھے اس وسیع

اور منظم کائنات کے مرکز میں لا کھڑا کیا تھا۔ میری ماں اور نانا نانی کے پیش کردہ مختصر بیان میں بھی مجھے کئی باتیں سمجھ نہیں آئی تھیں۔ لیکن میں شاذ ہی کبھی کوئی تفصیل پوچھتا جس سے ''پی ایچ ڈی'' یا ''نوآبادیت'' (کالونیل ازم) کی گتھی سلجھ پاتی۔ مجھے نقشے پر Alego بھی نہیں مل پایا تھا۔ اس کے بجائے میرے باپ کی زندگی کا راستہ عین وہی تھا جو اپنی ماں کی طرف سے ملنے والی ایک کتاب میں بیان کیا گیا تھا۔ ''Origins'' نامی یہ کتاب دنیا بھر سے اکٹھی کی گئی داستان ہائے تخلیق کا مجموعہ تھا -- پیدائش اور شجر ممنوعہ، پرومیتھیس اور آگ کے تحفے کی کہانیاں، ہندو اسطورہ کا کچھوا جو خلا میں تیرتا اور دنیا کو اپنی پشت پر اٹھائے رکھتا۔ بعد ازاں جب میں فلموں اور ٹیلی ویژن میں دکھائے جانے والے مسرت کے ایک نسبتاً تنگ راستے سے آشنا ہوا تو کئی سوالات تنگ کرنے لگے۔ کچھوا کس چیز پر کھڑا تھا؟ قادر مطلق خدا نے سانپ کو اتنی چھوٹ کیوں دی؟ میرا باپ واپس کیوں نہ آیا؟ لیکن پانچ یا چھ برس کی عمر میں میں ان سربستہ اسرار کو جوں کا توں چھوڑ دینے پر قانع تھا۔ ہر کہانی ایک مقفل راز اور اگلی کہانی جیسی ہی سچی تھی جسے پرسکون خوابوں میں لیجایا جا سکتا تھا۔

اپنے باپ کی شکل وصورت میں اردگرد کے لوگوں کے ساتھ کچھ بھی مشترک نہ ہوتا -- کہ وہ کالا سیاہ اور ماں گوری چٹی تھی -- میرے ذہن پر بمشکل ہی کوئی نقش مرتب کر سکا۔

درحقیقت مجھے صرف ایک کہانی یاد ہے جس کا تعلق نسل کے موضوع سے تھا؛ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ یہ کہانی زیادہ تواتر کے ساتھ سنائی جانے لگی ...... کہ جیسے یہ میرے باپ کی داستان حیات کا جوہر ہو۔ کہانی کے مطابق میرا باپ کافی دیر تک مطالعہ کرنے کے بعد ایک مقامی Waikiki بار میں میرے نانا اور متعدد دیگر دوستوں کی محفل میں گیا۔ سب لوگ خوش تھے، وہ گٹار پر موسیقی سنتے ہوئے کھا پی رہے تھے۔ اچانک ایک گورے آدمی نے جیسے آس پاس بیٹھے ہر شخص کو سنانے کے لیے بآواز بلند بار والے سے کہا کہ وہ ''ایک نیگرو کے ساتھ بیٹھ کر'' اچھی شراب نہیں پیے گا۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا اور لوگ ایک لڑائی کی امید میں میرے باپ کی جانب دیکھنے لگے۔ میرا باپ لڑنے کے بجائے اٹھا، اس شخص کے پاس گیا، مسکرایا اور عدم برداشت کی حماقت، امریکی خواب کے وعدے اور انسان کے ہمہ گیر حقوق پر لیکچر جھاڑنے لگا۔ گرامپس نے بتایا، ''بارک کی بات مکمل ہونے پر وہ شخص اس قدر نادم ہوا کہ اپنی جیب سے ایک سو ڈالر نکال کر بارک کو پکڑا دیے۔'' یہ رقم اس رات کو ہماری موج مستی اور تمہارے باپ کے مہینہ بھر کے کرائے کے

لیے کافی تھی۔''

لڑکپن میں مجھے اس کہانی کی صداقت پر شک ہونے لگا اور اسے بھی بقیہ کہانیوں کے ساتھ ایک طرف رکھ دیا۔ آخر کار کئی برس بعد مجھے ایک جاپانی امریکی شخص کی کال آئی اور بتایا کہ میرا باپ ہوائی میں اس کا ہم جماعت تھا اور اب ایک مڈویسٹرن یونیورسٹی میں پڑھاتا تھا۔ وہ بہت مہربان، اس کی تیز مزاجی پر کچھ پریشان تھا؛ اس نے وضاحت کی کہ ایک مقامی اخبار میں میرا ایک انٹرویو اور میرے باپ کا نام پڑھ کر اس کے ذہن میں یادیں تازہ ہو گئی تھیں۔ پھر گفتگو کے دوران اس نے وہی کہانی دہرائی جو میرا باپ سنا چکا تھا...... کہ کیسے ایک گورے نے میرے باپ کو پیسے دے کر معافی مانگنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے فون پر مجھے کہا، ''میں وہ موقعہ کبھی نہ بھولوں گا۔'' اس کی آواز میں وہی لے تھی جو میں گرامپس کی آواز میں کئی مرتبہ سن چکا تھا۔

نسلوں کے درمیان شادی: یہ الفاظ کبڑے، بدنما، ایک خوفناک نتیجے کا شگون ہیں۔ antebellum (قبل از جنگ) یا octoroon جیسے الفاظ کی طرح یہ بھی ایک اور عہد کی تصویر کشی کرتے ہیں، چابکوں اور شعلوں، مردہ میگنولیا اور منہدم ہوتے دالانوں کی ایک دور دراز دنیا۔ پھر بھی اپنی چھٹی سالگرہ کے سن 1967ء (جب ڈاکٹر کنگ کو نوبیل امن انعام ملے تین سال ہو چکے تھے) سے پہلے تک ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی سپریم کورٹ نے ریاست ورجینیا کو یہ نہیں بتایا تھا کہ نسلوں کے درمیان شادیاں آئین کی خلاف ورزی تھیں۔ 1960ء میں (جب میرے والدین کی شادی ہوئی) نسلوں کے درمیان شادی کو ہنوز یونین کی نصف سے زائد ریاستوں میں ایک سنگین جرم ہی بیان کیا جاتا تھا۔ جنوب کے بہت سے علاقوں میں میرے باپ کو صرف میری ماں پر نظر غلط انداز ڈالنے کے جرم میں ہی درخت سے لٹکا کر پھانسی دے دی جاتی۔ شمال کے نہایت مہذب شہروں میں گھورتی ہوئی نظریں، سرگوشیاں وغیرہ میری ماں جیسے رجحانات رکھنے والی کسی عورت کو حمل گرانے یا پھر بچہ کسی دور دراز خانقاہ میں بھجوانے پر مجبور کر دیتیں۔ ان کے اکٹھے ہونے کا تصور ہی کجرو اور واہیات قرار پاتا۔ سول حقوق کے حامی مٹھی بھر لبرلز لیے یہ ایک بڑا اچھا موقعہ ہوتا۔

بلاشبہ -- لیکن کیا آپ اپنی بیٹی کو کسی کالے سے شادی کرنے دیں گے؟

میرے نانا نانی نے اس سوال کا جواب ہاں میں دیا، چاہے کافی کینہ پروری کے ساتھ ہی۔ مگر یہ سوال مجھے ہمیشہ پریشان کرتا رہا۔ ان کے پس منظر میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی کہ جس کی بنیاد پر اس کی پیش گوئی کی جاسکتی۔ نہ وہ نیو انگلینڈ کے ماورائیت پسند تھے اور نہ ہی بے باک سوشلسٹ۔ درست کہ کنساس نے سول جنگ میں یونین کی طرف سے لڑائی لڑی تھی، لیکن گرامپس مجھے یاد دلانا چاہتا تھا کہ میرے خاندانی تانے بانے کے مختلف دھاگے مل کر غلامی کی پرجوش مخالفت کرتے تھے۔ اگر کہا جاتا تو Toot اپنی چونچ نما ناک دکھانے کے لیے اپنا سر ایک طرف کو موڑ دیتی جو کالی سیاہ آنکھوں کے جوڑے کے ساتھ مل کر چیروکی خون کا ثبوت پیش کرتی تھی۔

لیکن کتابوں کی الماری میں ایک پرانی سرخی مائل تصویر ان جڑوں کے متعلق نہایت بلیغ انداز میں بتاتی تھی۔ اس میں توت کے سکاٹس اور انگلش نسل کے دادا دادی، کھردری اون کا لباس پہنے، بغیر مسکرائے کھڑے تھے، ان کی آنکھیں اپنے سامنے پھیلی دھوپ جلی زندگی پر پچی ہوئی تھیں۔ ان کے چہرے امریکی گوتھک تھے اور ان کی آنکھوں میں آپ وہ صداقتیں دیکھ سکتے تھے جن کا تجربہ میں نے آگے چل کر حقائق کے طور پر کرنا تھا: کہ کنساس نے سول جنگ کی ایک ابتدائی شدید لڑائی کے بعد ہی یونین میں بلامعاوضہ شمولیت صرف اس وقت اختیار کی اور اس لڑائی میں جان براؤن کی تلوار نے پہلی مرتبہ خون چکھا؛ کہ جب میرے پڑداداؤں میں سے ایک کرسٹوفر کولمبس کلارک کو یونین فوجی کا اعزاز ملا تو اس کی بیوی کی ماں کے متعلق افواہ اڑی کہ وہ کنفیڈریسی کے صدر جیفرسن ڈیوس کی سیکنڈ کزن تھی؛ کہ اگرچہ ایک اور دور کا جد امجد خالص چیروکی خون کا مالک تھا، لیکن اس قسم کا سلسلہ نسب توت کی ماں کے لیے کافی شرم ناک تھا۔ جب بھی کوئی اس موضوع پر بات کرتا تو وہ زرد پڑ جاتی اور یہ راز قبر میں ساتھ لے کر جانے کی امید رکھتی تھی۔

ایک دنیا تھی جس میں میرے نانا نانی نے پرورش پائی ...... بے کیف اور چاروں طرف سے سمندر میں گھرا ہوا علاقہ۔ وہ ایک دوسرے سے صرف بیس میل کے فاصلے پر پلے بڑھے -- میری نانی آگستا میں، میرا نانا ایل ڈوریڈو میں -- اتنے چھوٹے قصبات کی سڑکوں کے نقشے میں ان کے نام نمایاں حروف میں لکھنے کی ضرورت نہیں محسوس کی جاتی۔ مجھے بتائی ہوئی باتوں کے مطابق ان کے بچپن چھوٹے سے قصبے میں، معاشی بدحالی کے دور والے امریکہ میں گزرے: چار جولائی کی پریڈز اور تصاویر ایک بارن کی اطراف میں دکھاتی ہیں؛ ایک مرتبان میں جگنو اور سیبوں جیسے

میٹھے ٹماٹروں کا ذائقہ؛ گرد باد، ژالہ باری اور کسان لڑکوں سے بھرے ہوئے کلاس رومز۔ ان لڑکوں کے اونی انڈر ویئر سردیوں کے آغاز پر سیئے جاتے تھے اور مہینے گزرنے پر ان سے سوروں جیسی بو آنے لگتی۔

حتیٰ کہ بینکوں کا ڈوبنا اور فارم کی قبل از وقت بندش بھی نانا نانی کی یادداشت کے تکلے سے گزر کر رومانوی لگتی۔ اس دور کی کٹھنائی لوگوں کو قریب لے آئی۔ سب کے درد مشترک تھے۔ چنانچہ آپ کو ان کی جوانی کے دور کے ان کہے ضابطے اور لطیف مراتب شناخت کرنے کے لیے غور سے سننا پڑتا تھا۔ آپ کو ان لوگوں کے امتیازات نظر آتے جن کے پاس زیادہ کچھ نہیں تھا اور لامکان کے وسط میں زندگی گزار رہے تھے۔ اس کا تعلق نام نہاد احترام کی قابلیت سے تھا...... کچھ لوگ قابل احترام تھے اور کچھ زیادہ قابل احترام نہیں تھے...... اور اگرچہ آپ کو قابل احترام بننے کے لیے امیر ہونا ضروری نہیں تھا، لیکن اگر محترم نہ ہوتے تو اس کے لیے بہت سخت محنت کرنا پڑتی۔

توت کا گھرانہ قابل احترام تھا۔ اس کا باپ معاشی بدحالی کے سارے عرصے میں ایک مستقل ملازمت کا حامل رہا۔ وہ سٹینڈرڈ آئل کے لیے آئل لیز کی دیکھ بھال کرتا۔ اس کی ماں بچوں کی پیدائش سے قبل نارمل سکول میں پڑھاتی تھی۔ گھرانہ اپنے گھر کو صاف ستھرا رکھتا اور ڈاک کے ذریعے ''عظیم کتب'' منگواتا؛ وہ بائبل پڑھتے لیکن باقاعدہ عبادت گاہ جانے کے بجائے میتھوڈزم کی سیدھی سادی صورت کو ترجیح دیتے جس میں شوق و زہد دونوں پر عقل کو فضیلت حاصل تھی۔

میرے نانا کی جائے قیام زیادہ مشکلات کا شکار تھی۔ میرے باپ اور اس کے بڑے بھائی کی پرورش کرنے والے نانا نانی مال دار نہیں تھے، لیکن وہ شائستہ، خدا سے ڈرنے والے باپٹسٹ تھے جو وچیٹا کے آس پاس تیل کے کنوؤں پر کام کر کے پیٹ پالتے۔ تاہم، کسی نہ کسی طرح گرامپس تھوڑا باغی ہوگیا تھا۔ کچھ ایک پڑوسیوں نے اس کی ماں کی خودکشی کا ذکر کیا: آٹھ سالہ سٹینلے نے ہی اس کی لاش پڑی ہوئی دیکھی تھی۔ دیگر پڑوسی اپنا سر جھٹکتے ہوئے کہتے: لڑکا اپنے آوارہ باپ پر گیا ہے۔ بلاشبہ وہی اپنی ماں کی بدنصیب موت کی وجہ تھا۔

وجہ چاہے کچھ بھی ہو، لیکن گرامپس کی ساکھ بے بنیاد نہیں لگتی تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں اسے پرنسپل کے ناک پر گھونسا مارنے کی وجہ سے ہائی سکول سے نکال دیا گیا۔ آئندہ تین برس کے دوران وہ شکاگو اور کیلی فورنیا میں خراب قسم کی نوکریاں کرتا رہا۔ وہ بتایا کرتا تھا کہ اسے وچیٹا کے آس پاس

سفر کرنا پسند تھا جہاں اس کا اور توت دونوں کا گھرانہ اس وقت تک منتقل ہو چکا تھا، اور توت اس کی تردید نہ کرتی۔ یقیناً توت کے والدین نوجوان کے متعلق سنی ہوئی کہانیوں کو سچ مانتے اور نوخیز معاشقے کو سختی سے ناپسند کرتے تھے۔ توت جب پہلی مرتبہ گرامپس کو اپنے گھر والوں سے ملانے لائی تو اس کے باپ نے میرے نانا کے کالے سیاہ بالوں پر نظر ڈالی اور بغیر وارنش کے صوفے پر بیٹھنے کی دعوت دی۔

''وہ کسی گنوار جیسا لگتا تھا۔''

میری نانی نے کوئی پروانہ کی۔ اس نے ہائی سکول سے تازہ تازہ ہوم اکنامکس کی ڈگری لی تھی اور ادب آداب سے تنگ آئی ہوئی تھی۔ اس کی نظر میں میرے نانا کا قد و قامت متاثر کن تھا۔ کبھی کبھی میں انہیں جنگ سے قبل کے برسوں میں ہر امریکی قصبے میں تصور کرتا ہوں -- نانا تھیلا نما پینٹ اور کلف لگی انڈر شرٹ میں، اڑی ہوئی رنگت والا ہیٹ، بہت زیادہ لپ سٹک اور رنگے ہوئے بالوں والی اس باتونی لڑکی کو ایک سگریٹ پیش کرتے ہوئے۔ وہ اسے بڑے شہروں، کبھی نہ ختم ہونے والی شاہراہ، خالی گرد سے اٹے میدانوں سے اپنے فرار کے متعلق بتا رہا ہے جہاں بڑے منصوبوں کا مطلب بینک مینیجر کی ملازمت اور تفریح کا مطلب ایک آئس کریم سوڈا اور سنڈے میٹنی (Matinee) ہے، جہاں خوف اور تخیل کا فقدان آپ کے خوابوں کا گلا اس طرح گھونٹتے ہیں کہ آپ کو اپنے پیدائش کے دن ہی پتا چل جاتا ہے کہ آپ کہاں مریں گے اور آپ کو کون دفن کرے گا۔ میرے نانا کا اصرار تھا کہ وہ اس طرح اپنا اختتام نہیں کرے گا۔ اس کے خواب اور منصوبے ہیں۔ وہ میری نانی میں ایک سیلانی تمنا جاگزیں کردے گا جو ان دونوں کے پیش روؤں کو برسوں پہلے اٹلانٹک اور نصف براعظم پار لائی تھی۔

وہ پرل ہاربر پر بمباری سے عین پہلے بھاگ نکلے اور میرے نانا کو فوج میں طلب کر لیا گیا۔ اس موقع پر میرے ذہن میں کہانی اسی طرح تیزی سے آگے بڑھتی ہے جیسے پرانی فلموں میں کیلنڈر کے صفحات الٹتے ہوئے، ہٹلر، چرچل اور روزویلٹ کے بیانات پر مشتمل شہ سرخیوں کو بم حملوں میں سے ابھرتے ہوئے دکھایا جاتا تھا۔ میں اپنی ماں کو ایک فوجی اڈے میں جنم لیتے دیکھتا ہوں جہاں گرامپس کی تعیناتی ہوئی ہے؛ میری نانی Rosie the Riveter ہے جو بمبار جہازوں کی اسمبلی لائن پر کام کرتی ہے؛ پیٹن کے دستے میں شامل میرا نانا فرانس کی کیچڑ میں لتھڑا ہوا ہے۔

گرامپس حقیقی لڑائی میں حصہ لیے بغیر ہی واپس آیا اور خاندان کیلی فورنیا روانہ ہوا جہاں اس نے برکلے کے مقام پر GI bill کے تحت اندراج کروایا۔ لیکن کلاس روم اس کے عزائم اور بے چینی کی تسکین نہیں کر سکتا تھا لہٰذا کنبے نے پہلے کنساس کا رخ کیا اور پھر ٹیکساس کے مختلف قصبات سے ہوتا ہوا انجام کار سیاٹل پہنچا جہاں اتنا عرصہ تک قیام کیا کہ میری ماں نے اپنا ہائی سکول مکمل کر لیا، گرامپس نے بطور فرنیچر سیلز مین ملازمت کی؛ انہوں نے ایک مکان خریدا اور برج کھیلی۔ انہیں خوشی تھی کہ میری ماں سکول میں ذہین نکلی، البتہ جب اسے شکاگو یونیورسٹی میں داخلے کی پیش کش ہوئی تو میرے نانا نے اسے روک دیا اور فیصلہ کیا کہ وہ ابھی اتنی کم عمر ہے کہ اکیلی نہیں رہ سکتی۔

اور شاید اس مقام پر کہانی میں ٹھہراؤ آ گیا: ایک گھر، ایک کنبہ، ایک قابل احترام زندگی۔ بس میرے نانا کے دل میں کوئی کھلبلی ضرور مچی رہی ہوگی۔۔ میں اسے بحرالکاہل کے کنارے پر کھڑے تصور کر سکتا ہوں -- بال مستقل سفید ہو چکے، بلند قامت مائل بہ فربہی، افق کی قوس سے بھی نیچے کچھ گھورتے ہوئے، نتھنوں میں آئل رِگز اور مکئی آفتاب رسیدہ زندگیوں کی مہک جو اس کے خیال میں وہ پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ چنانچہ جب فرنیچر کمپنی کے مینیجر نے ذکر کیا کہ وہ ہونولولو میں ایک نیا سٹور کھولنے کا ارادہ رکھتا ہے اور وہاں کاروبار کے بے پناہ مواقع موجود ہیں تو وہ اسی روز اپنے گھر کی طرف بھاگا اور میری نانی سے مکان بیچنے، دوبارہ سامان باندھنے، اور مغرب میں ڈوبتے سورج کی طرف ایک مرتبہ پھر اپنا سفر شروع کرنے کے متعلق گفتگو کی......

میرا نانا ہمیشہ سے ایسا ہی تھا، ہمیشہ ایک نئی شروعات کا متلاشی، ہمیشہ مانوس سے گریزاں۔ جس وقت کنبہ ہوائی میں پہنچا تو اس کا کیریئر پوری طرح بن چکا تھا -- خوش کرنے کا شوق اور فراخ دلی، شائستگی اور وطن پرستی کا ایک انوکھا ملغوبہ، جذبے کا کھرا پن جو اسے بیک وقت بے احتیاط اور زود پذیر بھی بناتا تھا۔ اس کا کردار امریکی قسم کا تھا، بالکل اپنی نسل کے مردوں جیسا جنہوں نے آزادی اور انفرادیت کا نظریہ سینے سے لگا رکھا تھا اور جن کا ذوق و شوق دوسری عالمی جنگ کے ہیروز کے ساتھ ساتھ مکارتھی ازم کی بزدلی تک بھی لے جا سکتا تھا۔ ایسے مرد جو اپنی اساسی معصومیت کی وجہ سے خطرناک اور پرعزم بھی تھے؛ انجام کار مایوسی سے دوچار ہونے والے مرد۔

البتہ 1960ء میں ابھی تک میرے نانا کی آزمائش نہیں ہوئی تھی؛ مایوسیوں سے بعد میں

سابقہ ہوا، مگر دھیرے دھیرے، کسی بدل کرر کھ دینے والے تشدد کے بغیر۔ اپنے ذہن کی گہرائی میں وہ خود کو ایک آزاد خیال، حتیٰ کہ ایک بوہیمیائی تصور کرنے لگا تھا۔ اس نے خاص موقعوں پر شعر لکھے، جاز سنا، یہودیوں کی تعداد گنی جو فرنیچر کا کاروبار کرنے کے دوران اس کے قریب ترین دوست بن گئے تھے۔ باقاعدہ مذہب کے ساتھ واحد بے تکلفی میں اسے یہ خیال پسند آیا کہ مقامی یونی ٹیرین تمام بڑے مذاہب کے صحائف سے استفادہ کرتے تھے (وہ کہتا، "یوں سمجھ کہ آپ کو ایک میں ہی پانچوں مذہب مل گئے۔") بالآخر توت نے چرچ کے متعلق خیالات پر اسے ڈانٹ پلائی ("یسوع کا نام لو شیٹلے، مذہب ناشتے کا سامان خرید نے جیسا معاملہ نہیں ہوتا!") لیکن اگرچہ میری نانی فطرتاً زیادہ متشکک تھی اور گرامپس کے کچھ ایک انوکھے نظریات سے اختلاف رکھتی تھی، لیکن اس کی اپنی ہٹ دھرم آزادی، اپنے ذہن سے کام لینے پر اصرار نے عموماً انہیں تقریباً متفق کر ہی دیا۔ ان سب چیزوں نے انہیں مبہم سا لبرل بنا دیا، البتہ ان کے خیالات کبھی کوئی نظریۂ حیات نہ بن سکے؛ وہ اس حوالے سے بھی امریکی تھے۔ چنانچہ ایک روز جب میری ماں گھر آئی اور ہوائی یونیورسٹی میں ملنے والے ایک دوست، افریقی طالب علم اوباما کا ذکر کیا تو ان کے دل میں اسے کھانے پر بلانے کا خیال آیا۔ شاید گرامپس نے سوچا ہو کہ بے چارہ لڑکا اپنے وطن سے اتنی دور تنہائی محسوس کرتا ہو گا۔ توت نے خود سے کہا ہو گا کہ بہتر ہے اس پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ جب میرا باپ دروازے پر پہنچا تو شاید گرامپس اپنے ایک پسندیدہ گلوکار Nat King Cole کے ساتھ اس کی مشابہت پر حیران ہوا ہو۔ میں اسے تصور میں اپنے باپ سے سوال کرتا ہوا دیکھتا ہوں کہ کیا وہ گا سکتا ہے۔ میری ماں ضرور ناک بھوں چڑھا رہی ہو گی۔ گرامپس نے غالباً اپنے پرانے لطیفے سنائے ہوں یا سٹیکس پکانے کے طریقے پر توت سے بحث کی ہو۔ توت نے اپنا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر بیٹھا پیش کیا ہو گا: اس کی جبلتیں اسے خوامخواہ مسئلہ کھڑا کرنے سے خبردار کر دیتی تھیں۔ شام کے اختتام پر ان دونوں نے نوجوان کی ذہانت کو سراہا جو نپے تلے انداز میں ایک ٹانگ دوسرے پر رکھے بیٹھا تھا...... اور اس لہجے کے متعلق کیا خیال تھا!!

لیکن کیا وہ اپنی بیٹی کو اس قسم کے شخص سے شادی کرنے کی اجازت دیتے؟

اس وقت تک تو ہمیں علم نہیں ہو پاتا؛ یہاں تک کی کہانی زیادہ کچھ واضح نہیں کرتی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس دور کے بیشتر امریکیوں کی طرح انہوں نے بھی کبھی حقیقتاً سیاہ فاموں کے متعلق نہیں

سوچا تھا۔ جم کرو میرے نانا نانی کی پیدائش سے کافی پہلے کنساس میں شمال کی طرف آیا تھا، لیکن کم از کم وچیٹا کے آس پاس یہ اپنی نہایت غیر رسمی، دھیمی صورت میں نظر آتا تھا، عمیق جنوب پر چھائے ہوئے تشدد سے عاری۔ گوروں کے درمیان زندگی پر حاکم ان کہے ضوابط ہی نسلوں کے باہمی رابطے کو کم سے کم سطح پر رکھتے؛ جب کالے لوگ میرے نانا نانی کی یادداشتوں کے کنساس میں آہی جاتے تو ان کا ذکر محض سرسرا ہے آتا...... ملازمت کی تلاش میں آئل فیلڈز کے آس پاس گھومنے والے سیاہ فام؛ گوروں کے کپڑے دھو کر لانے یا گھریلو کام کرنے والی سیاہ فام عورتیں۔ کالے موجود ہوتے ہوئے بھی موجود نہیں تھے...... سائے جیسی، خاموش موجودگی جو جوش اور نہ ہی خوف کو تحریک دلاتی تھی۔

جنگ کے بعد میرے گھرانے کے ٹیکساس منتقل ہونے سے پہلے تک ان کی زندگیوں میں نسل کے سوالات پیدا نہ ہوئے۔ وہاں اپنے ملازمت کے پہلے ہفتے میں گرامپس کو فرنیچر کے کچھ سیلز مین نے مشورہ دیا کہ سیاہ فام اور میکسیکی گاہک ڈھونڈے جائیں: "اگر گہری رنگت والے لوگ سامان کو دیکھنا چاہتے تو انہیں مخصوص وقت پر آنا اور اپنا سامان لیجانے کا بندوبست خود کرنا ہوتا تھا۔" بعدازاں جس بینک میں توت کام کرتی تھی وہاں اس کی دوستی دراز قامت اور بارعب سیاہ فام صفائی والے سے ہو گئی جس نے دوسری عالمی جنگ میں حصہ لیا تھا۔ توت کو اس کا نام صرف مسٹر ریڈ کے طور پر یاد تھا۔ ایک روز وہ دونوں ہال وے میں کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ دفتر کا ایک سیکرٹری تیز تیز چلتا ہوا اس کے پاس آیا دھیمی آواز میں سمجھایا کہ توت کبھی کسی نیگرو کو "مسٹر" کہہ کر نہ بلائے۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ توت نے مسٹر ریڈ کو عمارت کے ایک کونے میں اکیلے بیٹھے روتے دیکھا۔ وجہ پوچھنے پر اس نے اپنی کمر سیدھی کی، آنکھیں پونچھیں اور جوابی سوال کر دیا:

"میں نے آج تک ایسا کیا کیا ہے کہ میرے ساتھ ایسا سلوک ہو رہا ہے؟"

اس روز تو میری نانی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، لیکن سوال اس کے ذہن میں معلق رہا۔ گرامپس اور وہ کبھی کبھی سونے سے پہلے اس بارے میں کچھ بات بھی کرتے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ توت مسٹر ریڈ کو بدستور "مسٹر" ہی کہتی رہے گی، حالانکہ وہ آمنا سامنا ہونے پر کنی کترا کر نکل جایا کرتا تھا۔ گرامپس اپنے ساتھی کارکنوں کی جانب سے بیئر پینے باہر جانے کی دعوتیں مسترد کرنے لگا۔ وہ ان سے کہتا کہ اسے بیوی کی خوشی کی خاطر گھر پہنچنا ہے۔ وہ کم آمیز اور ایک مبہم خطرے سے

بھرے ہوئے رہنے لگے، کہ جیسے قصبے میں ہمیشہ کے لیے اجنبی ہوں۔

اس نئی بری فضا نے میری ماں پر سب سے زیادہ اثر ڈالا۔ تب اس کی عمر گیارہ بارہ برس ہو گی۔ وہ دمے کی بیماری سے شفایاب ہوتی ہوئی اکلوتی اولاد تھی۔ مرض اور متعدد مرتبہ رہائش کی تبدیلیوں نے اسے کچھ تنہائی پسند بنا دیا تھا -- خوش مزاج اور نرم خو مگر کتاب بینی یا تنہا چہل قدمی پر مائل۔ توت کو پریشانی ہوئی کہ اس کی تازہ ترین تبدیلی رہائش نے بیٹی کی تنہائی پسندی کو مزید واضح بنا دیا تھا۔ نئے سکول میں میری ماں نے چند ایک ہی دوست بنائے۔ اسے نام کی وجہ سے بےبہانہ طنز و مزاح کا نشانہ بننا پڑتا: سٹینلے این (گرامپس کا ایک فضول خیال -- کیونکہ وہ بیٹے کا خواہش مند تھا)۔ ہم جماعت اسے سٹینلے سٹیمر کہہ کر چھیڑتے۔ Stan the Man۔ توت کام سے گھر واپس آ کر عموماً اپنی ماں کو دالان میں اکیلے بیٹھے پاتی۔ وہ اپنی ٹانگیں جھلا رہی ہوتی یا گھاس پر لیٹی ہوتی اپنی سی تنہا دنیا میں محو۔

ماسوائے ایک دن کے۔ اس گرم، بے ہوا دن کو جب توت گھر پہنچی تو باڑ کے باہر بچوں کا ایک مجمع لگا دیکھا۔ توت قریب گئی تو ہنسی کی آوازیں آئیں۔ بچوں کے چہرے غصے اور نفرت سے کھنچے ہوئے تھے۔ وہ اتار چڑھاؤ والی بلند آوازوں میں نعرے لگا رہے تھے:

"Nigger lover!"

"Dirty Yankee!"

"Nigger lover!"

بچے توت کو دیکھ کر منتشر ہو گئے۔ لیکن ایک بچے نے جاتے جاتے اپنے ہاتھ میں پکڑا پتھر باڑ کے اوپر سے پھینک دیا۔ توت کی نظروں نے تعاقب کیا اور پتھر کو ایک درخت کے نیچے رکتے دیکھا۔ اور وہاں اسے اس سارے جوش خروش کی وجہ نظر آئی: میری ماں اور تقریباً اس کی عمر کی ایک سیاہ فام لڑکی پیٹ کے بل گھاس پر لیٹی ہوئی تھیں، ان کی سکرٹس گھٹنوں تک اوپر اٹھی ہوئی، پیروں کے پنجے مٹی میں دھنسے ہوئے، سر ہتھیلیوں پر دھرے اور میری ماں کی ایک کتاب پر جھکے ہوئے۔ دور سے دونوں لڑکیاں درخت کے سائے تلے مکمل شانت لگتی تھیں۔ دروازہ کھولنے پر ہی توت کو محسوس ہوا کہ سیاہ فام لڑکیاں تھر تھر کانپ رہی تھی اور میری ماں کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ لڑکیاں خوف کے باعث مفلوج اور بے حس و حرکت وہیں پڑی رہیں۔ آخر توت نیچے جھکی اور

دونوں کے سر پہ ہاتھ رکھے۔

وہ بولی، "اگر تم دونوں نے کھیلنا ہے تو خدا کے لیے اندر چلی جاؤ۔ آؤ، دونوں۔" اس نے میری ماں کو اٹھایا اور دوسری لڑکی کی طرف بھی ہاتھ بڑھایا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پاتی، وہ لڑکی یک دم بھاگ کھڑی ہوئی اور لمبی ٹانگوں پر دوڑتی ہوئی گلی میں غائب ہو گئی۔

یہ واقعہ سن کر گرامپس بہت غصے میں آیا۔ اس نے میری ماں سے پوچھ گچھ کی، نام کاغذ پر لکھے۔ اگلے روز اس نے چھٹی لی تاکہ سکول کے پرنسپل سے ملاقات کر سکے۔ اس نے کچھ قابل سزا بچوں کے والدین کو بلوایا اور سمجھایا۔ ہر بڑے سے بات کرنے پر اسے ایک ہی قسم کا جواب ملا:

"مسٹر ڈرہم، بہتر ہے کہ تم اپنی بیٹی سے بات کرو۔ اس قصبے میں گوری لڑکیاں کالی لڑکیوں کے ساتھ نہیں کھیلا کرتیں۔"

یہ جاننا مشکل ہے کہ ان واقعات کو کتنی وقعت دی جائے، کیا مستقل روابط بنے یا ٹوٹے، یا آیا وہ صرف بعد کے واقعات کی روشنی میں ہی دیکھے جا سکتے ہیں۔ گرامپس نے میرے ساتھ بات کرتے ہوئے ہمیشہ یہی کہا کہ کنبے نے جزواً اس قسم کی نسل پرستی سے ناپسندیدگی کے باعث ہی ٹیکساس چھوڑا تھا۔ توت زیادہ زیرک تھی؛ تنہائی میں اس نے ہمیشہ مجھے یہی بتایا کہ انہوں نے گرامپس کی ملازمت اچھی نہ ہونے کی وجہ سے ٹیکساس چھوڑا، اور چونکہ سیاٹل میں ایک دوست نے کچھ بہتری کی امید دلائی تھی۔ اس کے مطابق "نسل پرستی" کا لفظ بھی تب تک ان کے ذخیرۂ الفاظ کا حصہ نہیں بنا تھا۔ "تمہارے نانا اور میں نے سوچا کہ ہمیں لوگوں کے ساتھ شائستگی سے پیش آنا چاہیے۔ اور بس۔"

میری نانی اس لحاظ سے عقل مند ہے۔ وہ بلند بانگ جذبات اور حد سے بڑھے ہوئے دعووں پر شک کرتی اور عقل سلیم پر قانع رہتی ہے۔ اسی لیے میں واقعات کے متعلق اس کے بیان پر زیادہ بھروسہ کرتا ہوں؛ میرا نانا اپنی تاریخ کو ایسے انداز میں دوبارہ ترتیب دینے پر مائل ہے کہ اسے من چاہے رنگ میں رنگ سکے۔

اس کے باوجود میں گرامپس کی یادداشتوں کو محض ڈینگیں قرار دے کر مسترد نہیں کرتا۔ میں ایسا اس لیے نہیں کر سکتا کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ وہ کتنی شدت سے انہیں سچ کرنا چاہتا تھا، چاہے

اسے یہ کام کرنے کا انداز معلوم نہ بھی ہو۔ مجھے شبہ ہے کہ ٹیکساس کے بعد سیاہ فام لوگ اس کے ان فسانوں کا جزو بن گئے۔ سیاہ رنگ نسل کی حالت زار، ان کا دکھ، ان کے زخم گرامپس کے ذہن میں اپنے دکھوں اور زخموں کے ساتھ مدغم ہو گئے: غائب باپ اور ایک بدنامی کا اشارہ، چھوڑ کر چلی جانے والی ماں، یہ احساس کہ وہ سنہرے بالوں والا لڑکا نہیں تھا -- کہ وہ ایک 'گنوار' جیسا لگتا تھا۔ اس کی جبلتوں نے اسے بتایا کہ نسل پرستی ماضی کا ایک جزو تھی، روایت اور احترامیت اور رتبے کا حصہ، معنی خیز مسکراہٹوں اور سرگوشیوں کا حصہ جنہوں نے اسے باہر کھڑے رہ کر دیکھنے پر مجبور کیا۔

میرے خیال میں وہ جبلتیں کچھ اہمیت رکھتی ہیں: میرے نانا نانی کی نسل اور پس منظر والے بہت سے گوروں کے لیے جبلتیں مخالف سمت میں جاتی تھیں، ہجوم کی سمت میں۔ اور اگرچہ گرامپس کا میری ماں کے ساتھ تعلق ہوائی پہنچنے کے وقت تک تناؤ کا شکار ہو چکا تھا...... وہ اس کے غیر مستحکم پن اور غصے کے دوروں کو کبھی معاف نہ کر سکی اور اس کے گنوار، غیر شائستہ انداز و اطوار پر شرمسار ہونے لگی تھی...... لیکن یہ ماضی کو محو کرنے کے لیے اس کی خواہش، دنیا کو نئے سرے سے بنانے کے امکان پر یہ اعتماد ہی تھا جو اس کی پائیدار ترین میراث ثابت ہوا۔ چاہے گرامپس نے محسوس کیا ہو یا نہ، اپنی بیٹی کو ایک سیاہ فام آدمی کے ساتھ دیکھنے پر اس کے اپنے دل کی ایک نادیدہ گہرائی میں ایک کھڑکی کھل گئی تھی۔

اس قسم کی خود آگہی قابل رسائی ہونے پر بھی میری ماں کی منگنی کو اس کے لیے ہرگز قابل درگزر نہیں بناتی تھی۔ دراصل شادی ہونے کا انداز اور مقام ہنوز باعث ملال ہے، ایک تفصیل نامہ جسے کھوجنے کی ہمت مجھے ابھی تک نہیں ہو سکی۔ حقیقی شادی، ایک کیک، انگوٹھی، دلہن کی رخصتی کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں۔ تقریب میں کسی گھرانے نے شرکت نہ کی؛ یہ بھی واضح نہیں کہ پیچھے کنساس کے لوگوں کو پوری طرح خبر تھی یا نہیں۔ بس ایک چھوٹی سی تقریب، برائے نام۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے پر سارا واقعہ بہت نازک لگتا ہے، بہت گڑبڑ کا شکار اور بے ترتیب۔ اور شاید میرے نانا نانی کی بھی یہی نیت تھی، ایک آزمائش، محض وقت کا مسئلہ، جب تک کہ وہ اپنا بالائی ہونٹ بھینچے رکھتے اور کوئی تباہ کن حرکت نہ کرتے۔

اگر ایسا تھا تو انہوں نے نہ صرف میری ماں کے خاموش عزم صمیم کو غلط سمجھا بلکہ اپنے جذبات کی رو کو بھی نہ سمجھ پائے۔ پہلے بچے نے جنم لیا، آٹھ پونڈ دو اونس، پیروں اور ہاتھوں کی دس دس

انگلیاں اور خوراک کا بھوکا۔ اب وہ کیا کرتے؟

تب زمان و مکان ساز باز کرنے لگے، ممکنہ بدنصیبی قابل برداشت اور حتیٰ کہ باعث تفاخر بننے لگی۔ چند مرتبہ میرے باپ کے ساتھ بیئر پینے کے بعد گرامپس اپنے داماد کو سیاست یا معیشت پر، وائٹ ہال یا کریملن جیسے دور افتادہ مقامات کے متعلق گفتگو کرتے سنتا اور خود کو مستقبل میں دیکھتے ہوئے تصور کرتا۔ اس نے اخبارات زیادہ غور سے پڑھنا شروع کر دیے۔ اس نے امریکہ کے نئے اجتماعیت پسندانہ نکتۂ نظر کے متعلق ابتدائی رپورٹیں دیکھیں اور اپنے ذہن میں فیصلہ کیا کہ دنیا سکڑ رہی تھی، ہمدردیاں بدل رہی تھیں؛ کہ وچیٹا سے آیا ہوا گھرانہ درحقیقت کینیڈی کے "نیو فرنٹیئر" اور ڈاکٹر کنگ کے شان دار خواب کی اگلی صفوں میں آ گیا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ امریکہ انسانوں کو خلا میں بھیجے اور پھر بھی اپنے سیاہ فام شہریوں کو غلام رکھے؟ انتہائی بچپن کی یادوں میں سے ایک یہ ہے کہ میں اپنے نانا کے کاندھوں پہ بیٹھا خلا بازوں کو کامیاب لینڈنگ کے بعد Hickam ایئر بیس پر اپالو مشن سے نیچے اترتے دیکھ رہا ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ چشموں والا خلا باز بہ مشکل ہی نظر آ رہا تھا۔ لیکن گرامپس قسم اٹھا کر کہتا تھا کہ ایک خلا باز نے مجھے دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلایا تھا اور جواب میں میں نے بھی ہاتھ ہلایا۔ یہ اس کی خود سے بنی ہوئی کہانی کا حصہ تھا۔ سیاہ فام داماد اور اپنے گندمی پوتے کے ساتھ گرامپس خلائی دور میں داخل ہو گیا تھا۔

اور اس نئی مہم پر روانگی کے لیے یونین کے تازہ ترین رکن ہوائی سے بہتر مقام اور کیا ہو سکتا تھا؟ آج ریاست کی آبادی چار گنا بڑھ جانے کے باوجود میں بچپن میں اپنے اٹھائے ہوئے اولین قدم کھوج سکتا ہوں اور جزائر کے حسن پر سحر زدہ رہ جاتا ہوں۔ بحرالکاہل کا تھرتھراتا ہوا نیلا میدان۔ کائی سے ڈھکی چٹانیں اور مینوآ آبشار کا ٹھنڈا جھرنا، ادرک کے پھول اور درختوں کی چوٹیوں پر نادیدہ پرندوں کی چہچہاہٹ۔ شمالی ساحل کی طوفانی موجیں، سلو موشن ریل کی طرح سرکتی ہوئیں۔ پالی کی چوٹیوں کے سائے؛ جذبات خیز، معطر ہوا۔

ہوائی!! 1959ء میں میرے نووارد گھرانے کو یہ ضرور یوں لگا ہو گا کہ جیسے فوجوں کی بھگدڑ اور کٹھور تہذیب سے تنگ آ چکی زمین خود زمرد پتھر کے اس سلسلے میں آن دبکی تھی جہاں دنیا بھر سے آئے ہوئے پہل کار دھوپ جلے بچوں کو بسا سکتے تھے۔ منسوخ شدہ معاہدوں اور مبلغوں کی لائی ہوئی بیماری کے ذریعے دیسی اہل ہوائی کی بدنما تسخیر؛ امریکی کمپنیوں کا زرخیز آتش فشانی مٹی کو گنے

اور اناس کے باغات کے لیے تیار کرنا؛ معاہدے کے تحت ملازمتوں کا نظام جس نے جاپانی، چینی اور فلپینو تارکین وطن کو انہی کھیتوں میں طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک مصروف کار رکھا؛ جنگ کے دوران جاپانی امریکیوں کی آزمائشی بھرتی --- یہ سب کچھ حالیہ تاریخ تھا۔ پھر بھی میرے گھرانے کی آمد کے وقت یہ سب کچھ اجتماعی حافظے سے محو ہو چکا تھا، جیسے جلتا ہوا سورج صبح کی دھند کو غائب کر دیتا ہے۔

آپس میں بہت منتشر قوت رکھنے والی متعدد نسلیں موجود تھیں جنھوں نے مین لینڈ کے سخت گیر نظام ذات کو نافذ کیا؛ اور سیاہ فام اس قدر کم تھے کہ گوروں اور کالوں کی علیحدگی کے حامی لوگ بھی یہ جانتے ہوئے مزے سے چھٹیاں منا سکتے تھے کہ ہوائی میں نسلی اختلاط کا پیچھے وطن کے طے شدہ نظام سے بہت کم تعلق تھا۔

چنانچہ روایت تشکیل پذیر ہوئی کہ ہوائی حقیقی معنوں میں ایک نقطۂ تحلیل تھا، نسلی ہم آہنگی کے حوالے سے ایک تجربہ۔ میرے نانا نانی اور بالخصوص گرامپس (جس کا فرنیچر کے کاروبار کی بدولت مختلف قسم کے لوگوں سے رابطہ بنا) نے باہمی افہام و تفہیم کا نصب العین اپنا لیا۔ ڈیل کارنیگی کی "How to Win Friends and Influence People" کی ایک پرانی کاپی اب بھی اس کے بک شیلف پر رکھی ہے۔ اور بڑا ہونے پر اس نے مجھے اپنے مخصوص باتونی انداز میں بتایا کہ اس کے لیے اپنے گاہکوں کی مدد کرنا لازمی تھا۔ وہ خاندان کی تصاویر نکالتا اور مانوس ترین اجنبی کو اپنی داستان حیات پیش کرتا؛ وہ کسی ڈاکیے کا ہاتھ زور سے دباتا یا ریستورانوں میں ویٹرسوں کو گھسے پٹے لطیفے سناتا تھا۔

میں اس مسخرے پن پر بہت جھنجھلاتا، لیکن پوتے کی نسبت زیادہ عفو پسند لوگ اس کے تجسس کو سراہتے؛ اگرچہ وہ کبھی زیادہ بارسوخ نہ بن سکا، لیکن دوستوں کا ایک خاصا وسیع حلقہ بنا لیا۔ فریڈی نامی ایک جاپانی امریکی، جو ہمارے گھر کے قریب ایک چھوٹی سی دکان چلاتا تھا، ہمیں رعایتی نرخوں پر اشیا دے دیتا تھا۔ گاہے بگاہے میرے نانا کے سٹور پر کام کرنے والے دیسی باشندے ہمیں دعوت پر بلاتے اور گرامپس بڑے شوق سے بھونا ہوا سور کھاتا۔ (توت گھر پہنچنے تک سگریٹ پیتی اور پھر اپنے لیے انڈوں کی بھجیا تیار کرتی۔) کبھی کبھی میں گرامپس کے ہمراہ Ali's Peak پر جاتا جہاں اسے بوڑھے فلپینو مردوں کے ساتھ شطرنج کھیلنا پسند تھا جو سستے سگار پیتے اور پان کی

پیک تھوکتے۔ اور مجھے آج بھی یاد ہے کہ ایک روز صبح سویرے، سورج نکلنے سے گھنٹوں پہلے، ایک پرتگیزی آدمی (جسے میرے نانا نے ایک صوفہ سیٹ پر کافی رعایت دی تھی) ہمیں Kailua Bay سے پرے مچھلیوں کے شکار پر لے گیا۔ چھوٹی سی کشتی پر کیبن سے ٹنگی گیس لالٹین کی روشنی میں میں ان آدمیوں کو سیاہ پانیوں میں چپو چلاتے دیکھتا رہا۔ ان کی فلیش لائٹس کی روشنی سطح سے نیچے تک جگمگاتی اور پھر کسی بڑی سی مچھلی کو تڑپتے ہوئے باہر نکال لیا جاتا۔ گرامپس نے مجھے ہوائی کی زبان میں اس کا نام بتایا: humu-humu-nuku-apuaa۔ ہم گھر پہنچنے تک سارا راستہ یہ نام دوہراتے رہے تھے۔

اس قسم کے حالات میں میرے نسب نے نانا نانی کو کچھ مسائل سے دوچار کیا، اور انہوں نے فوراً ہی ویسا تحقیر آمیز رویہ اپنایا جو جو مقامی رہائشی اس قسم کے مسائل بیان کرنے والے اجنبیوں کی جانب اپناتے تھے۔ کبھی کبھی جب گرامپس دیکھتا کہ سیاح مجھے ریت میں کھیلتے ہوئے دیکھ رہے ہیں تو ان کے قریب آ کر باحترام انداز میں بتاتا کہ میں ہوائی کے پہلے بادشاہ کامیہامیہا کا پڑپوتا ہوں۔ وہ مسکرا کر مجھے بتایا کرتا تھا، "مجھے یقین ہے باری کہ تمہاری تصویر ہزاروں سکریپ بکس میں موجود ہے -- اڈاہو سے لے کر مین تک۔" میرے خیال میں یہ کہانی مبہم ہے۔ میں اسے سخت مشکلات سے گریز کی ایک حکمت عملی سمجھتا ہوں۔ اور گرامپس فوراً ایک اور کہانی سنا دیتا تھا -- ایک سیاح کے متعلق جس نے ایک روز مجھے تیرتے ہوئے دیکھا اور میری اصلیت سے واقف نہ ہونے کے باعث بولی کہ "ان ہوائی والوں کے لیے تو تیرنا فطری بات ہے۔" جس پر اس نے جواب دیا کہ یہ اندازہ لگانا تو بہت مشکل ہے، کیونکہ "اتفاق سے یہ لڑکا میرا نواسا ہے، اس کی ماں کا تعلق کنساس سے اور باپ کا کینیا سے ہے، اور ان دونوں میں سے کسی بھی علاقے میں میلوں تک کوئی سمندر نہیں۔" میرے نانا کی نظر میں نسل کوئی ایسی چیز نہیں تھی کہ جس کے بارے میں آپ کو حقیقی پریشان ہونا پڑے؛ اگر مخصوص علاقوں میں لاعلمی ابھی تک مضبوط جڑیں رکھتی تھی تو یہ محفوظ انداز میں فرض کیا جا سکتا تھا کہ باقی کی دنیا آپ کو جلد ہی پا لے گی۔

آخرکار مجھے اندازہ ہوا کہ میرے باپ کی تمام کہانیاں دراصل کس بارے میں تھیں۔ ان کہانیوں میں مرکزی کردار کے متعلق کم اور ارد گرد کے لوگوں میں ہونے والی تبدیلیوں کے متعلق زیادہ کچھ بتایا گیا تھا۔ ان میں وہ باعث رکاوٹ عمل بیان کیا گیا تھا جسے میرے نانا نانی کے نسلی

روّیوں نے تبدیل کیا۔ کہانیوں نے ایک جذبے کو زبان عطا کی جس نے کینیڈی کے انتخاب اور ووٹنگ رائٹس ایکٹ کی منظوری کے درمیانی عرصے میں قوم کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا: تنگ نظر پر ہمہ گیریت کی بدیہی فتح، ایک نئی روشن دنیا جس میں نسل و ثقافت کے اختلافات ہدایت دیتے اور مسرور کرتے اور شاید ترفع بھی دیتے تھے۔ یہ ایک مفید فسانہ تھا جو مجھے بھی اسی طرح رجھاتا ہے جیسے میرے گھر والوں کے سروں پہ سوار تھا۔ یہ محض بچپن سے آگے تک پھیلے ہوئے گمشدہ باغ عدن کی جھلک دکھلاتا ہے۔

مسئلہ بس ایک تھا: میرا باپ گمشدہ تھا۔ اس نے بہشت کو خیر باد کہہ دیا تھا اور میری ماں یا نانا نانی کچھ بھی ایسا نہ بتا سکے جو اس واحد، ناقابل حل حقیقت کو جھٹلا سکتا۔ ان کی کہانیوں سے یہ پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ کیوں چلا گیا۔ وہ بتانے سے قاصر رہے کہ اگر وہ نہ جاتا تو کیا ہوتا۔ مسٹر ریڈ، یا ٹیکساس کی سڑک پر سرپٹ دوڑتی ہوئی سیاہ فام لڑکی کی طرح میرا باپ کسی اور کی کہانی کا ایک کردار بن گیا۔ ایک پر کشش کردار -- سونے کے دل والی ایک اجنبی شبیہ، ایک پر اسرار اجنبی جو قصبے کو بچاتا اور لڑکی بطور انعام حاصل کرتا ہے -- مگر محض ایک کردار ہی۔

میں اپنی ماں یا نانا نانی کو اس کا حقیقی ملزم نہیں ٹھہراتا۔ میرا باپ شاید اس تصور کو ترجیح دیتا جو انہوں نے اس کے متعلق تخلیق کیا تھا -- درحقیقت وہ شاید اس تصور کی تخلیق میں مدد ہی کرتا۔ ''ہونولولو سٹار بلیٹن'' میں اس کی گریجوایشن کے متعلق شائع ہونے والے ایک مضمون میں وہ ایک ذمہ دار، مضبوط کردار کا مالک، مثالی طالب علم، اپنے براعظم کا سفیر نظر آتا ہے۔ وہ دبے الفاظ میں یونیورسٹی انتظامیہ پر تنقید کرتا ہے کہ نئے آنے والے طلبا کو ڈارمیٹریوں میں دھکیل دیا جاتا اور ایسے پروگرامز میں شمولیت پر مجبور کیا جاتا جن کا مقصد ثقافتی تفہیم کو فروغ دینا تھا --- اس کے خیال میں یہ عملی تربیت سے ایک انحراف تھا۔ اگرچہ اس نے خود تو مسائل کا سامنا نہیں کیا، لیکن وہ مختلف نسلی گروہوں کے درمیان واقع ہونے والی خود بخود علیحدگی اور واضح امتیاز کا سراغ لگاتا ہے۔ لیکن اس نے آخر میں ایک خوش کن بات کہی: دیگر ملک ہوائی سے ایک چیز یہ سیکھ سکتے ہیں کہ مشترکہ بہتری کی جانب بڑھنے کے لیے نسلوں کو کس طرح مل کر کام کرنا ہے -- ایک ایسا کام جو اس نے دیگر جگہوں پر گوروں کے لیے ناپسندیدہ پایا۔

جب میں سکول میں پڑھ رہا تھا تو یہ مضمون دریافت کیا، تہ کر کے اپنے پیدائشی سرٹیفکیٹ اور

پرانے ویکسی نیشن فارمز کے درمیان رکھ دیا۔ یہ بہت مختصر سا ہے اور میرے باپ کی تصویر بھی دی ہوئی ہے۔ میری ماں کا یا میرا کوئی ذکر نہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ ایسا میرے باپ نے قصداً کیا یا اپنی طویل روانگی کو ذہن میں رکھتے ہوئے۔ شاید رپورٹر میرے باپ کے سخت گیر انداز کی وجہ سے ذاتی نوعیت کے سوال نہ پوچھ پایا؛ یا شاید ایڈیٹر نے اس تفصیل کو اضافی سمجھ کر حذف کرنے کا فیصلہ کیا ہو۔ میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ کیا میرے والدین اس تفصیل کی عدم موجودگی پر آپس میں الجھے ہوں گے یا نہیں۔

اس وقت کم عمری میں مجھے پتا نہیں ہوگا کہ ایک زندہ باپ کی بھی اسی طرح ضرورت تھی جیسے ایک نسل کی۔ ایک خلاف قیاس مختصر مدت کے لیے لگتا ہے کہ میرا باپ بھی میری ماں اور نانا نانی والے سحر میں گرفتار ہوا، اور میری زندگی کے پہلے چھ برس میں اگرچہ یہ سحر ٹوٹ گیا اور اپنے خیال میں پیچھے رہ چکی دنیاؤں نے اپنا آپ جتایا، تو میں ان کے خوابوں والی جگہ پر جا بسا۔

دوسرا باب

انڈونیشیا میں...... نیا باپ

سفارت خانے کو جانے والی سڑک ٹریفک سے اٹی ہوئی تھی: کاریں، موٹرسائیکلیں، رکشے، بسیں اور ویگنیں اپنی گنجائش سے زیادہ بھری ہوئی، پہیوں اور ٹانگوں کا ایک جلوس جس میں شریک سب لوگ دوپہر کی حرارت سے پناہ حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ ہم بہ مشکل چند فٹ آگے جاتے، رکتے، کوئی کھلی جگہ دیکھتے اور دوبارہ رک جاتے۔ ہمارے ٹیکسی ڈرائیور نے چیونگ گم چباتے اور سگریٹ پیتے لڑکوں کے ایک ٹولے کو گالیاں دے کر سامنے سے ہٹایا، ایک موٹرسکوٹر پہ سوار کنبے کو -- باپ، ماں، بیٹا اور بیٹی -- کچلے جانے سے بمشکل بچایا۔ سڑک کی ایک طرف سرانگ (Sarong - روایتی ملائشیائی لباس) میں ملبوس جھریوں زدہ نسواری عورت تنکوں سے بنی ٹوکری میں تازہ پھل لیے کھڑی تھی اور دو مکینک ایک کھلے گیراج کے سامنے پیروں کے بل بیٹھے انجن کو ھولتے ہوئے مکھیوں کو ہاتھ سے اڑاتے جا رہے تھے۔ ان کے پیچھے نسواری مٹی کا ایک گڑھا تھا جس میں جلتے ہوئے کوڑے کے درمیان دو لڑکے دیوانہ وار ایک کالی مرغی کو پکڑنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ کیچڑ، مکئی اور کیلوں کے چھلکوں پر ان کے پیر پھسلے، وہ خوشی سے چلاتے ہوئے بھاگتے رہے اور گرد آلود سڑک سے پرے غائب ہو گئے۔

ہائی وے پہ پہنچنے پر صورت حال کچھ بہتر ہوگئی اور ٹیکسی نے ہمیں سفارت خانے کے سامنے اتار دیا جہاں عمدہ وردی میں ملبوس دو میرینز نے سر ہلا کر ہمیں سلام کیا۔ دالان کے اندر پہنچے تو گلی کے شوروغل کی جگہ مالیوں کے قینچوں کی مترنم آواز نے لے لی۔ میری ماں کا باس چھوٹے چھوٹے بالوں والا ایک سیاہ فام تھا کنپٹیوں پر سفیدی نمایاں ہونے لگی تھی۔ اس کی ڈیسک پر امریکہ کا ایک

چھوٹا سا جھنڈا رکھا تھا۔ اس نے آگے جھک کر زوردار انداز میں مصافحہ کیا، ''کیسے ہو نوجوان؟'' اس کے پاس سے آفٹرشیو کی مہک آ رہی تھی اور کلف لگا کالر گردن کی جلد میں دھنسا جا رہا تھا۔ میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ اسے اپنی تعلیمی پیش رفت کے متعلق بتایا۔ دفتر کی فضا ٹھنڈی اور خشک تھی، پہاڑی چوٹی کی فضا جیسی: خالص اور تیز ہوا۔

ہماری ملاقات ختم ہوئی، میری ماں نے مجھے لائبریری میں بٹھایا اور خود کوئی کام کرنے چلی گئی۔ میں نے اپنی کامِک بکس اور ماں کا دیا ہوا ہوم ورک ختم کیا، اور پھر کرسی پہ چڑھ کر کتابیں دیکھنے لگا۔ زیادہ تر کتابیں کسی نو سالہ بچے کی دلچسپی کی نہیں تھیں -- عالمی بینک کی رپورٹس، جیولوجیکل سروے، پانچ سالہ ترقیاتی منصوبے۔ لیکن ایک کونے میں مجھے ''لائف'' میگزین کے شمارے ایک شفاف پلاسٹک بائنڈرز میں رکھے دکھائی دیے۔ میں نے چمک دار اشتہارات والے صفحات پلٹے -- گڈ ایئر ٹائرز اور ڈاجز فیور، زینتھ ٹی وی، اور کیمپ بیل سوپ..... جب کسی خبر کے ساتھ لگی تصویر دیکھتا تو کیپشن پڑھنے سے قبل سٹوری کے موضوع کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا۔ پتھر لگی گلیوں میں کھیلتے کودتے ہوئے فرانسیسی بچوں کی تصویر: یہ ایک خوشی کا منظر تھا، سکول کی محنت سے فراغت کے بعد ڈھونڈنے اور چھپنے کا کھیل؛ ان کی ہنسی آزادی کا تاثر دیتی تھی۔ ایک جاپانی عورت چھوٹی سی ننگی بچی کو خالی ٹب میں اٹھائے ہوئے: یہ اداس منظر تھا؛ بچی بیمار تھی، اس کی ٹانگیں مڑی ہوئیں اور سر پیچھے کی طرف ڈھلکا ہوا، ماں کے چہرے پر دکھ کا ایک تناؤ، شاید وہ خود کو ملامت کر رہی تھی.....

انجام کار میری نظر ایک بوڑھے کی تصویر پر پڑی جو کالے رنگ کے چشمے لگائے اور رین کوٹ پہنے ایک خالی سڑک پر چلتا جا رہا تھا۔ میں اندازہ نہ لگا سکا کہ یہ تصویر کس کے بارے میں تھی؛ موضوع میں کچھ بھی غیر معمولی نہیں لگتا تھا۔ اگلے صفحے پر ایک اور تصویر تھی، اسی آدمی کے ہاتھوں کا ایک کلوز اپ۔ ان میں ایک عجیب غیر فطری سی زردی تھی، کہ جیسے گوشت میں سے سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ واپس پچھلی تصویر دیکھنے پر مجھے اس آدمی کے گھنگھریالے بال، موٹے اور چوڑے ہونٹ، موٹی ناک..... سب کچھ میں ایک غیر ہموار بھوت نما تاثر۔

میں نے سوچا کہ وہ شخص ضرور شدید بیمار ہوگا۔ شاید شعاع ریزی کی زد میں آیا ہوا یا کوئی البینو...... میں نے چند روز قبل سڑک پر بھی اس قسم کا ایک شخص دیکھا تھا اور میری ماں نے مجھے ان چیزوں

کے متعلق بتایا تھا۔ تصویر کے ساتھ لکھے الفاظ پڑھنے پر ہی پتا چلا کہ اصل بات کچھ اور تھی۔ اس آدمی نے اپنی جیب سے رقم خرچ کر کے اپنی رنگت کو ہلکا کرنے کی خاطر کیمیائی علاج کروایا تھا۔ اس نے کچھ پچھتاوے کا اظہار کیا کہ وہ خود کو گوروں میں شمار کروانا چاہتا تھا اور صورت حال پر شرمسار تھا۔ لیکن نتائج کو بدلنا ناممکن تھا۔ امریکہ میں اس جیسے ہزاروں سیاہ فام مردوں اور عورتوں نے اشتہارات پڑھ کر یہی علاج کروایا تھا تاکہ گورے کے طور پر خوشی حاصل کر سکیں۔

مجھے اپنے چہرے اور گردن پر تمتماہٹ محسوس ہوئی۔ پیٹ میں گرہ سی پڑ گئی؛ لفظ دھندلانے لگے۔ کیا میری ماں کو اس بات کا علم تھا؟ اس کے باس کا کیا خیال ہوگا...... وہ اس قدر پرسکون کیوں تھا؟ مجھے شدید خواہش ہوئی کہ اپنی کرسی سے اٹھوں، انہیں یہ مضمون دکھاؤں اور تصدیق کروں۔ لیکن کسی چیز نے مجھے روکے رکھا۔ خواب ناک حالت میں جیسے اس نئے خوف نے مجھے گونگا کر دیا تھا۔ ماں کے آنے تک میں نے چہرے پر مسکراہٹ طاری کر لی تھی اور میگزین اپنی جگہ پر واپس جا چکے تھے۔ کمرہ اور اس کی فضا پہلے جیسی پرسکون تھی۔

اس وقت ہمیں انڈونیشیا میں رہتے ہوئے تین سال ہو چکے تھے، کیونکہ میری ماں نے لولو نامی ایک انڈونیشیائی شخص سے شادی کر لی تھی جو اسے ہوائی یونیورسٹی میں ملا۔ ہوائی کی زبان میں اس کے نام کا مطلب ''دیوانہ'' بنتا تھا جس پر گرامپس آخری لمحے تک اعتراض کرتی تھی۔ لیکن یہ مفہوم اس شخص پر موزوں نہیں تھا، کیونکہ لولو اچھے آداب کا مالک تھا۔ وہ درمیانے قد کا، گندمی، خوب رو، کالے بالوں اور ایسے نقوش والا تھا کہ اسے بہ آسانی میکسیکی یا ساموآئی بھی خیال کیا جا سکتا تھا؛ وہ ٹینس اچھی کھیلتا تھا، اس کی مسکراہٹ غیر معمولی طور پر ہموار اور مزاج مستحکم تھا۔ دو سال، یعنی میری چار تا چھ سال کی عمر تک اس نے گرامپس کے ساتھ شطرنج کے طویل میچ کھیلے اور میرے ساتھ دھینگا مشتی کی۔ جب میری ماں ایک روز مجھے بتانے بیٹھی کہ لولو نے اسے شادی کی پیش کش کی تھی اور وہ اس کے ساتھ ایک دور دراز مقام پر منتقل ہونا چاہتی تھی، تو میں حیران رہ گیا اور کوئی اعتراض نہ کیا۔ میں نے ماں سے پوچھا کہ کیا وہ اس سے محبت کرتی ہے -- اس وقت تک مجھے ان چیزوں کی اہمیت کا اندازہ ہو چکا تھا۔ ماں کی ٹھوڑی تھرک گئی، جیسا کہ آنسو روکنے کی کوشش میں اکثر ہوا کرتا تھا، اور اس نے مجھے پکڑ کر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ میں نے خود کو بہت بہادر محسوس کیا، البتہ اس احساس کی وجہ معلوم نہ تھی۔

لولو اس کے فوراً بعد ہوائی سے چلا گیا اور میری ماں اور میں نے کئی ماہ تیاریوں میں صرف کیے -- پاسپورٹس، ویزے، ہوائی ٹکٹ، ہوٹل کی بکنگ، اور تصویروں کا غیر مختتم سلسلہ۔ جب ہم پیکنگ کر رہے تھے تو میرے نانا نے ایک اٹلس نکال کر مجھے دکھائی اور انڈونیشیا کے مجموعۂ جزائر میں ناموں پر نشانات لگائے: جاوا، بورنیو، سماٹرا، بالی۔ اس نے کہا کہ بچپن میں جوزف کونرڈ کی تحریریں پڑھنے کی وجہ سے اسے چند ایک نام یاد تھے۔ اس وقت سپائس آئی لینڈ کہلانے والے جزائر کے نام پراسراریت میں لپٹے ہوئے تھے۔ نانا نے بتایا: ''یہاں کہا گیا ہے کہ وہاں اب بھی شیر پائے جاتے ہیں، اور اورنگ اوتان بھی۔'' اس نے کتاب سے نظریں اٹھائیں اور اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ''یہاں کہا گیا ہے کہ وہاں headhuntes بھی موجود ہیں!'' دریں اثنا توت نے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں فون کر کے پوچھا کہ کیا وہ ملک مستحکم تھا۔ جواب ملا کہ صورت حال کنٹرول میں تھی۔ پھر بھی اس نے زور دیا کہ ہم کھانے پینے کی چیزوں کے کئی ٹرنک بھر لیں: ٹینگ، خشک دودھ، سارڈین کے کین۔ اس نے مستحکم لہجے میں کہا، ''پتا نہیں وہ لوگ کیا کھاتے ہوں گے۔'' ماں نے سرد آہ بھری، لیکن توت نے مجھے اپنا حمایتی بنانے کی خاطر ٹافیوں کے کئی پیکٹ میری جانب اچھال دیے۔

آخر کار ہم دنیا کے دوسرے حصے میں جانے کے لیے پین ایم جیٹ پر سوار ہوئے۔ میں نے لمبے بازوؤں والی سفید شرٹ اور سرمئی ٹائی پہن رکھی تھی۔ ایئر ہوسٹس نے مجھے بہت سے پزل اور مونگ پھلی لا دی۔ جاپان میں تین دن قیام کے دوران ہم ہڈیاں یخ کر دینے والی بارش میں چل کر کاماکورا کے مقام پر کانسی کا بدھ دیکھنے گئے اور جھیلوں میں سے گزرتی ہوئی کشتی سبز چائے والی آئس کریم کھائی۔ شام کے وقت میری ماں فلیش کارڈز کا مطالعہ کیا کرتی تھی۔ چمکتی دھوپ والے دوزخ جیسے تپتے جکارتہ میں جہاز سے اترتے ہوئے میں نے ماں کا ہاتھ تھام لیا، کہ جیسے کسی آئندہ صورت حال میں خود کو محفوظ رکھنا چاہ رہا ہوں۔

لولو ہمیں لینے آیا ہوا تھا۔ وہ کچھ بھاری ہو گیا تھا اور اب ایک گھنی مونچھ اس کی مسکراہٹ کے اوپر سجی تھی۔ اس نے میری ماں کو گلے سے لگایا، مجھے اٹھا کر ہوا میں اچھالا اور بتایا کہ ایک چھوٹے قدر کے دبلے پتلے شخص کے پیچھے چلتے جائیں جو ہمارا سامان کسٹمز کی لائن کے پاس سے گزار کر

سیدھا کار کے قریب لے آیا۔ وہ آدمی بیگ رکھتے ہوئے مسکرایا اور میری ماں نے اسے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر اس نے بس ہنس کر سر ہی ہلا دیا۔ لوگ ہمارے گرد جمع ہو گئے اور ایک نامانوس اور اجنبی زبان میں تیز تیز کچھ بولنے لگے۔ ہم نے کافی دیر تک لولو کو نسواری یونیفارم والے سپاہیوں کے ساتھ بات کرتے دیکھا۔ سپاہیوں نے اپنے ہولسٹرز میں پستولیں لگا رکھی تھیں، لیکن وہ خوش گوار موڈ میں لگتے تھے اور لولو کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ آخر کار جب لولو ہمارے پاس آیا تو ماں نے پوچھا کہ کیا سپاہی ہمارے بیگ چیک کرنا چاہتے ہیں۔

''کوئی پریشانی کی بات نہیں...... سب انتظام ہو جائے گا۔ وہ میرے دوست ہیں،'' لولو نے ڈرائیو سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

لولو نے بتایا کہ وہ کار کسی سے ادھار لے کر آیا تھا، لیکن اس نے ایک بالکل نئی جاپانی موٹر سائیکل خریدی تھی۔ ایک قریبی سکول میں میرا داخلہ ہو چکا تھا اور رشتے دار ہمیں ملنے کو بے قرار تھے۔ جب لولو اور میری ماں آپس میں باتیں کر رہے تھے تو میں نے اپنا سر سیٹ کی پشت سے لگا لیا اور ارد گرد کے مناظر دیکھنے لگا۔ سبز اور نسواری مناظر، جنگلوں میں بنے گھر، ڈیزل آئل کی بدبو اور لکڑی کا دھواں۔ عورتیں اور مرد دھان کے کھیتوں کے درمیان پگڈنڈیوں پر بگلوں کی طرح چلتے دکھائی دیے، ان کے چہرے تنکوں کے بڑے بڑے ہیٹوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ اود بلاؤ جیسا گیلا اور کیچڑ میں لت پت لڑکا ایک بھینسے کی پشت پر سوار تھا اور اسے بانس کی ایک چھڑی سے مار رہا تھا۔ گلیاں زیادہ گنجان ہوتی گئیں، دکانیں اور مارکیٹیں اور ہتھ گاڑیاں چلاتے ہوئے مرد، پھر عمارات بلند ہونا شروع ہوئیں، جیسی ہوائی میں تھیں -- لولو نے بتایا: بہت جدید ہوٹل انڈونیشیا، اور نیا شاپنگ سنٹر۔ لیکن چند ایک عمارات ہی سڑک کے کنارے لگے سایہ بخش درختوں سے زیادہ بلند تھیں۔ جب ہم بڑے بڑے مکانات کی ایک اونچی قطار کے پاس سے گزرے، جن کے باہر اونچے جنگلے لگے تھے اور نگرانی کے لیے چوکیاں بنی تھیں، تو میری ماں نے کچھ پوچھا جو میری سمجھ میں نہ آیا۔ وہ حکومت اور سوکارنو نامی ایک شخص کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔

''سوکارنو کون ہے؟'' میں پچھلی سیٹ پر بیٹھا بیٹھا چلایا، لیکن یوں لگا جیسے لولو نے میری بات ہی نہ سنی ہو۔ اس کے بجائے اس نے میرے بازو کو چھوا اور سامنے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا: ''وہ دیکھو!'' وہاں سڑک کی دونوں طرف ٹانگیں پسارے، کم از کم دس منزل اونچا ایک بلند

قامت دیو کھڑا تھا جس کا بدن انسان اور چہرہ بوزنے جیسا تھا۔

لولو نے مجسمے کا چکر لگاتے ہوئے بتایا، ''یہ ہنومان ہے، بندر دیوتا۔'' میں سحر زدگی کے عالم میں گھوم کر اسے دیکھتا رہا۔ ''وہ ایک زبردست جنگجو ہے۔ ایک سو سورماؤں جتنا طاقت ور۔ شیطانوں کے ساتھ لڑائی میں اسے کبھی شکست نہیں ہوئی۔''

مکان شہر کے نواح میں ایک ترقی پذیر علاقے میں واقع تھا۔ سڑک چوڑے نسواری دریا پر بنے ایک تنگ پل کے اوپر سے گزرتی تھی۔ گزرتے وقت میں نے دیہاتیوں کو دریا کے کنارے پر کپڑے دھوتے اور نہاتے دیکھا۔ تب ہم ایک کچی سڑک پر اترا اور چھوٹی چھوٹی دکانوں اور سفید کیے ہوئے بنگلوں کے درمیان سے گزر کر آخر کار گاؤں کی تنگ راہداریوں میں چلنے لگے۔ مکان معتدل درجے کا، پلستر کیا ہوا، سرخ ٹائل والا تھا، لیکن یہ بہت کشادہ اور ہوادار تھا۔ سامنے چھوٹے سے صحن میں آم کا درخت لگا تھا۔ جب ہم دروازے سے اندر داخل ہو رہے تھے تو لولو نے اعلان کیا کہ میرے لیے ایک سرپرائز ہے: لیکن اس کے کچھ بتانے سے پہلے ہی ہمیں درخت کی بلند شاخوں سے ایک بہرہ کر دینے والی کوک سنائی دی۔ میری ماں اور میں کود کر پیچھے ہٹے اور دیکھا کہ ایک بڑا سا، چپٹے سر اور لمبے بازوؤں والا ایک بالدار جانور نچلی شاخ پر کودا تھا۔

''بندر!'' میں چلایا۔

''بوزنہ ہے۔'' میری ماں نے درستگی کی۔

لولو نے اپنی جیب سے مونگ پھلی نکال کر اس جانور کی انگلیوں میں پکڑائی۔ اس نے کہا، ''اس کا نام ٹاٹا ہے۔ میں تمہارے لیے اسے نیوگنی سے خرید کر لایا ہوں۔''

میں قریب سے دیکھنے کے لیے ایک دو قدم آگے گیا، لیکن ٹاٹا نے جھپٹنے کا تاثر دیا، اس کی گول دائروں والی آنکھیں غضب ناک اور شک سے بھرپور تھیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مزید آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔

لولو ٹاٹا کو ایک اور مونگ پھلی پکڑاتے ہوئے بولا، ''گھبراؤ مت۔ وہ ڈرا ہوا ہے۔ اور بھی کچھ موجود ہے۔''

میں نے اپنی ماں کی طرف دیکھا تو وہ متذبذب انداز میں مسکرائی۔ پچھلے صحن میں ہمیں ایک چھوٹا سا چڑیا گھر دکھائی دیا: مرغیاں اور بطخیں ادھر ادھر پھدکتی ہوئی، گرج دار آواز والا بڑا سا پیلا کتا،

بہشت کے دو پرندے، ایک سفید کوکاٹو طوطا، اور دو مگرمچھ کے بچے جو ایک تالاب کے پانی میں آدھے ڈوبے ہوئے تھے۔ لولو نے مگرمچھوں کی جانب دیکھا۔ "یہ تین تھے، لیکن سب سے بڑا مگرمچھ باڑ میں موجود ایک سوراخ کے راستے باہر نکل گیا۔ وہ کسی کے دھان کے کھیت میں جا گھسا اور اس کی ایک بطخ ہڑپ کر لی۔ ہمیں ٹارچ کی روشنی میں اسے پکڑنا پڑا۔"

سورج کی روشنی ختم ہو رہی تھی، لیکن ہم نے گاؤں کی طرف جانے والے کیچڑ زدہ راستے پر مختصر چہل قدمی کی۔ اڑوس پڑوس کے کھیل کود کرتے بچوں نے اپنے ہاتھ ہلائے اور چند برہنہ پا بوڑھوں نے آکر مصافحہ کیا۔ ہم ایک جگہ پر رکے جہاں لولو کے ملازم چند بکریاں چرا رہے تھے اور ایک چھوٹا سا لڑکا ڈریگن فلائی کو دم سے پکڑے ہوئے میرے پاس آیا۔ جب ہم مکان میں واپس آئے تو ہمارا سامان لانے والا آدمی پچھلے صحن میں کھڑا تھا؛ اس نے اپنی بغل میں ایک نسواری رنگ کی مرغی دبا رکھی تھی اور دائیں ہاتھ میں لمبی سی چھری تھی۔ اس نے لولو سے کچھ کہا، جس نے سر ہلا کر جواب دیا اور میری ماں کو اور مجھے آواز دی۔ ماں نے مجھے وہیں انتظار کرنے کو کہا اور لولو کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"کیا تمہارے خیال میں وہ ابھی چھوٹا سا بچہ ہے؟"

لولو نے کندھے اچکائے اور میری طرف دیکھا۔ "لڑکے کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا کھانا کہاں سے آیا ہے۔ کیا خیال ہے باری؟" میں نے ماں کی طرف دیکھا اور پھر دوبارہ مرغی پکڑ کر کھڑے آدمی کی طرف منہ کر لیا۔ لولو نے دوبارہ سر ہلایا اور میں نے دیکھا کہ اس آدمی نے مرغی کو ایک نالی کے قریب نیچے رکھا، ایک گھٹنے تلے اچھی طرح جکڑا اور اس کی گردن پکڑ کر باہر کھینچی۔ لمحہ بھر کے لیے مرغی تڑپی، اپنے پر پھڑ پھڑائے، چند پر ہوا میں اڑے۔ پھر وہ بالکل ساکت ہو گئی۔ آدمی نے چھری کے ایک ہی مدھم وار سے مرغی کی گردن کاٹ دی تھی۔ قرمزی خون کی ایک دھار سی نکلی۔ آدمی مرغی کو اپنے جسم سے دور کر کے پکڑے ہوئے کھڑا ہوا اور اچانک ہوا میں اچھال دیا۔ وہ ایک تھپ کی آواز کے ساتھ زمین پہ گری، پھر پیروں پہ کھڑے ہونے کی کوشش کی، اس کا کٹا ہوا سر خوفناک انداز میں ایک طرف کو ڈھلکا ہوا تھا، اور وہ دیوانہ وار گھومنے لگی۔ میرے دیکھتے دیکھتے اس کے چکر مختصر ہوتے گئے، خون ٹپکتا رہا اور انجام کار مرغی بے جان ہو کر گھاس پہ گر گئی۔

لولو نے اپنا ہاتھ میرے سر پہ پھیرا اور مجھے اور میری ماں کو نہانے دھونے کا کہا۔ ہم تینوں نے

بلب کی روشنی میں خاموشی سے کھانا کھایا -- مرغی کا سالن اور چاول، پھر میٹھے میں ایک سرخ، بالدار چھلکے والا پھل جو اتنا میٹھا تھا کہ میں پیٹ میں درد ہو جانے تک کھاتا رہا۔ بعد ازاں مچھر دانی میں اکیلے لیٹے ہوئے میں نے چاندنی میں جھینگروں کی آواز سنی اور چند گھنٹے قبل دیکھی ہوئی زندگی کی آخری گھڑیوں کو یاد کیا۔ مجھے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"سب سے پہلی یاد رکھنے کی بات خود محفوظ رہنا ہے۔"

لولو اور میں پچھلے صحن میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ایک روز قبل میں گھر آیا تو میرے سر پر ایک طرف انڈے جتنا گومڑ پڑا ہوا تھا۔ لولو نے اپنی موٹر سائیکل دھونے کے دوران نظر ڈالی اور پوچھا کہ کیا ہوا ہے۔ میں نے اپنی عمر سے بڑے ایک لڑکے کے ساتھ ہونے والی لڑائی کے متعلق بتایا جو گلی کے آخر میں رہتا تھا۔ میں نے بتایا کہ وہ لڑکا عین کھیل کے دوران میرے دوست کا فٹ بال لے کر بھاگ گیا تھا۔ جب میں نے پیچھا کیا تو لڑکے نے ایک پتھر اٹھا لیا۔ یہ ناانصافی تھی۔ میری آواز دکھ سے بھر گئی۔ اس نے بے ایمانی کی تھی۔

لولو نے اپنی انگلیوں سے میرے بال ہٹائے اور خاموشی سے زخم کا جائزہ لیا۔ "خون نہیں بہہ رہا،" آخر کار اس نے کہا اور واپس اپنے کام میں لگ گیا۔

میں سمجھا کہ معاملہ وہیں ختم ہو گیا تھا۔ لیکن اگلے روز جب وہ کام سے واپس آیا تو میرے لیے باکسنگ گلوز کے دو جوڑے بھی لایا۔ ان میں چمڑے کی بو تھی۔ بڑا والا جوڑا کالا اور چھوٹا سرخ رنگ کا تھا۔ اس نے دستانوں کے تسمے آپس میں باندھ کر کندھے پہ ڈال رکھے تھے۔

اب اس نے میرے گلوز کے تسمے باندھے اور ان کا جائزہ لیا۔ میرے ہاتھ اطراف میں جھول رہے تھے۔ لولو نے سر ہلایا اور گلوز کو میرے چہرے کے آگے کر دیا۔

"یہاں۔ اپنے ہاتھ ہمیشہ اوپر رکھو۔" اس نے میری کہنیوں کو ایڈجسٹ کیا، پھر آگے کو جھکا اور اچھلنے لگا۔ "تمہیں حرکت کرتے رہنا چاہیے، لیکن ہمیشہ جھکے رہو -- مخالف کو نشانہ لگانے کا موقعہ نہ دو۔ کیسا لگ رہا ہے؟" میں نے سر ہلایا اور اس کی نقل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ چند منٹ بعد وہ رکا اور اپنی ہتھیلی میری ناک کے سامنے کر دی۔

"اوکے۔ چلو تمہارا زور دیکھتے ہیں،" اس نے کہا۔ میں ایک قدم پیچھے ہٹا، زور جمع کیا اور اپنا

بہترین وار کیا۔ اس کا ہاتھ بمشکل ہی اپنی جگہ سے ہل سکا۔

''زیادہ برا نہیں،'' لولو نے تاثرات تبدیل کیے بغیر سر ہلاتے ہوئے خود سے کہا۔ ''اچھا ہے۔ آہ۔ لیکن غور کرو کہ اس وقت تمہارے ہاتھ کہاں ہیں۔ میں نے کیا بتایا تھا؟ انہیں اوپر کرو.....''

میں نے اپنے بازو اٹھائے، لولو کی ہتھیلی پر مدھم سے مکے مارے، گاہے بگاہے نظر اٹھا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور محسوس کیا کہ دو سال اکٹھے گزارنے کے بعد اس کا چہرہ کس قدر مانوس لگنے لگا تھا -- پیروں تلے موجود زمین جیسا مانوس۔ انڈونیشیائی زبان، رسوم و رواج اور حکایات جاننے میں مجھے چھ ماہ سے بھی کم عرصہ لگا تھا۔ میں نے خسرہ اور اپنے استادوں کی چھڑیوں کو سہا۔ کسانوں، سرکاری ملازموں اور کمتر درجے کے بیوروکریٹس کے بچے میرے گہرے دوست بن گئے تھے۔ ہم صبح اور رات کے وقت اکٹھے گلیوں میں بھاگتے، گھر کے کام کرتے، جھینگر پکڑتے، تیز دھار ڈور کے ساتھ پتنگوں کے پیچ لڑاتے -- ہارنے والا کھلاڑی اپنی پتنگ کو کٹ کر ہوا میں لہراتے دیکھتا اور جان لیتا کہ کہیں پاس ہی دیگر بچے قطار بنائے اس کٹی پتنگ کو دیکھ رہے تھے۔ لولو کے ساتھ میں نے کھانے (عموماً چاول) میں کچی سبز مرچیں کھانا سیکھا، اور کھانے کی میز کے علاوہ میرا تعارف کتے و سانپ کے گوشت اور بھونے ہوئے گھاس ٹڈے سے ہوا۔ متعدد انڈونیشیائیوں کی طرح لولو کا اسلام بھی قدیم روح پرستانہ اور ہندوانہ عقائد کی باقیات کو گوارا کرتا تھا۔ اس نے وضاحت کی کہ آدمی جو بھی کھائے اس کی طاقتیں حاصل کر لیتا ہے۔ اس نے وعدہ کیا کہ کسی روز وہ شیر کا گوشت لا کر کھلائے گا۔

تو یہ تھے معاملات -- ایک طویل ایڈونچر، نوجوان لڑکے کی زندگی کا خزانہ۔ میں اپنے نانا نانی کے نام خطوط میں کئی واقعات تفصیل سے لکھتا اور امید رکھتا کہ چاکلیٹ اور پی نٹ بٹر کے مزید پیکٹ آئیں گے۔ لیکن سبھی چیزیں میرے خطوط میں نہیں آ پاتی تھیں؛ کچھ چیزیں مجھے ناقابل وضاحت معلوم ہوئیں۔ میں نے توت اور گرامپس کو ایک روز اپنے دروازے پر آنے والے اس آدمی کے چہرے کے متعلق نہ بتایا جس کی ناک کی جگہ پر ایک سوراخ تھا --- میری ماں سے کھانا مانگتے وقت اس سوراخ سے سیٹی جیسی آواز آئی۔ نہ ہی میں نے یہ ذکر کیا کہ میرے ایک دوست کے کہنے کے مطابق اس کا چھوٹا بھائی ہوا کے ذریعے آنے والی بدروح کے باعث مر گیا تھا۔ میرے دوست کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے خوف رقص کرتا نظر آیا۔ پھر وہ قہقہہ لگا کر ہنسا، میرے

بازو پہ مکا مارا اور سرپٹ بھاگ کھڑا ہوا۔ جس برس بارشیں نہ ہوتیں تو کسانوں کے چہرے خالی دکھائی دیتے۔ وہ کندھے جھکائے ہوئے ننگے پاؤں اپنے ویران کھیتوں میں پھرتے، جگہ جگہ رک کر مٹی کو انگلیوں سے مسلتے۔ لیکن اگلے برس جب بارشیں ایک ماہ سے زیادہ جاری رہتیں، دریا چڑھنے لگتے اور کھیتوں و گلیوں میں کمر برابر پانی کھڑا ہو جاتا تو کنبے اپنی بکریاں اور مرغیاں بچانے کو بھاگتے۔ ان کے جھونپڑوں کے کچھ حصے بھی پانی میں بہہ جاتے۔

میں سیکھ رہا تھا کہ دنیا متشدد، ناقابل پیش گوئی اور اکثر ظالم بھی ہے۔ میرے نانا نانی کو اس قسم کی دنیا کا کوئی علم نہ تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ انہیں ایسے سوالات پوچھ کر پریشان نہیں کرنا چاہیے جن کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔ کبھی کبھی جب میری ماں کام سے واپس گھر آتی تو میں اسے اپنی دیکھی یا سنی ہوئی باتیں بتاتا اور وہ میری پیشانی پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑے غور سے سنتی، سمجھانے کی اپنی سی کوشش کرتی۔ میں نے ہمیشہ اس کی توجہ کو پسند کیا -- اس کی آواز، ہاتھ کا لمس، تحفظ کا احساس۔ لیکن سیلاب، جن نکالنے اور مرغوں کی لڑائی کے بارے میں اس کا علم کافی تشنگی باقی چھوڑ دیتا۔ میں اکثر اس احساس کے ساتھ گفتگو بند کر دیتا کہ میرے سوالات نے اسے خوامخواہ پریشان ہی کیا ہے۔

چنانچہ میں راہنمائی اور ہدایت کے لیے لولو کی جانب متوجہ ہوا۔ وہ زیادہ نہیں بولتا تھا، لیکن اس کے ساتھ بات کرنا آساں تھا۔ اس نے اپنے خاندان اور دوستوں میں میرا تعارف بیٹے کے طور پر کروایا، لیکن اس نے کبھی کسی بات پر محض نصیحت سے زیادہ اصرار نہ کیا یا ہمارے تعلق کو حقیقت سے زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش نہ کیا۔ مجھے یہ فاصلہ پسند تھا؛ یہ ایک مردانہ اعتماد پر دلالت کرتا تھا۔ اور دنیا کے بارے میں اس کی معلومات غیر مختتم معلوم ہوتی تھیں۔ پنکچر شدہ ٹائر بدلنے یا شطرنج کی چالوں کے علاوہ اسے جذبات سے نمٹنے اور زندگی کے پیہم رازوں کی وضاحت کرنے کے طریقے بھی معلوم تھے۔

مثلاً یہ کہ بھکاریوں سے کیسے نمٹنا ہے۔ وہ ہر طرف دکھائی دیتے تھے، بیماروں کی ایک فوج -- غلیظ چیتھڑوں میں ملبوس مرد، عورتیں، بچے، کچھ ٹنڈے، کچھ لنگڑے، پولیو یا کوڑھ زدہ، فٹ پاتھوں پر ہاتھوں کے بل چلتے یا لڑھکتے ہوئے۔ شروع میں میری ماں دروازے پہ آنے یا ہاتھ پھیلانے والے ہر بھکاری خیرات دے دیا کرتی تھی، بعد میں جب واضح ہو گیا کہ دکھ کا سیلاب

کبھی ختم نہیں ہونے والا تو وہ کسی کسی کو بھیک دینے لگی۔ اس نے دکھ کی سطحوں کو جانچنا سیکھ لیا تھا۔

لولو کے خیال میں اس کی رحم دلی اچھی مگر بیوقوفانہ تھی، اور جب بھی وہ مجھے ماں والے طریقے پر عمل کرتے دیکھتا تو اپنی بھنویں اچکاتا اور مجھے ایک طرف لے جاتا۔

"تمہارے پاس کتنے پیسے ہیں؟" وہ پوچھتا۔

میں اپنی جیب سے ساری رقم نکال کر دکھاتا۔ "تمیں روپیہ۔"

"بازار میں کتنے بھکاری ہیں؟"

میں ان بھکاریوں کی تعداد کا تصور کرنے کی کوشش کرتا جو گزشتہ ہفتے ہمارے مکان پر آئے ہوتے۔ جب اسے معلوم ہو جاتا کہ میرے لیے کتنا مشکل ہو رہا ہے تو وہ کہتا، "دیکھا تم نے؟ بہتر ہے کہ اپنے پیسے بچاؤ اور ساری رقم گلی میں ہی ختم نہ کر جاؤ۔"

ملازموں کے ساتھ بھی اس کا یہی سلوک تھا۔ ان میں سے زیادہ تر نئے نئے شہر میں آئے ہوئے دیہاتی تھے۔ وہ اکثر اپنے سے کچھ ہی بہتر حالت والے گھرانوں کے لیے کام کرتے، پیچھے گاؤں میں گھر والوں کو رقم بھیجتے یا کوئی اپنا کاروبار شروع کرنے کے لیے رقم بچاتے۔ اگر ان کا کوئی نصب العین ہوتا تو لولو ابتدا کرنے کے لیے ان کی مدد کرنے پر تیار ہو جاتا، اور وہ عموماً ان کی ذاتی حماقتوں کو بھی برداشت کر لیتا: اس نے اچھی طبیعت کے حامل ایک نوجوان کو سال بھر کے لیے ملازم رکھا جو ہفتہ وار چھٹی کے دن عورتوں جیسے کپڑے پہننا پسند کرتا تھا -- لولو کو اس آدمی کا پکایا ہوا کھانا بہت پسند تھا۔ لیکن وہ کام چور، لاپروا یا پیسے ضائع کرنے والے ملازمین کو بلا ہچکچاہٹ فارغ کر دیتا۔ اور جب میری ماں یا میں آڑے آنے کی کوشش کرتے تو وہ جھلا اٹھتا۔

ایک روز میری ماں نے ریڈیو زمین پر گرانے کا الزام اپنے سر لینے کی کوشش کی تو وہ کہنے لگا،

"تمہاری ماں بڑی نرم دل ہے۔ عورتوں کے لیے یہ ایک اچھی خوبی ہے۔ لیکن ایک روز تم مرد بنو گے اور مرد کو زیادہ سمجھ بوجھ ہونی چاہیے۔"

اس نے وضاحت کی کہ ان باتوں کا اچھائی یا برائی، پسند یا ناپسند سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ زندگی کو اس کی حقیقت میں لینے کا معاملہ تھا۔

مجھے اپنے جبڑے پر ایک جھٹکا محسوس ہوا اور منہ اٹھا کر لولو کا پسینے میں بھیگا چہرہ دیکھا۔

"توجہ سے سنو۔ اپنے ہاتھ اوپر رکھو۔"

ہم نے مزید آدھا گھنٹہ باکسنگ کی اور پھر لولو نے ستانے کا فیصلہ کیا۔ میرے بازو تپ رہے تھے اور میرا سارا سر نبض کی مانند دھڑک رہا تھا۔ ہم نے پانی کا پورا جگ لیا اور مگرمچھ والے جوہڑ کے کنارے بیٹھ گئے۔

"تھک گئے ہو؟" اس نے پوچھا۔

میں آگے کو جھک گیا اور بمشکل سر ہلا سکا۔ وہ مسکرایا اور اپنی پینٹ کا ایک پائنچہ اوپر کیا۔ مجھے اس کے ٹخنے سے لے کر پنڈلی کے وسط تک زخموں کے نشان نظر آئے۔

"یہ کیا ہیں؟"

"جونک کے نشان۔ جب میں نیوگنی میں ہوا کرتا تھا تو دلدلوں میں مشق کرنے کے دوران وہ میرے فوجی بوٹوں کے اندر گھس گئیں۔ رات کے وقت جب جرابیں اتارتے تو وہ وہاں چپکی ہوتیں، خون پی پی کر پھولی ہوئی۔ ان پر نمک ڈالیں تو وہ مر جاتی ہیں، لیکن اس کے باوجود انہیں چھری گرم کر کے جسم سے الگ کرنا پڑتا ہے۔"

میں نے بیضوی زخموں پر انگلیاں پھیریں۔ وہ ملائم اور بے بال تھے۔ میں نے لولو سے پوچھا کہ کیا اسے درد ہوا تھا۔

"ضرور ہوا تھا،" اس نے جگ میں سے ایک گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔ "کبھی کبھی آپ چوٹ کی فکر نہیں کر سکتے۔ کبھی کبھی آپ کو صرف اپنے ہدف تک پہنچنے کی فکر ہوتی ہے۔"

ہم چپ ہو گئے اور میں نے اسے کنکھیوں سے دیکھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اسے کبھی اس طریقے سے اپنے احساسات کے متعلق باتیں کرتے نہیں سنا تھا۔ نہ ہی میں نے کبھی اسے حقیقی غصے یا اداسی کے عالم میں دیکھا تھا۔ وہ سخت اور طے شدہ خیالات کی دنیا کا باسی لگتا تھا۔ اچانک میرے دماغ میں ایک خیال آیا۔

"کیا آپ نے کبھی کسی آدمی کو ہلاک ہوتے دیکھا ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے نظر نیچے ڈالی اور سوال پر کچھ حیران ہوا۔

"دیکھا ہے؟" میں نے دوبارہ پوچھا۔

"ہاں،" وہ بولا۔

"کیا خون بہا تھا؟"

''ہاں۔''

میں نے لمحہ بھر کو سوچا۔ ''وہ آدمی کیوں مرا تھا؟ جسے آپ نے مرتے دیکھا؟''

''کیونکہ وہ کمزور تھا۔''

''بس، اتنی سی بات؟''

لولو نے کندھے اچکائے اور اپنی پینٹ کا پائنچہ نیچے کرلیا۔ ''عموماً اتنا ہی کافی ہوتا ہے۔ انسان دوسرے انسانوں کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ بالکل ملکوں جیسے ہوتے ہیں۔ توانا انسان کمزور انسان کی زمین ہتھیا لیتا ہے۔ وہ کمزور انسان سے اپنے کھیتوں میں کام کرواتا ہے۔ اگر کمزور کی بیوی خوب صورت ہو تو طاقت ور اسے بھی چھین لے گا۔'' اس نے رک کر پانی کا ایک اور گھونٹ پیا اور پھر پوچھا، ''تم کیا بننا پسند کرو گے؟''

میں نے جواب نہ دیا اور لولو نے آنکھیں میچ کر اوپر آسمان کو دیکھا۔ ''طاقت ور بننا بہتر ہے،'' اس نے مضبوط لہجے میں کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اگر تم طاقت ور نہیں بن سکتے تو پھر چالاک بن جاؤ اور طاقت ور شخص کے ساتھ صلح قائم کرو۔ لیکن ہمیشہ خود طاقت ور بننے کی کوشش کرنا۔ ہمیشہ۔''

ماں ہمیں گھر کے اندر بیٹھی دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنی ڈیسک پر کاغذوں کے درمیان سے ہماری طرف توجہ کی۔ وہ کیا باتیں کر رہے ہیں؟ اس نے دل میں سوچا۔ شاید خون اور خوبیوں کے متعلق، ناخن کھانے کے بارے میں۔ وغیرہ وغیرہ۔

وہ اونچی آواز میں ہنسی اور پھر سنبھل گئی۔ یہ نامناسب تھا۔ وہ مجھ پر لولو کی مہربانیوں کے لیے تہ دل سے مشکور تھی۔ شاید وہ اپنے بیٹے سے بھی بالکل اسی طرح پیش آتا۔ ماں نے اپنے کاغذ ایک طرف رکھے اور مجھے ڈنٹر پیلتے ہوئے دیکھا۔ اس نے سوچا کہ وہ بہت تیزی سے جوان ہو رہا ہے۔ اس نے ہماری آمد کے دن کو تصور میں لانے کی کوشش کی: ایک چوبیس سالہ عورت بچے کے ہمراہ، ایک ایسے آدمی کی بیوی بن کر جس کے ماضی اور ملک کے بارے میں وہ بمشکل ہی کچھ جانتی تھی۔ اب اسے معلوم ہوا کہ اس وقت وہ اتنا کم کچھ جانتی تھی کہ معصومیت میں اپنا امریکی پاسپورٹ بھی ساتھ لے آئی تھی۔ کیا پتا حالات بدل جائیں، کافی خراب ہو جائیں۔

اسے امید تھی کہ نئی زندگی مشکل ضرور ہوگی۔ ہوائی سے روانگی سے قبل اس نے انڈونیشیا کے

متعلق مقدور بھر جاننے کی کوشش کی تھی: آبادی، دنیا کا بیں فیصد، سینکڑوں قبائل اور بولیاں؛ نوآبادیت کی تاریخ، پہلے تین سو سال تک ڈچ اور پھر جنگ کے دوران جاپانیوں کا تیل، دھات اور لکڑی کے وسیع ذخائر پر قابض ہونا؛ جنگ کے بعد جدوجہد آزادی اور سوکارنو نامی مجاہد آزادی کا ملک کے پہلے صدر کے طور پر ابھر کر سامنے آنا۔

حال ہی میں سوکارنو کی حکومت بدل گئی تھی، لیکن تمام خبروں میں اسے ایک غیر خونی سازش بتایا گیا، اور یہ کہ لوگوں نے تبدیلی کی حمایت کی تھی۔ انہوں نے کہا کہ سوکارنو بدعنوان ہو گیا تھا؛ وہ خود پسند، مطلق العنان اور کمیونسٹوں کے ساتھ بہت بے تکلف تھا۔

غیر ترقی یافتہ اور بالکل اجنبی غریب ملک --- وہ بس اتنا کچھ ہی جانتی تھی۔ وہ دست اور بخار کی وباؤں، ٹھنڈے پانی سے غسل اور کچی لیٹرین، چند ہفتے بغیر بجلی کے گزارنے، گرمی اور غیر مختتم مچھروں کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھی۔ درحقیقت کوئی بھی چیز دقتوں سے بڑھ کر نہ تھی۔ وہ اس سے کہیں زیادہ سخت جان تھی جتنی کہ دکھائی دیتی تھی --- اتنی سخت جان کہ اسے خود بھی معلوم نہ تھا۔ بہرحال بارک کے جانے کے بعد جزواً انہی چیزوں نے اسے لولو کی جانب مائل کیا تھا -- کچھ نئی اور اہم چیز پانے کا عزم، والدین کی پہنچ سے دور، اپنے شوہر کو ملک کی پرجوش فضا میں تعمیر نو کے لیے مدد دینا۔

لیکن وہ تنہائی کے لیے تیار نہ تھی۔ یہ مستقل تھی، سانس کی طرح۔ درحقیقت وہ دوٹوک انداز میں کسی نکتے کی نشان دہی نہیں کر سکتی تھی۔ لولو نے گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا تھا اور اسے گھر کا احساس دینے کی خاطر ہر ممکن کوشش کی، اسے مقدور بھر ہر چیز فراہم کی۔ لولو کے گھر والے بھی ماں کے ساتھ خوش اسلوبی اور فراخدلی سے پیش آئے اور اس کے بیٹے کو اپنا بیٹا سمجھا۔

پھر بھی علیحدہ گزرے ہوئے ایک سال کے دوران ماں اور لولو کے درمیان کچھ واقع پیش آیا تھا۔ ہوائی میں وہ زندگی سے بھرپور تھا، اپنے منصوبوں کے متعلق نہایت پرجوش۔ رات کے وقت جب وہ اکیلے ہوتے تو وہ عالمی جنگ کے زمانے میں اپنی جوانی کے قصے سناتا جب اس نے اپنے باپ اور بڑے بھائی کو انقلابی فوج میں شامل ہو کر روانہ ہوتے دیکھا، دونوں کے مارے جانے کی خبر سنی، کیسے ڈچ فوج نے ان کا گھر جلا دیا، کیسے وہ بچ کر کھیتوں میں بھاگے، اس کی ماں نے کیسے زیور بیچ بیچ کر پیٹ پالا۔ لولو نے ماں کو بتایا تھا کہ ڈچ کو نکالے جانے کے بعد اب حالات بدل

رہے ہوں گے؛ وہ واپس جا کر یونیورسٹی میں پڑھائے گا اور تبدیلی کے عمل کا حصہ بنے گا۔

اس نے اس حوالے سے کبھی کوئی بات نہ کی۔ درحقیقت لگتا تھا کہ جیسے وہ ماں سے بات ہی نہیں کرتا۔ صرف ضرورت پڑنے پر ہی بات ہوتی، مثلاً کوئی نل ٹھیک کرنا یا کسی دور دراز کزن سے ملاقات کی تیاری۔ لگتا تھا کہ جیسے وہ کسی ناقابل رسائی، تاریک، خفیہ گوشے میں جا چھپا تھا اور اپنی ذات کا روشن ترین حصہ بھی ساتھ ہی لے گیا۔ کچھ راتوں کو جب سب لوگ سونے چلے جاتے تو ماں اسے درآمد شدہ شراب کی بوتل پکڑے گھر میں گھومتے اور اپنے دل کی باتیں کہتے سنتی۔ کچھ راتوں کو وہ سونے سے قبل اپنے تکیے تلے پستول رکھتا۔ جب بھی ماں مسئلہ دریافت کرتی تو وہ دھیمے لہجے میں اسے چپ کرا دیتا اور کہتا کہ وہ بس تھک گیا ہے۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے الفاظ پر سے اس کا اعتبار اٹھ گیا ہو۔ الفاظ اور ان میں شامل جذبات۔

ماں کو شک تھا کہ ان مسائل کا کچھ نہ کچھ تعلق لولو کی ملازمت کے ساتھ ضرور ہے۔ وہ فوج کے لیے بطور جیالوجسٹ کام کرتا تھا۔ جب ماں انڈونیشیا پہنچی تو وہ سڑکوں اور سرنگوں کا سروے کیا کرتا تھا۔ یہ دماغ ماؤف کر دینے والا کام تھا جس میں زیادہ آمدنی نہ ہوتی؛ ریفریجریٹر کی قیمت بھی دو ماہ کی تنخواہ کے برابر تھی۔ اور اب ایک بیوی اور بچے کا بوجھ بھی کندھوں پر آ پڑا..... اس کی پریشانی باعث تعجب نہیں تھی۔ ماں نے فیصلہ کیا کہ وہ اتنی دور سے یہاں بوجھ بننے نہیں آئی تھی۔ وہ اپنا بوجھ خود اٹھائے گی۔

اس نے امریکی سفارت خانے میں انڈونیشیائی کاروباری افراد کو انگلش پڑھانے کی نوکری حاصل کر لی جو ترقی پذیر ممالک کو امریکہ کی فارن ایڈ کا حصہ تھی۔ رقم سے کچھ آسرا تو ہوا لیکن ماں کی تنہائی ختم نہ ہو سکی۔ انڈونیشیائی بزنس مین کو انگلش زبان کی لطافتوں میں زیادہ دلچسپی نہ تھی، اور متعدد نے اس پر ڈورے بھی ڈالے۔ زیادہ تر امریکی عمر میں اس سے بڑے، سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں کیریئر بنانے کے مشتاق جو کبھی کبھی کئی ماہ کے لیے پراسرار طور پر غائب ہو جاتے، سفارت خانے میں ان کی ذمہ داریوں کا تعین نہ ہو سکا۔ کچھ ایک امریکی بدصورت امریکیوں کے کیری کیچرز تھے جو انڈونیشیائی لوگوں کے لطیفے سناتے رہتے۔ آخرکار انہیں پتا چل گیا کہ ماں کی شادی ایک انڈونیشیائی سے ہی ہوئی تھی۔ تب انہوں نے ازالہ کرنے کی کوشش کی -- جم کی بات کو سنجیدگی سے مت لو، اس کے دماغ کو گرمی چڑھ گئی ہے، ویسے تمہارا بیٹا کیسا ہے، بہت اچھا ہے وہ۔

البتہ ان آدمیوں کو ملک یا کم از کم اس کے کچھ حصوں کا علم تھا، اور ان الماریوں کا بھی جہاں ڈھانچے دفنائے گئے تھے۔ لنچ یا گپ شپ کے دوران وہ اسے ایسی باتیں بتاتے جو اخبارات میں پڑھنے کو نہیں ملتی تھیں۔ انہوں نے وضاحت کی کہ کس طرح سوکارنو نے انڈوچائنا میں کیمونزم کی مقبولیت سے پریشان یو ایس حکومت کے اعصاب مختل کر دیے تھے، اس کی قوم پرستانہ امنگ اور غیر جانب داری کی سیاست کیا تھی -- انڈونیشیا کی سٹریٹجک اہمیت کے پیش نظر وہ بھی لومبا یا ناصر جیسا، بلکہ ان سے بھی بدتر تھا۔ سننے میں آیا کہ سی آئی اے نے اقتدار پر قبضے کی سازش میں کردار ادا کیا تھا، البتہ کوئی بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ یہ امر زیادہ یقینی تھا کہ سازش کے بعد فوج نے فرضی کیمونسٹ حامیوں کو پکڑنے کے لیے دیہی علاقوں پر چھاپے مارے تھے۔ ہر کسی نے ہلاکتوں کے اپنے اپنے اندازے لگائے چند ہزار یا شاید پانچ لاکھ۔ حتیٰ کہ ایجنسی کے سمجھدار اہل کاروں کو بھی گنتی بھول گئی۔

بہرکیف افواہیں برطرف؛ یوں اسے جدید دور کی ایک ظالمانہ اور تیز مہم کے ایک سال سے بھی کم عرصہ بعد پتا چلا کہ ہم جکارتہ پہنچے تھے۔ خیال نے اسے خوف زدہ کر دیا، یہ تصور کہ تاریخ کو اس قدر سالم طور پر نگلا جا سکتا ہے، جیسے زرخیز ریتلی مٹی خون کے دریاؤں کو چوس لیتی ہے: جس طرح لوگ نئے صدر کے دیوقامت پوسٹرز تلے اپنا کام اس طرح جاری رکھے ہوئے تھے کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، اپنی ترقی میں مصروف ملک۔ ماں کے انڈونیشیائی دوستوں کا حلقہ وسیع ہونے پر چند ایک نے اسے دیگر کہانیاں سنانے کا اشتیاق ظاہر کیا -- سرکاری ایجنسیوں کی کرپشن، پولیس اور فوج کے چھاپوں، صدر کے خاندان اور رفقا کی خاطر تخلیق کی گئی پوری پوری صنعتوں کے متعلق۔ اور ہر نئی کہانی کے ساتھ وہ لولو کے ساتھ تخلیے میں جاتی اور پوچھتی: ''کیا یہ درست ہے؟''

لولو نے کبھی کچھ نہ کہا۔ ماں جتنا زیادہ پوچھتی، وہ اپنی خوش خلق خاموشی پر اسی قدر مستحکم ہوتا گیا۔ اس نے ماں سے کہا، ''تم ان باتوں پر پریشان کیوں ہوتی ہو؟ تم پارٹی کے لیے ایک نیا لباس کیوں نہیں خریدتی؟'' آخرکار ماں نے لولو کے ایک پیڈیاٹریشن کزن سے شکایت کی جس نے جنگ کے دوران لولو کی دیکھ بھال کی تھی۔

''تم نہیں سمجھو گی،'' کزن نے اسے دھیمے انداز میں بتایا۔

''کیا نہیں سمجھوں گی؟''

لولو کی واپسی کے حالات۔ جانتی ہو اس نے ہوائی سے اس قدر جلد واپسی کا نہیں سوچا تھا۔ تادیبی کارروائی کے دوران بیرون ملک زیر تعلیم تمام طلبا کو کسی وضاحت کے بغیر واپس بلوا لیا گیا اور ان کے پاسپورٹ منسوخ کر دیے گئے۔ جہاز سے اترتے وقت لولو کو معلوم نہیں تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ ہم اس سے نہیں مل سکتے تھے؛ فوجی حکام اسے لے گئے اور پوچھ گچھ کی۔ انہوں نے بتایا کہ اسے فوج میں جبری بھرتی کیا گیا ہے اور وہ ایک سال کے لیے نیوگنی کے جنگلوں میں جا رہا ہے۔ وہ چند خوش قسمت نوجوانوں میں سے ایک تھا۔ مشرقی بلاک کے ممالک میں زیر تعلیم طلبا کے ساتھ زیادہ بری ہوئی۔ ان میں سے متعدد اب بھی جیل میں ہیں، یا پھر غائب ہو چکے ہیں۔"

"تمہیں لولو پر اتنا زور نہیں دینا چاہیے۔ اس قسم کے واقعات کو بھول جانا ہی بہتر ہے،" کزن نے اپنی بات دہرائی۔

میری ماں کزن کے گھر سے نکلی تو اس کا سر چکرا رہا تھا۔ باہر سورج سر پہ تھا، ہوا گرد سے اٹی ہوئی تھی، لیکن اس نے ٹیکسی لینے کے بجائے بلا سمت پیدل چلنا شروع کر دیا۔ اس نے خود کو ایک امیر علاقے میں پایا جہاں سفیر اور جرنیل بلند آہنی پھاٹکوں والے مکانات میں رہتے تھے۔ اس نے ایک عورت کو ننگے پیر اور پھٹی پرانی شال میں ایک کھلے گیٹ سے گزر کر اندر جاتے دیکھا جہاں کچھ آدمی مرسیڈیز بینز اور لینڈ روور گاڑیاں دھو رہے تھے۔ ان میں سے ایک شخص نے چلا کر عورت کو چلے جانے کا کہا، لیکن عورت وہیں کھڑی رہی اور اس کا ہڈیلا بازو آگے کی طرف بڑھا ہوا تھا، چہرے پر ایک سایہ تھا۔ آخر کار ایک اور آدمی نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور مٹھی بھر سکے اس کی جانب پھینکے۔ عورت بلا کی پھرتی سے سکوں کی جانب لپکی اور تلاشی نظروں سے سڑک پر گھورتی رہی تا کہ کوئی سکہ رہ نہ جائے۔ اس نے سارے سکے اپنے سینے میں ڈال لیے۔

طاقت۔ یہ لفظ میری ماں کے ذہن میں کسی بددعا کی طرح پیوست ہو گیا تھا۔ امریکہ میں یہ عموماً نظروں سے اوجھل ہی رہتا اور اسے دیکھنے کے لیے آپ کو کافی کھدائی کرنا پڑتی تھی۔ کسی ہندوستانی ریزرویشن پر جانے یا کسی معتمد سیاہ فام شخص سے بات چیت کرنے سے ہی اس کا پتا چل سکتا تھا۔ لیکن یہاں طاقت غیر مستور، بین، برہنہ اور ہمیشہ ذہن میں تازہ تھی۔ طاقت نے لولو کو عین اس وقت اٹھا کر محاذ پہ کھڑا کر دیا جب اس کا خیال تھا کہ وہ بچ گیا ہے۔ طاقت نے اسے اپنا آپ دکھایا اور سمجھایا کہ زندگی اس کی اپنی نہیں تھی۔ یہ تھے معاملات؛ آپ انہیں تبدیل نہیں کر سکتے

تھے، آپ تو بس قواعد کی اطاعت ہی کر سکتے تھے۔ بس ان قواعد کو ایک مرتبہ سیکھ لینے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ لولو نے طاقت کے ساتھ صلح کر لی، اپنے بہنوئی کی طرح فراموشی کی دانش سیکھی جس نے قومی آئل کمپنی میں اعلیٰ عہدے پہ پہنچ کر لاکھوں کمائے تھے؛ جس طرح ایک اور بھائی نے بھی کرنے کی کوشش کی اور ناکام ہو کر پائی پائی کو محتاج ہو گیا۔ وہ جب بھی ملنے آتا تو کوئی چاندی کا برتن چرا کر لے جاتا اور بیچ کر سگریٹ پیتا۔

ماں کو یاد تھا کہ لولو نے ایک مرتبہ اس کے متواتر سوالات سے تنگ آ کر اسے بتایا: "احساس جرم ایک ایسا تعیش ہے جس کے متحمل صرف غیر ملکی ہو سکتے ہیں۔ جیسے جو کچھ منہ میں آئے بک دینا۔" ماں نہیں جانتی تھی کہ سب کچھ کھونا کیسا تجربہ ہے، آنکھ کھلنے پر معدہ خود کو ہی کھا رہا ہو تو کیسا لگتا ہے۔ وہ انجان تھی کہ سلامتی کا راستہ کس قدر پر ہنگام اور پر خطر ہو سکتا تھا۔ مطلق غور و فکر کے بغیر آپ بہ آسانی پھسل جاتے اور پیچھے جا گرتے ہیں۔

یقیناً لولو ٹھیک کہتا تھا۔ ماں ایک غیر ملکی تھی، متوسط طبقے کی سفید فام عورت، وراثتاً محفوظ، چاہے وہ اس تحفظ کی خواہش مند ہوتی یا نہ ہوتی۔ حالات ابتر ہونے پر اس کے پاس واپسی کی راہ ہمیشہ موجود تھی۔ اس ممکنہ راہ نے لولو کو اس کی کہی ہوئی ہر بات کی تردید کی؛ یہ ان کے درمیان ایک ناقابل عبور رکاوٹ تھی۔ اب اس نے کھڑکی سے باہر نظر ڈالی اور دیکھا کہ لولو اور میں آگے بڑھ گئے تھے۔ جہاں ہم بیٹھے تھے اس جگہ سے گھاس دبی ہوئی تھی۔ منظر نے اسے دہلا کر رکھ دیا۔ وہ ایک دم سراسیمگی کے عالم میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

طاقت نے اس کے بیٹے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

پیچھے مڑ کر دیکھوں تو یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ لولو ان دنوں میری ماں کی ذہنی کیفیت کو کبھی سمجھ پایا تھا، کہ ماں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اس کی تمام کارروائیاں محض ان کے درمیان فاصلہ بڑھاتی کیوں جا رہی تھیں۔ وہ ایسا آدمی نہیں تھا کہ خود سے ایسے سوالات کرتا۔ اس کے بجائے اس نے توجہ مرکوز رکھی، اور انڈونیشیا میں ہمارے قیام کے عرصے میں وہ اوپر چڑھتا رہا۔ اپنے بہنوئی کی مدد سے اس نے ایک امریکی آئل کمپنی کے شعبۂ سرکاری تعلقات میں نئی نوکری حاصل کی۔ ہم ایک بہتر علاقے میں منتقل ہو گئے؛ موٹر سائیکل کی جگہ کار آ گئی؛ مگرمچھوں اور ٹاٹا کی

جگہ ایک ٹیلی ویژن اور ہائی فائی نے لے لی؛ لولو کمپنی کے ایک کلب میں دستخط کر کے ہمیں کھانا کھلا سکتا تھا۔ کبھی کبھی بیڈروم میں اس کے اور ماں کے درمیان ہونے والی گفتگو میرے کانوں تک پہنچ جاتی۔ اکثر ماں اس کی کمپنی کی ڈنر پارٹیوں میں جانے سے انکار کر رہی ہوتی جہاں ٹیکساس اور لوئسیانا سے تعلق رکھنے والے امریکی بزنس مین لولو کی کمر پر تھپکی دیتے اور اپنی درخواستیں منظور کروانے کی خاطر ہاتھ ملاتے، جبکہ ان کی بیویاں میری ماں کو انڈونیشیائی تعاون کے متعلق شکایت کرتی رہتیں۔ لولو ماں سے کہتا کہ اکیلے جاتا ہوا وہ کیسا لگے گا، اور یاد دلاتا کہ یہ اس کے اپنے لوگ تھے، اور میری ماں کی آواز تقریباً دھاڑنے کی حد تک بلند ہو جاتی۔

وہ میرے لوگ نہیں ہیں۔

البتہ اس قسم کی بحث کبھی کبھار ہوتی؛ میری ماں اور لولو کے تعلقات میری بہن مایا کی پیدائش، علیحدگی اور انجام کار طلاق کے دوران دوستانہ رہے۔ پھر میں دس سال بعد لولو سے ملا جب میری ماں نے اسے جگر کے مرض کا علاج کروانے کی خاطر لاس اینجلس آنے میں مدد دی۔ اگر وہ علاج نہ کرواتا تو اکیالیس برس کی عمر میں ہی مر جاتا۔ میری نظروں میں آنے والے تناؤ کا زیادہ تر تعلق میری جانب ماں کے رویے میں درجہ بدرجہ تبدیلی کے ساتھ تھا۔ اس نے ہمیشہ انڈونیشیائی ثقافت کو اپنانے میں میری حوصلہ افزائی کی تھی: اس چیز نے مجھے خود انحصار، بجٹ تک محدود رہنے والا اور دیگر امریکی بچوں کے مقابلے میں خوش آداب بنا دیا تھا۔ اس نے مجھے جہالت اور غرور سے نفرت کرنا سکھایا جو عموماً بیرون ملک مقیم امریکیوں میں پایا جاتا ہے۔ لیکن اب لولو کی طرح اس نے بھی ایک امریکی اور ایک انڈونیشیائی کے زندہ رہنے کی ممکنات کے درمیان حائل خلیج کو جان لیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے بچے کو اس خلیج کے کس طرف ہونا چاہیے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ میں ایک امریکی تھا اور میری اصل زندگی کہیں اور تھی۔

ماں کی ابتدائی کوششوں کا مرکز تعلیم تھی۔ مجھے انٹرنیشنل سکول (جہاں جکارتہ کے زیادہ تر غیر ملکیوں کے بچے پڑھتے تھے) میں داخل کروانے کے لیے رقم نہ ہونے کے باعث اس نے مجھے فوراً ہی یو ایس مراسلاتی کورس کے اسباق دلوانا شروع کر دیے۔

اب اس کی کوششیں دوگنا ہو گئیں۔ ہفتے میں پانچ دن وہ صبح چار بجے میرے کمرے میں آتی، زبردستی ناشتہ کرواتی، پھر مجھے سکول بھجوانے اور خود کام پر جانے سے قبل مجھے تین گھنٹے تک انگلش

پڑھاتی رہتی۔ میں نے اس دستور کی شدید مخالفت کی، لیکن میری سوچی ہوئی ہر ترکیب (مثلاً پیٹ درد کا بہانہ کرنا یا ہر پانچ منٹ بعد آنکھیں بند کر لینا) کے جواب میں وہ بڑے تحمل سے ایک ہی جملہ دہراتی تھی:

"یہ میرے لیے کوئی تفریح نہیں ہے، گدھے۔"

پھر اسے گاہے بگاہے میرے تحفظ کے حوالے سے دورے پڑتے۔ میری نانی کی آواز غالب آنے لگی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک روز میں اندھیرا ہونے کے بعد گھر آیا تو دیکھا کہ اڑوس پڑوس کے لوگوں کا ایک ٹولہ میری تلاش میں مصروف تھا۔ وہ سب لوگ صحن میں جمع ہو گئے۔ ماں خفا لگتی تھی، لیکن وہ مجھے دیکھ کر اس قدر مطمئن ہو گئی کہ کئی منٹ تک میری کہنی کے گرد لپٹی ہوئی کیچڑ آلود گیلی جراب بھی نہ دیکھی۔

"یہ کیا ہے؟"

"کیا؟"

"وہ۔ تم نے جراب اپنی کہنی پہ کیوں لپیٹ رکھی ہے؟"

"چوٹ لگ گئی تھی۔"

"دکھاؤ تو ذرا۔"

"زیادہ چوٹ نہیں آئی۔"

"باری۔ دکھاؤ مجھے۔"

میں نے جراب کھولی اور اپنی کلائی پر آیا ہوا لمبا زخم سامنے کر دیا۔ وریدا ایک انچ دور رہ گئی تھی، لیکن زخم گوشت کے اندر تک تھا۔ میں نے ماں کو تسلی دینے کی غرض سے بتایا کہ کیا ہوا تھا: میں ایک دوست کے ساتھ اس کے فارم پر گیا تھا، بارش ہونے لگی اور میں پھسل گیا۔ فارم کی باڑ کے طور پر لگائی گئی خاردار تار......

"لولو!"

اب میری ماں یہ کہانی سناتے وقت ہنستی ہے، ایک ماں کی ہنسی جو اپنے بیٹے ... گناہوں کو معاف کر دے۔ لیکن یہ یاد کرتے وقت اس کا لہجہ کچھ بدل جاتا ہے ...

لگوانے کے لیے صبح تک انتظار کرنے کا کہا، اور ماں نے ایک پڑوسی سے درخواست کی کہ وہ اپنی کار میں ہمیں ہسپتال لے جائے۔ ماں کو یاد ہے کہ ہسپتال پہنچے تو وہاں زیادہ تر لائٹس آف تھیں، کوئی استقبالیہ کلرک نظر نہ آیا؛ برآمدوں میں اس کے دوڑنے کی آواز گونجتی رہی اور آخر کار باکسر نیکروں میں ملبوس دو نوجوان ایک کمرے میں مل گئے۔ ماں نے ان سے پوچھا کہ ڈاکٹر کہاں ہیں، تو نوجوانوں نے خوش ہو کر جواب دیا: ''ہم ڈاکٹر ہیں۔'' پھر انہوں نے اپنی کھیل مکمل کر کے ٹراؤزر پہنے اور میری بازو پر بیس ٹانکے لگائے جن کا بدنما داغ باقی رہ گیا۔ اس سارے عرصہ میں ماں کے ذہن پر یہی خوف چھایا رہا کہ اگر وہ نگرانی نہ کر رہی ہو تو اس کے بیٹے کی جان خطرے میں ہو گی، کہ آس پاس کا ہر شخص اپنی جدوجہد میں اس قدر مگن ہے کہ غور ہی نہیں کرے گا -- کہ خوفناک تقدیر کے خلاف لڑائی میں اسے ہمدردی تو مل جائے گی مگر کوئی ساتھی نہیں۔

اب میں محسوس کرتا ہوں کہ اسی قسم کے مسائل (جو سکول کی کتابوں یا میڈیکل سہولیات کی نسبت کم واضح تھے) ہی میری تعلیم پر توجہ مرکوز کرنے کی وجہ بنے۔ ماں مجھ سے کہتی، ''اگر تم ایک انسان بننا چاہتے ہو تو کچھ اقدار سیکھنا ضروری ہیں۔''

ایمان داری --- جب ٹیکس اہل کار آتے تو لولو سٹور روم میں رکھا ہوا ریفریجریٹر نہ چھپاتا، حالانکہ اہل کاروں سمیت ہر شخص اس قسم کی حرکات کی توقع رکھتا تھا۔ مساوی سلوک --- زیادہ امیر طلبا کے والدین کو رمضان کے دوران اساتذہ کو ٹیلی ویژن سیٹ نہیں دینے چاہئیں، اور ان کے بچوں کو زیادہ نمبر لینے پر فخر نہیں کرنا چاہیے۔ صاف گوئی --- اگر آپ کو سالگرہ پر میری طرف سے تحفے میں ملنے والی شرٹ پسند نہیں تو اسے اپنی الماری میں نیچے ٹھونس دینے کے بجائے صاف صاف کہہ دیں۔ بے لاگ رائے --- اگر دوسرے بچے غریب لڑکے کو اس کے ہیئر کٹ کی وجہ سے تنگ کرتے ہیں تو ضروری نہیں کہ آپ بھی ایسا کرنے کے مجاز نہیں ہو جاتے۔

یوں سمجھ لیں کہ آدھی دنیا پار کر کے، جانی پہچانی منافقت اور خود پرستی سے دور، میری ماں اپنے مڈ ویسٹرن ماضی کی خوبیوں کو اجاگر اور پیش کر سکی۔ مسئلہ یہ تھا کہ ماں کے پاس کمک بہت کم تھی؛ جب بھی وہ مجھے اس قسم کا سبق پڑھاتی تو میں اطاعت سے سر ہلا دیتا، لیکن اسے معلوم ہو گا کہ ان میں سے متعدد تصورات نا قابل عمل تھے۔ لولو نے محض غربت، کرپشن، تحفظ کی سر توڑ تلاش کی

وضاحت ہی کی تھی؛ وہ ان کا خالق نہیں تھا۔ یہ سب چیزیں میرے اردگرد رہیں اور میرے اندر ایک بے چین تشکیکیت پیدا کر دیا۔ سوئی کی نوک جیسی خوبیوں پر میری ماں کے اعتماد کا انحصار ایک عقیدے پر تھا جو میرے پاس نہیں تھا، ایسا عقیدہ جسے وہ مذہبی رنگ میں بیان کرنے سے انکار کر دیتی: ایسا عقیدہ جو منطقی اور صاحب فکر لوگ اپنی قسمت میں سے خود تراش سکتے ہیں۔ ایسی سرزمین جہاں تقدیر پرستی مشکل حالات سے نمٹنے کا واحد لازمی ہتھیار ہوں، جہاں مطلق سچائیاں روزمرہ حقائق سے الگ رکھی گئی ہوں، وہاں ماں سیکولر انسانیت پسندی کی تنہا گواہ تھی، نیو ڈیل کی سپاہی۔

اس سب میں اس کا بس ایک حلیف تھا، اور وہ میرے دور دراز بیٹھے باپ کی معتبریت تھی۔ اب وہ مجھے کثرت سے میرے باپ کی کہانی سنایا کرتی تھی: کہ کیسے اس نے ایک فلاکت زدہ براعظم کے نہایت غریب ملک میں غربت میں پرورش پائی؛ کہ اس کی زندگی کس قدر کٹھن تھی، لولو کے تصور سے بھی زیادہ مشکل۔ البتہ اس نے دامن نہ بچایا یا فرشتہ ہونے کو دکھاوا نہ کیا۔ وہ ہوشیار اور ایمان دار تھا، چاہے اس کی کچھ بھی قیمت ادا کرنا پڑی۔ اس نے اپنی زندگی اصولوں پر گزاری تھی جو اس سے ایک مختلف قسم کی سخت جانی کا مطالبہ کرتے تھے، ایسے اصول جو طاقت کی ایک اعلیٰ صورت کا وعدہ لیے ہوئے تھے۔ میری ماں نے فیصلہ کیا کہ میں اس کی مثال پر عمل کروں۔ یہ چیز میرے جینز میں تھی۔

''تمہیں اپنے بھنووں کے لیے میرا شکریہ ادا کرنا چاہیے..... تمہارے باپ کی بھنویں بہت کم گھنی تھیں۔ لیکن تمہارا دماغ اور کردار اسی پر گیا ہے۔''

ماں کا پیغام بالعموم سیاہ فام لوگوں کو گلے لگانا ہو گیا۔ وہ سول حقوق کی تحریک کے موضوع پر کتابیں، مہالیا جیکسن کی ریکارڈنگ، ڈاکٹر کنگ کی تقریریں لے کر گھر آتی۔ جب اس نے مجھے جنوب میں سکول کے بچوں کی کہانیاں سنائیں جنہیں زبردستی سفید فام سکولوں سے آئی ہوئی پرانی کتب پڑھنے پر مجبور کیا جاتا تھا مگر وہ اس کے باوجود ڈاکٹر، وکیل اور سائنس دان بنے، تو صبح سویرے اٹھ کر پڑھنے میں اپنی ہچکچاہٹ پر شرمسار ہوتا۔ اگر میں اسے انڈونیشیائی ہوا [illegible] دورے میں بطخ کی طرح چلنے کے مقابلے (جو صدر کے سامنے پیش کیا گیا) سے تعلق [illegible] ایک مختلف قسم کے مارچ کا ذکر کرتی، میری ہی عمر کے بچوں کا مارچ، آزادی کی خاطر [illegible]

Thourgood Marshall یا Sidney Poitier تھا؛ ہر سیاہ فام عورت فینی لوہیم یا لینا ہورنی تھی۔ سیاہ فام ہونے کا مطلب ایک عظیم ورثے، ایک خصوصی مقدر اور زبردست بوجھ کا حامل ہونا تھا جسے اٹھانے کی ہمت صرف ہم ہی رکھتے تھے۔

ہمیں یہ بوجھ سٹائل سے اٹھانا تھا۔ میری ماں نے ایک سے زائد مرتبہ نشان دہی کی: ''ہیری بیلافونٹ اس دنیا کا پرکشش ترین آدمی ہے۔''

اس سیاق و سباق میں مجھے ''لائف'' میگزین میں سیاہ فام شخص کی تصویر دیکھنے کا اتفاق ہوا جس نے اپنی جلد سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے دیگر سیاہ فام بچوں کے متعلق سوچا جو اس وقت انکشاف کے انہی جیسے لمحات سے گزر رہے تھے۔ شاید زیادہ تر لوگوں پر یہ چیز جلد عیاں ہو جاتی ہے۔ والدین کی طرف سے خبرداری کے مخصوص محلے کی حدود پار نہ کریں، یا باربی جیسے لمبے بال نہ ہونے کی مایوسی چاہے انہیں سلجھانے میں کتنی ہی دیر لگے، یا کسی آجر یا پولیس والے کے ہاتھوں باپ یا دادا کی بے عزتی --- یہ چیزیں اس وقت آپ کی سماعت تک پہنچتی ہیں جب آپ کو سوتا ہوا تصور کر لیا گیا ہو۔

مجھے معلوم ہے کہ اس مضمون کو دیکھنا میرے لیے باعث اشتعال تھا، گھات لگا کر کیا گیا ایک حملہ۔ ماں نے مجھے غیر متحمل افراد کے متعلق خبردار کر رکھا تھا...... کہ جاہل اور ان پڑھ لوگوں سے بچنا چاہیے۔ اگر میں ابھی تک اپنی اخلاقیات پر غور نہیں کر سکا تھا تو لولو نے مجھے بیماری سے معذوری، حادثات سے اپاہج پن، خوش قسمتی کو مسترد کرنے کے خطروں سے آگاہ کیا۔ میں بالکل درستگی کے ساتھ دوسروں اور کبھی کبھی اپنے اندر عام حرص کی نشان دہی کر سکتا تھا۔ لیکن اس ایک تصویر نے مجھے کچھ اور سمجھایا: کہ ایک دشمن باہر گھات لگائے بیٹھا تھا جو چوری چھپے مجھ تک پہنچ سکتا تھا، حتیٰ کہ مجھ سے بھی چھپ کر۔ اس رات سفارت خانے کی لائبریری سے واپس آنے پر میں باتھ روم میں گیا اور آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا...... میرے تمام حواس اور اعضا ہمیشہ کی طرح بظاہر ٹھیک لگتے تھے۔ میں نے سوچا کہ کیا میرے ساتھ کوئی مسئلہ ہو گیا تھا۔ متبادل بھی کچھ کم خوفناک نہیں لگتا -- کہ میرے اردگرد کے بڑے بوڑھے ایک پاگل پن میں زندگی گزار رہے تھے۔

تشویش کا ابتدائی ریلہ گزر گیا، اور میں نے انڈونیشیا میں اپنے باقی برس بھی پہلے کی طرح گزارے۔ میں نے ایک اعتماد برقرار رکھا جو ہمیشہ ہی بجا نہیں تھا۔ لیکن میرا نقطہ نظر ہمیشہ کے لیے بدل گیا۔ میں شام کے وقت شروع ہونے والے امپورٹڈ ٹی وی شوز میں غور کرنے لگا کہ ''I Spy'' میں کاسبی کبھی لڑکی تک نہ پہنچ سکا اور ''Mission Impossible'' میں سیاہ فام شخص نے اپنی ساری زندگی انڈر گراؤنڈ گزاری۔ میں نے دیکھا کہ توت اور گرامپس کی دی ہوئی Roebuck ،Sears Christmas کیٹالاگ میں میرے جیسا کوئی نہیں تھا، اور سانتا کلاز بھی گورا آدمی تھا۔

میں نے ان مشاہدات کو اپنے تک محدود رکھا اور فیصلہ کیا کہ یا تو میری ماں ان پر نظر ہی نہ ڈالتی یا پھر وہ مجھے محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہی تھی اور میں اس کی کاوشوں کو ناکامی سے دوچار نہیں کروں گا۔ مجھے اب بھی اپنی ماں کی محبت پر بھروسہ تھا --- لیکن اب مجھے یہ صورت حال درپیش تھی کہ دنیا اور اس دنیا میں میرے باپ کے مقام کے متعلق اس کا بیان کچھ نامکمل تھا۔

❦

تیسرا باب

افریقی شناخت!!

[illegible] میں انہیں شناخت کرنے میں مجھے کچھ دیر لگی۔ سلائیڈنگ دروازے کھلنے پر مجھے ہر طرف [illegible] بے قرار جگمگاتے ہوئے چہرے ہی نظر آئے۔ آخر کار میں نے مجمعے کے پیچھے سفید بالوں والا بلند قامت آدمی اور اس کے ساتھ ایک الونما عورت دیکھی جو بمشکل ہی نظر آرہے تھے۔ [illegible] ان کی طرف ہاتھ ہلانے لگا، لیکن جوابی ہاتھ ہلانے سے پہلے ہی وہ نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

میں نے سامنے والی قطار کو دیکھا جہاں ایک چینی خاندان کسٹمز حکام کے ساتھ کچھ مسائل میں الجھا ہوا لگتا تھا۔ ہانگ کانگ سے آنے والی پرواز کے دوران ان سب نے کافی دل بہلائے رکھا تھا۔ باپ اپنے جوتے اتار کر سیٹوں کے درمیان دبے پاؤں چلتا رہا، بچے سیٹوں کے اوپر گتھم گتھا ہونے، ماں اور نانی گدیاں اکٹھی کر کے ٹیک لگائے متواتر باتیں کرتی رہی تھیں۔ اب خاندان کے تمام افراد بالکل ساکت کھڑے تھے، کہ جیسے غیر مرئی بن جانا چاہتے ہوں۔ ان کی آنکھیں اپنے پاسپورٹ اور سامان کو ٹٹولتی ہوئی انگلیوں کو دیکھ رہی تھیں۔ چینی باپ کو دیکھ کر پتا نہیں مجھے لولو کیوں یاد آیا، اور میں نے اپنے ہاتھ میں اٹھائے ہوئے لکڑی کے ماسک کو دیکھا۔ یہ انڈونیشیائی معاون پائلٹ کی جانب سے ایک تحفہ تھا۔ وہ معاون پائلٹ میری ماں کا دوست تھا۔ جب میں، لولو اور میری نئی بہن مایا گیٹ کے پاس کھڑے تھے تو وہ ہمیں ساتھ لے کر چل دیا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے ماسک اپنے چہرے پر لگایا۔ لکڑی میں دارچینی کی مہک تھی اور میں نے خود کو سمندروں پار اور بادلوں کے اوپر، بنفشی افق میں تیرتے ہوئے محسوس کیا -- واپس اسی مقام کی

طرح جہاں سے میں کبھی آیا تھا۔

کسی نے میرا نام پکارا۔ ماسک ایک طرف گر گیا اور اس کے ساتھ ہی جاگتی آنکھوں کا سپنا بھی غائب ہوگیا۔ میں نے اپنے نانا نانی کو دوبارہ وہاں کھڑے، زور زور سے ہاتھ ہلاتے ہوئے دیکھا۔ اس مرتبہ میں نے بھی جواباً ہاتھ ہلایا؛ اور پھر سوچے بغیر ماسک دوبارہ چہرے پر لگا لیا۔ میرے نانا نانی ہنسے، میری جانب اشارہ کیا اور مزید جوش سے بھر گئے۔ اس دوران کسٹمز حکام نے چیکنگ مکمل کر کے میرے کندھے پر تھپکی دی اور پوچھا کہ کیا میں امریکی ہوں۔ میں نے ہاں میں سر ہلایا اور اپنا پاسپورٹ پکڑا دیا۔

''آگے چلے جاؤ،'' اس نے کہا اور چینی خاندان کو ایک طرف کھڑے ہونے کا کہا۔

سلائیڈنگ ڈور میرے پیچھے بند ہوگیا۔ توت نے مجھے سینے سے لگایا اور ٹافیوں و چیونگ گم سے بنا ہوا ایک ہار میرے گلے میں ڈال دیا۔ گرامپس نے میرے کندھے پر بازو رکھا اور کہا کہ ماسک بہت اچھا تھا۔ وہ مجھے اپنی نئی کار کی طرف لے گئے، اور گرامپس نے دکھایا کہ ایئر کنڈیشننگ سسٹم کیسے کام کرتا تھا۔ ہم نے ہائی وے پر سفر کیا، فاسٹ فوڈ کے ریسٹورنٹس اور سستے موٹلوں کے سامنے سے گزرے۔ میں نے انہیں سفر اور پیچھے جکارتہ میں رہ جانے والے تمام لوگوں کے متعلق بتایا۔ گرامپس نے مجھے بتایا کہ انہوں نے میرے اعزاز میں ایک استقبالی ڈنر کا اہتمام کیا تھا۔ توت نے رائے دی کہ مجھے سکول کے لیے نئے کپڑوں کی ضرورت تھی۔

پھر اچانک گفتگو رک گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں اجنبیوں کے ساتھ رہنے جا رہا تھا۔

پہلی مرتبہ جب ماں نے تفصیل بتائی تو نیا انتظام زیادہ برا معلوم نہیں ہوا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اب مجھے ایک امریکی سکول میں داخلہ لینا ہوگا؛ میں نے مراسلاتی کورس کے تمام اسباق کا مطالعہ کر لیا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ اور مایا جلد ہی...... شاید سال بھر میں...... میرے پاس ہوائی [illegible] جائیں گی اور کرسمس میرے ساتھ ہی منانے کی کوشش کریں گی۔ اس نے مجھے یاد دلایا کہ پچھلے [illegible] گرما میں ہی میں نے گرامپس اور توت کے ساتھ کتنا اچھا وقت گزارا تھا...... آئس کریم، [illegible] ساحل کی سیر۔ ''اور تمہیں صبح چار بجے جاگنا بھی نہیں پڑے گا،'' ماں نے نکتہ پیش کیا [illegible] پرکشش لگا۔

اب ایک غیر یقینی صورت حال میں خود کو ایڈجسٹ کرنے کی کوشش [illegible]

معمولات زندگی میں مشغول دیکھتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ وہ دونوں کس قدر بدل گئے تھے۔ ماں اور میری روانگی کے بعد انہوں نے یونیورسٹی کے قریب واقع وہ بڑا سا گھر بیچا اور بیریٹانیا سٹریٹ میں دو کمروں کا ایک چھوٹا سا اپارٹمنٹ کرائے پر لے لیا۔ گرامپس نے فرنیچر کا کاروبار ترک کیا اور لائف انشورنس ایجنٹ بن گیا، لیکن وہ لوگوں کو انشورنس خریدنے پر قائل کرنے کے قابل نہ ہونے اور انکار نہ سہہ سکنے کے باعث کام بہت خراب رہا۔ میں دیکھتا رہا کہ وہ ہر اتوار کی رات کو اپنا بریف کیس بھرتے اور کرسی کے سامنے ایک ٹی وی ٹرے سجاتے ہوئے بہت زیادہ غصے میں آنے لگا تھا۔ وہ ہر ممکنہ بڑبڑاہٹ پر جھنجھلاتا اور آخر کار ہمیں لونگ روم سے باہر نکال کر فون پر ممکنہ کلائنٹس کے ساتھ اپائنٹمنٹس شیڈول کرنے لگتا۔ کبھی کبھی میں سوڈا لینے دبے پاؤں کچن میں جاتا تو اس کی جھنجھلائی ہوئی آواز سنتا، اور پھر جب فون کے دوسری طرف موجود لوگ جمعرات کے بجائے منگل وار کو ملاقات پر اصرار کرتے تو خاموشی کا ایک طویل وقفہ چھا جاتا، اور پھر گرامپس فون رکھ کر گہری آہ بھرتا۔ اس کے ہاتھ گود میں رکھی فائلوں کو الٹتے پلٹتے۔

انجام کار کچھ ایک لوگ مان جاتے، مشکل مرحلہ گزر جاتا اور گرامپس کمرے میں گھوم پھر کر اپنی جوانی کی کہانیاں یا ریڈرز ڈائجسٹ میں پڑھا ہوا کوئی نیا لطیفہ سنانے لگتا۔ اگر کسی رات کو فون کالز پر معاملات اچھے رہے ہوتے تو وہ میرے ساتھ کوئی مدت سے زیرالتوا اسکیم بھی زیر غور لے آتا ...... ایک نظموں کی کتاب جو اس نے لکھنا شروع کی تھی، ایک خاکہ جو جلد ہی پینٹنگ بن جاتا، اس کے مثال گھر کا نقشہ۔ میں نے دیکھا کہ منصوبے زیادہ بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ ممکنات سے بھی دور ہٹتے گئے، لیکن ان میں مجھے اس کا بوڑھا شوق نظر آتا تھا، اور میں عموماً ایسے ہمت افزا سوالات پوچھتا جو اس کا اچھا موڈ قائم رکھتے۔ پھر گفتگو کے دوران ہی کسی موقعہ پر ہم دونوں توت کو میرے کمرے کے باہر ہال میں کھڑا دیکھتے۔ اس کا سر الزام دہی کے انداز میں ایک طرف کو جھکا ہوتا۔

''کیا بات ہے، میڈلین؟''

''تمہارے کالز کا کام ختم ہو گیا، ڈیئر؟''

''ہاں، میڈلین۔ کالز کا کام ہو گیا۔ رات کے دس بج رہے ہیں!''

''چلانے کی کوئی ضرورت نہیں، سٹینلے۔ میں تو بس پوچھنے آئی تھی کہ کیا اب میں کچن میں جا سکتی ہوں۔''

''میں چلا نہیں رہا! او یسوع مسیح، مجھے سمجھ نہیں آتی کہ کیوں.....'' لیکن توت اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی واپس بیڈروم میں چلی جاتی اور گرامپس غیض و غضب کی حالت میں [illegible] کمرے سے چلا جاتا۔

اس قسم کے جملوں کا تبادلہ میرے لیے اجنبی نہیں رہا تھا، کیونکہ میرے نانا نانی کی تکرار [illegible] شدہ انداز میں ہوتی۔ اس ساری بحث کی تہ میں یہ حقیقت موجود تھی کہ توت گرامپس کی [illegible] زیادہ رقم کماتی تھی۔ وہ اپنے شعبے میں مثالی ثابت ہوئی تھی --- کسی مقامی بینک کی پہلی خاتون وائس پریذیڈنٹ۔ اگرچہ گرامپس ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ اس نے توت کے کیریئر کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی ہے، لیکن اس کی نوکری دونوں کے درمیان وجۂ تنازعہ بن گئی تھی۔

ایسا نہیں تھا کہ توت نے اپنی کامیابی کی پیش بینی کی ہو۔ اس نے میری غیر متوقع پیدائش کے اخراجات پورے کرنے میں مدد دینے کی خاطر بطور سیکرٹری ملازمت شروع کی تھی، حالانکہ وہ کالج نہیں گئی تھی۔ لیکن وہ ہوش مند فیصلے کرتی اور دلجمعی سے کام کرنے کی اہل تھی۔ وہ آہستہ آہستہ قواعد پر عمل کرتے ہوئے سرفراز ہوئی اور ایسی سطح کو پہنچ گئی جہاں صرف قابلیت کافی نہ تھی۔ وہ بیس سال تک وہیں کی وہیں رہی، سال میں بمشکل ہی کوئی چھٹی کرتی، اپنے مرد ساتھیوں کو ترقی کرتے دیکھتی رہی۔

ایک سے زائد مرتبہ میری ماں نے توت کو بتایا کہ بینک اس قسم کے واشگاف جنسی امتیاز کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن توت میری ماں کی رائے کو پیار سے ٹالتے ہوئے کہتی کہ ہر شخص کسی نہ کسی چیز کے بارے میں شکایت کرنے کی وجہ ڈھونڈ سکتا ہے۔ توت کو کوئی شکایت نہ تھی۔ وہ ہر صبح پانچ بجے اٹھتی اور نائٹ گاؤن اتار کر سوٹ اور اونچی ایڑی والی پمپی پہن لیتی۔ وہ چہرے پر پاؤڈر لگاتی، ہونٹوں کو رنگتی، گھٹتے ہوئے بالوں کو پھلاتی، ساڑھے چھ بجے بس میں سوار ہوتی تا[illegible] باقی سب سے پہلے دفتر پہنچ سکے۔ وہ گاہے بگاہے اپنے کام پر فخر کا اظہار کرتی اور مقامی مالیاتی [illegible] کے پیچھے کی اصل کہانی سنا کر حظ اٹھاتی۔ البتہ جب میں کچھ بڑا ہوا تو اس نے رازداری [illegible] وہ ہمیشہ سفید بیرونی جنگلے والے گھر کا خواب دیکھتی رہی ہے، کہ اس نے ہمیشہ [illegible] مقامی لائبریری میں کچھ وقت لگانے کا تصور کیا ہے۔ چاہے یہ درست ہو یا [illegible] سمجھ آئی کہ اس کا کیریئر ایک ایسے دور پر محیط تھا جب گھر سے باہر بیوی [illegible]

تھا، نہ توت اور نہ ہی گرامپس کے لیے...... کہ یہ صرف وقت ضائع کرنے کے مترادف تھا۔ اپنے نواسوں کی ضروریات اور اجداد کی روایات نے توت کو ثابت قدم رکھا۔

اس نے ایک سے زائد مرتبہ مجھ سے کہا، ''باری! تم بچوں کو کچھ بنانا ہی میرے لیے اہم ہے۔''

میرے نانا نانی نے ایسی ہی زندگی گزاری تھی۔ وہ اب بھی کبھار اپنے اپارٹمنٹ میں آنے والے مہمانوں کے لیے ساشمی تیار کرتے۔ گرامپس اب بھی ہوائی کی سلی ہوئی شرٹس پہن کر دفتر جاتا اور توت بدستور توت کہلانے پر اصرار کرتی تھی۔ حالانکہ وہ مقصد کب کا فنا ہو چکا تھا جسے ساتھ لے کر وہ ہوائی میں آئے تھے۔ یہاں تک کہ باقاعدگی...... شیڈولز اور فراغت اور موسم کی باقاعدگی ہی ان کی سب سے بڑی تشفی بن گئی۔ وہ کبھی کبھی جزائر پر جاپانیوں کے قبضے پر چونچ لڑاتے اور کبھی بحث کرتے کہ چینیوں نے جزیرے کے فنانس پر قبضہ کر رکھا تھا۔ واٹرگیٹ کیس کی سماعت کے دوران میری ماں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور 1968ء میں امن وامان کے امیدوار نکسن کو ووٹ دیا۔ اب ہم اکٹھے ساحل یا پہاڑوں کی سیر کرنے نہیں جاتے تھے۔ رات کے وقت گرامپس ٹیلی ویژن دیکھتا اور توت اپنے کمرے میں بیٹھ کر قتل کہانیاں پڑھتی۔ اب نئے پردے یا علیحدہ فریزر ان کا مرکزی شوق بن گئے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ادھیڑ عمری میں حاصل ہونے والی تشفیوں، بالغ نظری، باوسائل توانائی، کامیابیوں کی قدر افزائی سے کنارہ کر گئے تھے۔ میری عدم موجودگی میں کسی وقت انہوں نے اپنے اخراجات گھٹانے اور کفایت شعاری اپنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اب کوئی منزل امید ان کی نگاہ میں نہ تھی۔

موسم گرما قریب آنے پر میں سکول جانے کو بے تاب ہونے لگا۔ میری سب سے بڑی دلچسپی اپنے ہم عمر دوست تلاش کرنا تھی، لیکن Punahou اکیڈمی میں میرا داخلہ نانا نانی کے لیے ایک عظیم شروعات کا نقیب تھا، خاندان کے رتبے میں اضافہ جس کے متعلق انہوں نے ہر کسی کو بتانے کے لیے زبردست کوشش کی۔ 1841ء میں مبلغوں کی قائم کردہ Punahou اکیڈمی ایک مؤقر پریپ سکول بن گئی تھی، جزیرے کی اشرافیہ کے لیے نکتۂ آغاز۔ اس کی شہرت نے میری ماں کو یہ فیصلہ کرنے پر مائل کیا کہ مجھے واپس سٹیٹس بھجوا دیا جائے: نانا نانی نے اسے بتایا کہ مجھے داخل کروانا آسان نہیں تھا؛ امیدواروں کی فہرست بہت طویل تھی، اور صرف گرامپس کے باس کی معاونت

سے ہی مجھے زیر غور رکھا گیا۔

گزشتہ موسم گرما میں میں نے Punahou میں داخلے کی آفیسر کو متعدد انٹرویو دیے تھے۔ وہ تیز تیز بولنے والی مستعد عورت تھی۔ انٹرویو کے بعد اس نے گرامپس کو اور مجھے کیمپس کے ٹور پر بلوایا۔ کیمپس متعدد ایکڑوں پر پھیلے ہوئے سرسبز و سایہ دار درختوں سے بھرا ہوا تھا، پکی اینٹ کے کمرے اور لوہے و شیشے کی کھڑکیاں۔ وہاں ٹینس کورٹس، سوئمنگ پول اور فوٹوگرافی سٹوڈیوز موجود تھے۔ ایک موقعہ پر ہم گائیڈ سے پیچھے رہ گئے اور گرامپس نے مجھے بازو سے پکڑ کر کہا:

''خدا کا نام لو باری۔ یہ سکول نہیں ہے۔ یہ جنت ہے۔ لگتا ہے مجھے بھی تمہارے ساتھ دوبارہ سکول میں داخلہ لینا پڑے گا۔''

داخلے کے نوٹس کے ساتھ معلوماتی کتابچوں کا موٹا سا پیکٹ بھی آیا تھا جسے توت نے ہفتے کی دوپہر کو پڑھنے کے لیے ایک طرف رکھ دیا۔ لیٹر میں کہا گیا تھا، ''Punahou خاندان میں خوش آمدید۔'' مجھے ایک لاکر تفویض کیا گیا تھا، میرا نام ڈنر کی فہرست میں شامل کرلیا گیا تھا (اگر میں اپنا لنچ باکس لانا چاہتا تو اسے چیک کیا جاتا)؛ ایک فہرست میں ان چیزوں کے نام لکھے تھے جو مجھے خریدنا تھیں--فزیکل ایجوکیشن کے لیے ایک یونیفارم، قینچی، پیمانہ، نمبر 2 پنسلیں، ایک کیلکولیٹر (اختیاری)۔ گرامپس نے ساری شام سکول کا پورا کیٹلاگ پڑھتے ہوئے گزاری۔ یہ کیٹلاگ ایک موٹی کتاب تھی جس میں اگلے سات برس کے دوران میری متوقع پیش رفت کی فہرست دی گئی تھی--کالج پریپ کورسز، غیر نصابی سرگرمیاں، کمال مہارت کی روایات۔ ہر نئے ایٹم پڑھنے پر گرامپس اور بھی زیادہ پرجوش ہوتا گیا؛ وہ کئی بار اوپر اٹھا، اپنے انگوٹھے کی مدد سے کتاب کا وہ صفحہ کھولے رکھا اور اس کمرے میں گیا جہاں توت مطالعہ کر رہی تھی۔ اس کی آواز حیرت سے بھری ہوئی تھی: میڈلین، ذرا یہ سنو!''

چنانچہ وفور جوش کے ساتھ گرامپس پہلے دن میرے ہمراہ سکول گیا۔ اس کا اصرار تھا کہ ہم وقت سے پہلے پہنچیں اور پانچویں وچھٹی جماعت کے لیے عمارت کا سل ہال ابھی تک کھولا نہیں گیا تھی۔ چند ایک بچے پہلے سے موجود تھے اور موسم گرما کی خبریں سننے میں مصروف تھے۔ ہم دبلے پتلے چینی لڑکے کے قریب بیٹھ گئے جس کی گردن میں بڑا سا ڈینٹل retainer تھا۔ گرامپس نے اس لڑکے سے کہا، ''کیا حال ہیں؟ یہ باری ہے۔ میں باری کا نانا ہوں۔

مجھے گرامپس کہہ سکتے ہو۔" اس نے لڑکے سے ہاتھ ملایا جس کا نام فریڈرک تھا۔ "باری نیا آیا ہے یہاں۔"

"میں بھی،" فریڈرک نے کہا، اور دونوں نے پرجوش گفتگو شروع کر دی۔ میں حواس باختہ حالت میں بیٹھا رہا۔ آخر کار دروازے کھلے اور ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر اپنے کلاس روم میں گئے۔ دروازے پر گرامپس نے ہم دونوں کی پشت پر تھپکی دی۔

"کوئی میرے والا کام نہ کرنا،" اس نے مسکرا کر کہا۔

"تمہارے نانا مزے کے ہیں،" فریڈرک بولا اور ہم گرامپس کو ہوم روم ٹیچر مس ہیفٹی سے اپنا تعارف کرواتے ہوئے دیکھتے رہے۔

"ہاں، مزے کے ہیں۔"

ہم دونوں ایک ساتھ میز پر بیٹھ گئے، اور متوسط عمر کی تراشے ہوئے سرمئی بالوں والی پرجوش ٹیچر مس ہیفٹی نے حاضری لگائی۔ جب اس نے میرا پورا نام لیا تو مجھے پورے کمرے میں کھی کھی کی آواز سنائی دی۔ فریڈرک میرے اوپر جھک کر بولا:

"میں سمجھا تھا کہ تمہارا نام باری ہے۔"

"کیا تم پسند کرو گے کہ ہم تمہیں باری کہہ کر پکارا کریں؟" مس ہیفٹی نے پوچھا۔ "باراک بہت خوب صورت نام ہے۔ تمہارے نانا نے مجھے بتایا ہے کہ تمہارا باپ کینیا سے تعلق رکھتا ہے۔ پتا ہے، میں بھی کینیا میں رہ کر آئی ہوں۔ میں تمہاری عمر کے بچوں کو پڑھایا کرتی تھی۔ وہ ایک شان دار ملک ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے باپ کا تعلق کس قبیلے سے ہے؟"

اس کے سوال نے مزید ہنسی کی بنیاد فراہم کی اور میں لمحہ بھر چپ رہا۔ آخر کار جب میں نے "Luo" کہا تو میرے پیچھے بیٹھے ایک لڑکے نے بلند مضحکہ خیز آواز میں لووو کہا...... بندر جیسی آواز۔ اب بچے خود پر ضبط نہ رکھ سکے اور کلاس کو ضابطے میں لانے کی خاطر مس ہیفٹی نے سخت الفاظ استعمال کیے۔ تب فہرست کے اگلے نام کی باری آئی۔

باقی سارے دن کے دوران میرا سر چکراتا رہا۔ سرخ بالوں والی ایک لڑکی نے میرے بالوں کو چھونے کی اجازت مانگی اور میرے انکار پر وہ کچھ رنجیدہ نظر آئی۔ سرخ چہرے والے ایک لڑکے نے پوچھا کہ کیا میرا باپ آدم خور ہے۔ گھر پہنچا تو گرامپس کھانا تیار کرنے میں مصروف تھا۔

"کیسا رہا؟ کتنی زبردست بات ہے کہ مس ہیفٹی کینیا میں رہ چکی ہے؟ مجھے یقین ہے کہ پہلا دن کافی آسان ہو گیا ہو گا۔"

میں نے اپنے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔

کلاس کے دوسرے بچوں کے لیے میری موجودگی جلد ہی باعث دلچسپی نہ رہی، البتہ میرا احساس بیگانگی بڑھتا گیا۔ گرامپس کے خرید کر دیے اور اپنے منتخب کیے ہوئے کپڑے پرانی وضع کے تھے؛ انڈونیشیائی سینڈلز جکارتہ میں میرے لیے بہت کارآمد رہے تھے لیکن یہاں آ کر بھونڈے لگنے لگے۔ زیادہ تر ہم جماعت کنڈرگارٹن کے زمانے سے اکٹھے پڑھتے آ رہے تھے؛ وہ ایک ہی علاقے میں رہتے تھے، سب کے گھر کئی منزلہ اور سوئمنگ پولز والے تھے؛ ان کے باپ ایک جیسی "لٹل لیگ" ٹیموں کی کوچنگ کرتے اور مائیں بیک سیلز کو سپانسر کرتی تھیں۔ کوئی بھی ساکر یا بیڈمنٹن یا شطرنج نہیں کھیلتا تھا، اور مجھے فٹ بال پھینکنا یا سکیٹ بورڈ پر توازن قائم رکھنا نہیں آتا تھا۔

دس سال کی عمر میں ایک خوفناک خواب۔ پھر بھی، اس پہلے ماہ کی غیر راحت بخش صورت حال میں بھی میں "مس فِٹ" قرار پانے والے دیگر بچوں سے زیادہ برا نہیں رہا تھا -- بہت لمبی یا زیادہ شرمیلی لڑکیاں، ہلکے سے مشتعل مزاج لڑکے، ایسے بچے جو دمے کی وجہ سے فزیکل ایجوکیشن میں حصہ نہ لے سکے۔

البتہ میری کلاس کا ایک اور بچہ مجھے ایک مختلف قسم کا دکھ یاد دلاتا تھا۔ اس کا نام کوریٹا تھا، اور میری آمد سے قبل وہ ہماری جماعت کی واحد سیاہ فام طالبہ ہوا کرتی تھی۔ وہ ایک گداز بدن اور گہری رنگت والی لڑکی تھی اور لگتا تھا کہ اس کے زیادہ دوست نہیں تھے۔ پہلے دن سے ہی ہم نے ایک دوسرے سے گریز کیا، لیکن فاصلے سے دیکھتے رہے، کہ جیسے براہ راست رابطہ ہمیں اپنی علیحدگی زیادہ گہرائی میں یاد دلائے گا۔

انجام کار، ایک گرم، بے بادل دن کو آدھی چھٹی کے وقت ہم دونوں نے خود کو پلے گراؤنڈ کے ایک ہی گوشے میں بیٹھے پایا۔ مجھے یاد نہیں کہ ہم نے ایک دوسرے سے کیا کہا، لیکن اتنا یاد ہے کہ وہ اچانک جنگل جمز اور جھلوں کے اردگرد میرے پیچھے دوڑ بھاگ رہی تھی۔ وہ کھنکھناتی آواز میں ہنسی، میں نے اسے ستایا، خوب بھگایا، آخر کار اس نے مجھے پکڑ لیا اور ہم دونوں زمین پہ لیٹ کر ہانپنے لگے۔ اوپر نظر کی تو بچوں کا ایک گروپ دکھائی دیا جن کے چہرے پیچھے چمکتے سورج کی وجہ سے

دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ وہ سب ہماری جانب اشارہ کناں تھے۔

''کوریٹا کو بوائے فرینڈ مل گیا! کوریٹا کو بوائے فرینڈ مل گیا!''

مزید بچے بھی شامل ہونے پر نعروں کی آواز بلند ہوگئی۔

''یہ میری گرل فرینڈ نہیں ہے،'' میں نے ناراضگی سے کہا اور مدد کے لیے کوریٹا کی جانب دیکھا۔ لیکن وہ وہیں کھڑی زمین کو گھورتی رہی۔ ''کوریٹا کو بوائے فرینڈ مل گیا! کوریٹا، تم اپنے بوائے فرینڈ کا بوسہ کیوں نہیں لیتی؟''

''میں اس کا بوائے فرینڈ نہیں ہوں!'' میں چلایا، بھاگ کر کوریٹا کے پاس گیا اور اسے ہلکا سا دھکا دیا۔ وہ پیچھے کی طرف ڈگمگائی اور میری طرف دیکھا، لیکن اب بھی کچھ نہ بولی۔ ''مجھے چھوڑ دو۔'' میں دوبارہ چلایا۔ اچانک کوریٹا بھاگ کھڑی ہوئی، اندھا دھند، اور نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ ستائشی ہنسی کی آوازوں نے مجھے گھیر لیا۔ تب گھنٹی بجی اور ٹیچرز ہمیں واپس کلاس میں لے جانے کے لیے آگئے۔

باقی کی ساری دوپہر کے دوران کوریٹا کے تاثرات بار بار آنکھوں کے سامنے آتے رہے: اس کے بھاگ کھڑے ہونے سے پہلے کا چہرہ، اس کی مایوسی اور الزام دہی کا تاثر۔ میں کسی طرح اس پر واضح کرنا چاہتا تھا کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں، میری کبھی کوئی دوست نہیں رہی تھی اور میں اب اس کی کوئی خصوصی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتا تھا۔ مگر مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ آیا یہ بات درست ہے۔ مجھے صرف یہ پتا تھا کہ کوئی وضاحت کرنے کا وقت گزر چکا ہے، کہ کسی نہ کسی طرح مجھے آزمایا اور خواہش مند پایا گیا؛ اور جب بھی میں نے کوریٹا کے ڈیسک کی طرف کن انکھیوں سے دیکھا تو وہ سر جھکائے کام میں مصروف نظر آئی، کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہوا۔

اس بے وفائی نے مجھے دوسرے بچوں کے دل میں کچھ جگہ دلا دی، اور کوریٹا کی طرح میں بھی زیادہ تر اکیلا ہی رہتا۔ میں نے کچھ دوست بنائے، کلاس میں کم سے کم بولنا سیکھا اور فٹ بال کو گھما کر پھینکنے میں کامیابی حاصل کی۔ لیکن اس دن کے بعد میرا ایک حصہ کچلا گیا اور میں نے اپنے نانا نانی کی دی ہوئی زندگی میں پناہ لی۔ سکول سے فراغت کے بعد میں پانچ بلاکس پیدل چل کر اپنے اپارٹمنٹ تک پہنچتا؛ اگر جیب میں کچھ سکے ہوتے تو ایک نابینا اخبار والے کے نیوز سٹینڈ کے پاس رک جاتا جو بتاتا کہ کونسے نئے کامکس آئے ہیں۔ گرامپس گھر پر ہی موجود ہوتا۔ وہ میرے لیے

دروازہ کھولتا اور جب قیلولہ کرنے چلا جاتا تو میں کارٹون اور مزاحیہ پروگرام دیکھتا۔ ساڑھے چار بجے میں گرامپس کو جگاتا اور وہ مجھے گاڑی میں ساتھ بٹھا کر توت کو لینے نکلتا۔ میرا ہوم ورک ڈنر سے پہلے پہلے مکمل ہو جاتا اور پھر ہم سب ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ میری باقی کی شام وہیں گزرتی۔ میں گرامپس کے ساتھ گفتگو کرتا کہ کونسے پروگرام دیکھنے چاہئیں، اسے سپر مارکیٹ میں اپنے دریافت کردہ تازہ ترین سنیک فوڈ کے متعلق بتاتا۔ دس بجے میں اپنے کمرے (جانی کارسن تقریباً اسی وقت لگتا تھا اور یہ چیز قابل بحث نہ تھی)، اور ریڈیو پر ٹاپ 40 کی آوازیں سنتے ہوئے سو جاتا۔

امریکہ کی صارف ثقافت کی چھاتی سے لگ کر میں نے محفوظ محسوس کیا۔ یوں سمجھ لیں کہ میں ایک طویل سرمائی نیند کے خمار میں کھو گیا تھا۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر ایک روز میل باکس میں توت کے نام ٹیلی گرام نہ آتا تو جانے کب تک وہیں دبکا رہتا۔

توت نے مجھے بتایا، ''تمہارا باپ تم سے ملنے آرہا ہے۔ دو ہفتے بعد تمہاری ماں یہاں پہنچے گی۔ وہ نیو ایئر اکٹھے ہی منائیں گے۔''

اس نے بڑی احتیاط سے کاغذ تہ کر کے کچن کی دراز میں رکھ دیا۔ وہ اور گرامپس دونوں خاموش ہوگئے، جیسے ڈاکٹر کی جانب سے کوئی سنگین مگر قابل تدارک مرض کے متعلق بتائے جانے پر لوگ اکثر ہو جایا کرتے ہیں۔ ایک لمحے کے لیے تو کمرہ بے ہوا ہو گیا اور ہم اپنی اپنی سوچوں کے ساتھ معلق کھڑے رہے۔

آخر کار توت بولی: ''میرے خیال میں بہتر ہوگا کہ ہم اسے ٹھہرانے کے لیے کسی جگہ کا بندوبست کرلیں۔''

گرامپس نے چشمہ اتار کر آنکھیں ملیں۔

''یہ کرسمس تو برباد ہو جائے گی۔''

لنچ کے دوران میں نے لڑکوں کے ایک گروپ کو بتایا کہ میرا باپ شہزادہ ہے۔

''دیکھو، میرا دادا سردار ہے۔ سردار قبیلے کا بادشاہ ہی ہوتا ہے.... جیسے ہندوستانیوں کے ہاں۔ سو اس لحاظ سے میرا باپ شہزادہ ہی ہوا۔ میرے دادا کے مرنے پر وہ بادشاہ بن جائے گا۔''

''اس کے بعد کون آئے گا؟ میرا مطلب ہے کہ کیا تم واپس جا کر شہزادے بنو گے؟'' ایک لڑکے نے پوچھا جب ہم اپنے خالی ٹرے کوڑادان میں پھینکنے جا رہے تھے۔

''ہاں.... اگر میرا دل چاہے تو بن سکتا ہوں۔ دیکھو، یہ معاملہ ذرا پیچیدہ ہے کیونکہ قبیلہ جنگجوؤں سے بھرپور ہے۔ جیسے اوباما..... یعنی دہکتا ہوا نیزہ۔ ہمارے قبیلے کے سب مرد سردار بننا چاہتے ہیں، لہٰذا مجھے لانے کے لیے میرے باپ کو یہ تمام جھگڑے طے کرنا ہوں گے۔''

جب میرے منہ میں سے یہ الفاظ نکلے تو لگا کہ لڑکے مجھے ایک نئی نظر سے دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے، وہ زیادہ متجسس اور مانوس ہو گئے تھے۔ میں ایک حد تک واقعی اس کہانی کو درست سمجھتا تھا۔ لیکن میری ذات کا ایک اور حصہ جانتا تھا کہ میں جھوٹ کہہ رہا ہوں اور اس سب کی بنیاد اپنی ماں سے سنی ہوئی من گھڑت باتوں پر ہے۔ اپنے باپ کو جیتے جی دیکھ لینے کے ایک ہفتے بعد میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اس کے زیادہ دور کے تاثر کو ترجیح دوں گا، ایک ایسا تاثر جسے میں جب چاہوں بدل سکوں...... یا جب مناسب سمجھوں نظرانداز کر دوں۔ اگر میرے باپ نے مجھے مایوس نہ کیا ہوتا تو وہ ایک نامعلوم چیز ہی رہتا، مبہم طور پر خطرناک اور بھک سے اڑ جانے والی چیز۔

ماں نے اس کی آمد سے پہلے کے دنوں میں میرے خدشات کو بھانپ لیا تھا--- میرے خیال میں اسے خود بھی یہی خدشات تھے--- لہٰذا اپنے اپارٹمنٹ کا ایک حصہ اس کے لیے تیار کرنے کے دوران ماں نے مجھے یقین دلایا کہ خاندان کی دوبارہ ملاقات میں کوئی مسئلہ پیش نہیں آئے گا۔ اس نے انڈونیشیا میں گزارے ہوئے سارے عرصے میں میرے باپ کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ قائم رکھا تھا اور باپ کو میرے متعلق سب کچھ معلوم تھا۔ ماں کی طرح میرے باپ نے بھی دوبارہ شادی کر لی تھی اور اب میرے پانچ بھائی اور ایک بہن کینیا میں رہتے تھے۔ اس کا ایک کار ایکسیڈنٹ ہوا تھا اور یہ ملاقاتی دورہ طویل عرصہ ہسپتال میں گزارنے کے بعد کر رہا تھا۔

''تم دونوں بہت اچھے دوست بن جاؤ گے،'' ماں نے فیصلہ سنایا۔

میرے باپ کی آمد کی اطلاع ملتے ساتھ ہی ماں مجھے کینیا اور اس کی تاریخ کے متعلق بتانے لگی--- کینیا کے پہلے صدر جومو کینیاتا کے متعلق ایک کتاب سے ہی میں نے 'دہکتا ہوا نیزہ' کا مفہوم اخذ کیا تھا۔ لیکن ماں کی فراہم کردہ کوئی بھی معلومات میرے شکوک زائل نہ کر سکی اور میں نے بہت کم باتوں کو اپنے دل میں جگہ دی۔ صرف ایک مرتبہ مجھے کچھ دلچسپی پیدا ہوئی، جب ماں نے

بتایا کہ میرے باپ کے قبیلے Luo کے لوگ نیلی (Nilotic) باشندے تھے جو دنیا کے عظیم ترین دریا کے کناروں سے ہجرت کر کے کینیا میں آئے تھے۔ یہ چیز کچھ حوصلہ افزا معلوم ہوئی۔ [illegible] کے پاس اپنی بنائی ہوئی ایک پینٹنگ اب بھی موجود تھی--- دبلے پتلے، کانسی جیسے بدن والے مصری جن کے سنہری رتھ میں الاباسٹر گھوڑے جتے تھے۔ میرے ذہن میں قدیم مصر، اس کی عظیم سلطنتوں، اہرام اور فراعین نفرتتی اور کلیوپیٹرا کے ہیولے موجود تھے۔

ایک اتوار کو میں اپنے اپارٹمنٹ کے قریب واقع ایک پبلک لائبریری میں گیا اور لائبریرین کی مدد سے مشرقی افریقہ کے موضوع پر ایک کتاب نکلوائی۔ بس وہاں اہرام کا کوئی ذکر نہ تھا۔ درحقیقت Luos قبیلے کو ایک مختصر سے پیراگراف کا ہی حق دار سمجھا گیا۔ پتا چلا کہ Nilote متعدد ایسے خانہ بدوش قبائل کو کہتے تھے جن کا اصل وطن سفید نیل کے ساتھ ساتھ، مصری بادشاہوں سے کافی دور جنوب کی طرف سوڈان میں تھا۔ Luo لوگ مویشی پالتے، کچے جھونپڑوں میں رہتے اور مکئی، باجرہ اور شکرقندی کھاتے تھے۔ میں نے کتاب کو میز پر کھلا ہی چھوڑ دیا اور لائبریرین کا شکریہ ادا کیے بغیر باہر آ گیا۔

آخر کار وہ بڑا دن آ گیا، اور مس ہیفٹی نے مجھے وقت سے پہلے کلاس سے جانے کی اجازت دیتے ہوئے دعا دی۔ میں کسی لعنت زدہ شخص کی طرح سکول کی عمارت سے باہر آیا۔ میری ٹانگیں بوجھل ہو رہی تھیں اور ہر نپے تلے قدم کے ساتھ میری چھاتی کے اندر بوجھ بڑھتا گیا۔ دروازہ بند ہوا، دوبارہ کھلا اور چوتھی منزل پر رہنے والا بوڑھا فلپینو سامنے آیا۔

وہ آدمی چہکتی ہوئی آواز میں بولا، ''تمہارے نانا نے بتایا ہے کہ تمہارا باپ آج ملنے آ رہا ہے۔ تم بہت خوش ہو گے۔''

دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر ہونولولو کے افق پر دور دراز بحری جہاز کو دیکھتے رہنے کے بعد میں نے سوچا کہ اب بچنے کی راہ باقی نہیں ہے تو گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ توت نے دروازہ کھولا۔

''لو آ گیا۔ ادھر آؤ باری..... آؤ اپنے باپ سے ملو۔''

اور وہاں غیر روشن ہال میں مَیں نے ایک دراز قامت، تاریک شبیہ کو دیکھا جو ہلکی سی [illegible] کے ساتھ چلتی ہوئی میرے پاس آئی۔

وہ آگے کو جھکا اور مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ میں نے اپنے بازو لٹکے رہنے دیے۔ اس نے

پیچھے میری ماں حسب معمول تھرکتی ہوئی ٹھوڑی لیے کھڑی تھی۔

میرے باپ نے کہا،''واہ، باری۔ اتنے عرصے بعد تم سے مل کر بہت اچھا لگا، بہت اچھا۔''

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے لونگ روم میں لے گیا اور ہم سب بیٹھ گئے۔

''سو، باری، تمہاری نانی نے مجھے بتایا ہے کہ تم سکول میں کافی اچھے جا رہے ہو۔''

میں نے کندھے اچکا دیے۔

''میرے خیال میں وہ کچھ جھجک رہا ہے۔'' توت نے رائے پیش کی اور مسکرا کر میری پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔

میرا باپ بولا،''ٹھیک ہے۔ اگر تم اچھے جا رہے ہو تو تمہیں شرمانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیا میں نے تمہیں بتایا ہے کہ تمہارے بہن بھائی بھی بہت لائق ہیں؟ میرا خیال ہے کہ یہ چیز ہمارے خون میں ہے،'' وہ ہنسنے لگا۔

میں نے بڑوں کو گفتگو شروع کرتے ہوئے دیکھا۔ میرا باپ میری توقع سے زیادہ دبلا تھا، گھٹنوں کی ہڈیاں ٹراؤزر کے پائنچوں میں سے نمایاں ہو رہی تھیں؛ میں تصور نہیں کر پا رہا تھا کہ وہ کسی کو زمین سے اوپر اٹھا سکتا ہو گا۔ اس کے پہلو میں ہاتھی دانت کے دستے والی چھڑی دیوار کے ساتھ رکھی تھی۔ اس نے نیلے رنگ کا بلیزر، سفید شرٹ اور بنفشی ایسکاٹ پہن رکھی تھی۔ سینگ کے فریم والے چشمے میں لیمپ کی روشنی کا عکس پڑنے کے باعث میں اس کی آنکھیں بخوبی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ لیکن جب اس نے ناک کی ہڈی صاف کرنے کے لیے چشمہ اتارا تو مجھے دو ہلکی پیلی، کسی ملیریا زدہ شخص جیسی آنکھیں نظر آئیں۔ میں نے سوچا کہ وہ بہت کمزور ہے۔ کوئی ایک گھنٹے بعد میری ماں نے کہا کہ وہ تھکا ہوا لگتا ہے، لہٰذا کچھ آرام کر لے۔ وہ مان گیا۔ اس نے سفری سامان اکٹھا کیا، پھر بیچ راہ میں رکا اور بیگ میں کچھ ڈھونڈنے لگا۔ اس نے آخر کار تین لکڑی کی شبیہیں نکالیں...... ایک شیر، ایک ہاتھی اور قبائلی لباس میں ایک آدمی ڈھول بجاتے ہوئے۔ اس نے یہ چیزیں مجھے پکڑا دیں۔

''باری، شکریہ ادا کرو،'' میری ماں بولی۔

''شکریہ،'' میں بڑبڑایا۔

میں اور میرے باپ دونوں نے شبیہوں کی جانب نیچے دیکھا جو میرے ہاتھوں میں بے جان پکڑی تھیں۔ اس نے میرے کندھے کو چھوا۔

''یہ تو محض چھوٹی سی چیزیں ہیں،'' وہ نرمی سے بولا۔ پھر اس نے گرامپس کو سر سے اشارہ کیا، انہوں نے مل کر اس کا سامان اکٹھا کیا اور دوسرے اپارٹمنٹ میں چلے گئے۔

ایک ماہ۔ ہم بس اتنا عرصہ ہی ساتھ رہے۔ ہم پانچوں زیادہ تر شام نانا نانی کے لونگ روم میں گزارتے، دن کے دوران کار پر جزیرے کی سیر کرنے یا چہل قدمی کرنے نکلتے۔ راستے میں ہماری خاندانی یادگاریں آتیں: وہ جگہ جہاں کبھی میرے باپ کا اپارٹمنٹ ہوا کرتا تھا؛ نئے سرے سے تعمیر کیا گیا ہسپتال جہاں میں پیدا ہوا؛ ہوائی میں یونیورسٹی ایونیو کے سامنے میرے نانا نانی کا پہلا مکان۔ اس ایک ماہ میں کرنے کو بہت سی باتیں تھیں؛ بہت سی وضاحتیں کرنا پڑیں؛ اس کے باوجود جب میں اپنی یادداشت کے پرانے صفحات کھولتا اور اپنے باپ کے الفاظ پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں تو وہ محو شدہ لگتے ہیں۔ شاید وہ نہایت گہرائی میں منقش ہیں، اس کی آواز اپنے ساتھ ہر وقت ہونے والی ہر قسم کی الجھی ہوئی بحثوں کا تخم ہے--میرے جینز کی ساخت میں رچے ہوئے۔ میری بیوی ایک زیادہ سادہ وضاحت پیش کرتی ہے--ان لڑکوں اور ان کے باپوں کے پاس اس وقت تک کرنے کو کوئی بات نہیں ہوتی جب تک انہیں اعتبار نہ آ جائے--اور شاید یہی بات ہے، کیونکہ میں نے اکثر اس کے سامنے خود کو بے آواز محسوس کیا اور اس نے کبھی مجھے بولنے پر نہ اکسایا۔ میرے ذہن میں بس شبیہیں ہی باقی ہیں جو دور کی آوازوں کی طرح ابھرتی اور زائل ہو جاتی ہیں: گرامپس کے سنائے ہوئے لطیفوں پر اس کا ہنسی کے مارے ہلتا ہوا سر؛ اپنے کالج کے ایک دوست سے ملواتے وقت میرے کندھے پر اس کی گرفت؛ کوئی اہم کتاب پڑھتے وقت اس کا اپنی آنکھیں سکیڑ لینا۔

شبیہیں اور دوسرے لوگوں پر اس کا اثر۔ کیونکہ وہ جب بھی بولتا تھا-- ٹانگ پہ ٹانگ دھرے، بڑے بڑے پھیلے ہوئے ہاتھ جو توجہ کھینچتے یا منتشر کرتے، اس کی گہری اور پر یقین آواز، ہنسی مذاق--تو مجھے کنبے میں ایک اچانک تبدیلی واقع ہوتے محسوس ہوتی۔ گرامپس زیادہ پرجوش اور پرفکر ہو جاتا، میری ماں زیادہ شرمیلی بن جاتی؛ حتیٰ کہ توت اپنے بیڈروم کی دیوار میں بنے سوراخ میں سے سگریٹ کا دھواں باہر پھونکتے ہوئے اس کے ساتھ سیاست یا مالیات پر بات کرنے لگتی اور اپنی نیلی رگوں والے ہاتھ لہرا لہرا کر دلائل دیتی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے اس کی موجودگی

نے پرانے دور کا جذبہ زندہ کر دیا ہو اور ہر کسی کو اس کا پرانا کردار واپس دلا دیا ہو؛ کہ جیسے ڈاکٹر کنگ کو کبھی گولی نہ ماری گئی ہو اور کینیڈی خاندان اب بھی قوم کا مینارۂ نور ہو، اور جنگ و فساد اور قحط محض عارضی مسائل ہوں۔

اس کی یہ انوکھی طاقت میرے لیے مسحور کن تھی، اور میں پہلی مرتبہ اپنے باپ کو حقیقی اور براہ راست شخصیت کے طور پر لینا شروع ہوا بلکہ شاید پائیدار معنوں میں بھی۔ البتہ کچھ ہفتے بعد مجھے اپنے اردگرد حالات کشیدہ ہوتے محسوس ہوئے۔ گرامپس نے شکایت کی کہ میرا باپ اس کی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ توت برتن دھونے کے دوران زیرلب بڑبڑاتی کہ وہ کسی کی نوکر نہیں۔ کھانا کھاتے ہوئے میری ماں کے ہونٹ بھنچ جاتے، آنکھیں والدین کو دیکھنے سے گریز کرتیں۔ ایک شام کو میں نے کارٹون سپیشل How the Grinch Stole Christmas...... دیکھنے کے لیے ٹیلی ویژن آن کیا تو سرگوشیاں چیخنے چلانے کی صورت اختیار کر گئیں۔

میرے باپ نے کہا، ”باری! تم نے کافی دیر ٹیلی ویژن دیکھ لیا ہے۔ اب اپنے کمرے میں جا کر پڑھو، ہم نے کچھ بات کرنی ہے۔“

توت نے اٹھ کر ٹیلی ویژن آف کر دیا۔ ”باری! تم بیڈروم میں جا کر کیوں نہیں دیکھ لیتے۔“

”نہیں، میڈلین۔ میں نے یہ نہیں کہا۔ وہ متواتر ٹی وی دیکھ رہا ہے اور اب اس کے پڑھنے کا وقت ہے،“ میرا باپ بولا۔

ماں نے وضاحت کرنا چاہی کہ کرسمس کی چھٹیاں تقریباً شروع ہو چکی تھیں، کہ وہ کارٹون کرسمس کا مقبول ترین پروگرام تھے، کہ میں سارے ہفتے اس کا انتظار کرتا رہا ہوں۔ ”زیادہ دیر نہیں لگے گی۔“

”اینا، یہ بالکل حماقت ہے۔ اگر بچے نے کل کا کام کر لیا ہے تو وہ اگلے دن کی اسائنمنٹس شروع کر سکتا ہے۔ یا وہ اسائنمنٹس بھی کی جا سکتی ہیں جو چھٹیوں کے بعد کے لیے ملی ہیں۔“ وہ میری طرف مڑا، ”سن لو باری، تم اتنی محنت نہیں کر رہے جتنی تمہیں کرنی چاہیے۔ اب جاؤ، اس سے پہلے کہ مجھے تم پر غصہ آ جائے۔“

میں نے اپنے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا اور آوازوں کو بلند ہوتے سنتا رہا۔ گرامپس

مُصر تھا کہ یہ اس کا گھر ہے، توت کہہ رہی تھی کہ میرے باپ کو اتنے عرصے بعد گھر میں آ گھسنے اور میرے سمیت ہر کسی پر غصہ کرنے کا کوئی حق نہیں۔ میں نے اپنے باپ کو ماں سے کہتے سنا کہ وہ مجھے ضائع کر رہے تھے، کہ مجھ پر سختی کرنی چاہیے، اور میری ماں اپنے والدین سے کہہ رہی تھی کہ ان کے درمیان کچھ بھی نہیں بدلا۔ ہم سب ملزم بنے کھڑے تھے۔ میرے باپ کے چلے جانے کے بعد توت میرے کمرے میں آئی اور کہا کہ میں آخری پانچ منٹ کا شو دیکھ سکتا ہوں۔ تب مجھے لگا کہ ہم سب کے درمیان ایک شگاف پڑ گیا تھا۔ میں اپنے باپ کی واپسی میں باقی دن گننے اور حالات معمول پر آنے کا انتظار کرنے لگا۔

اگلے روز توت نے مجھے یہ دیکھنے کے لیے باپ والے اپارٹمنٹ میں بھیجا کہ کہیں کوئی کپڑے تو دھلنے والے نہیں پڑے۔ میں نے دستک دی، باپ نے دروازہ کھولا۔ وہ شرٹ کے بغیر سامنے کھڑا تھا۔ اندر میں نے اپنی ماں کو اس کے کپڑے استری کرتے دیکھا۔ اس کے بال پونی ٹیل کی صورت میں بندھے ہوئے تھے، آنکھیں گہری اور نیم وا تھیں، کہ جیسے وہ روئی ہو۔ میرے باپ نے مجھے اپنے پاس بستر پہ بیٹھنے کو کہا، لیکن میں نے کہہ دیا کہ توت کو میری مدد درکار ہے، اور پیغام پہنچا کر وہاں سے چلا گیا۔ واپس اوپر اپنے کمرے میں پہنچ کر میں صفائی کرنے لگا تو ماں آئی۔

”تمہیں اپنے باپ پر غصے میں نہیں آنا چاہیے، باری۔ وہ تم سے بہت پیار کرتا ہے۔ بس کبھی کبھی وہ ذرا ضدی ہو جاتا ہے۔“

”او کے،“ میں نے اوپر دیکھے بغیر کہا۔ میں اس کی نگاہوں کو کمرے میں اپنا تعاقب کرتے محسوس کر سکتا تھا۔ آخر کار اس نے ایک گہری سانس بھری اور دروازے کی طرف گئی۔

”میں جانتی ہوں کہ یہ سب کچھ تمہارے لیے پریشان کن ہے، لیکن میرے لیے بھی ہے۔ میں نے جو کچھ کہا ہے اسے یاد رکھنا، او کے؟“ ماں نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا، ”کیا تم چاہتے ہو کہ میں دروازہ بند کر دوں؟“

میں نے مثبت میں سر ہلایا لیکن وہ صرف ایک منٹ کے لیے ہی گئی اور دوبارہ اپنا سر میرے کمرے میں گھسیڑ کر بولی:

”ویسے میں تمہیں بتانا بھول گئی تھی کہ مس ہیفٹی نے تمہارے باپ کو بروز جمعرات سکول

آنے کی دعوت دی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ تمہارا باپ کلاس سے کچھ باتیں کرے۔"

میں اس سے بری خبر کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ساری رات اور اگلا سارا دن اس ناگزیر حقیقت کے متعلق اپنی سوچوں کو دبانے میں گزرا: میرے ہم جماعت مٹی سے بنے جھونپڑوں کا سن کر کیسی شکلیں بنائیں گے، تمام جھوٹ پکڑے جائیں گے، بعد میں دردناک مذاق ہوں گے۔ ہر مرتبہ سوچنے پر میرا پورا جسم لرز اٹھتا۔

اگلے روز جب میرا باپ چلتا ہوا ہماری کلاس میں آیا تو میرے ذہن میں ہنوز یہی خیالات تھے۔ مس ہیفٹی نے اس کا پرتپاک استقبال کیا، اور اپنی کرسی پہ بیٹھنے پر میں نے کئی بچوں کو آپس میں کہتے سنا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اس وقت میں اور بھی پریشان ہو گیا جب ریاضی کا ٹیچر مسٹر ایلڈرج ساتھ والی کلاس کے تیس گڑبڑائے ہوئے بچوں کو لے کر کمرے میں آ گیا۔

مس ہیفٹی نے بولنا شروع کیا، "آج آپ سب کے لیے ایک خصوصی موقعہ ہے۔ باری اوباما کے والد افریقی ملک کینیا سے سفر کر کے یہاں آئے ہیں۔ وہ ہمیں اپنے ملک کے بارے میں بتائیں گے۔"

جب میرا باپ کھڑا ہوا تو دوسرے بچوں نے میری طرف دیکھا اور میں اپنی گردن اکڑا کر اس کے پیچھے بلیک بورڈ پر ایک خالی نقطے پر توجہ مرکوز کرنے کی کوشش میں لگ گیا۔ اسے بولتے ہوئے کچھ دیر ہو چکی تھی جب میں اپنے گردوپیش میں واپس لوٹا۔ وہ مس ہیفٹی کے پرانے، موٹی لکڑی والے ڈیسک پر جھکا ہوا کرۂ ارض کی اس گہری کھائی کے متعلق بتا رہا تھا جہاں نسل انسانی کا ظہور ہوا۔ اس نے بتایا کہ اب بھی جنگلی جانور میدانوں میں گھومتے ہیں، کچھ قبیلوں میں لڑکے کو اپنی مردانگی ثابت کرنے کی خاطر شیر کا شکار کرنا پڑتا ہے۔ اس نے Luo کے رواجوں کے متعلق بتایا: کہ کیسے بزرگوں کو زبردست احترام حاصل تھا اور کیسے وہ بڑے بڑے تنے والے درختوں تلے بیٹھ کر قواعد وضوابط طے کیا کرتے تھے۔ اس نے ہمیں کینیا کی جدوجہد آزادی کے متعلق بھی بتایا...... کہ کیسے انگریز وہیں ٹھہرنا اور لوگوں پر غیر منصفانہ انداز میں حکومت کرنا چاہتے تھے، جیسے انہوں نے امریکہ میں بھی کیا تھا؛ ان میں سے کتنے لوگ صرف اپنی جلد کی رنگت کے باعث غلام بنا لیے گئے، جیسے امریکہ میں بھی بنائے گئے؛ لیکن اہل کینیا کمرے میں موجود تمام لوگوں کی طرح آزاد ہونا اور

محنت وقربانی کے ذریعے ترقی کرنا چاہتے تھے۔

جب اس نے بات مکمل کی تو مس ہیفٹی کا چہرہ فخر سے دمک رہا تھا۔ میرے تمام ہم جماعتوں نے دل کھول کر تالیاں بجائیں اور چند ایک نے تو ہمت کر کے سوالات بھی پوچھے۔ میرے باپ نے ہر سوال کا جواب دینے سے قبل اچھی طرح سوچا۔ لنچ کی گھنٹی بجی تو مسٹر ایلڈرج میرے پاس آیا۔

"تمہارا باپ کافی متاثر کن آدمی ہے۔"

آدم خوری کے متعلق پوچھنے والے ٹماٹر جیسے لڑکے نے کہا، "تمہارے ڈیڈ کافی اچھے ہیں۔"

اور ایک طرف ہو کر میں نے کوریٹا کو دیکھا جو میرے باپ کو خدا حافظ کہہ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ اور سادہ سی تسکین دکھائی دیتی تھی۔

دو ہفتے بعد وہ چلا گیا۔ اس دوران ہم نے کرسمس ٹری کے سامنے کھڑے ہو کر تصاویر بنوائیں۔ ہمارے پاس اکٹھے ہونے کی بس یہی تصاویر ہیں۔ میں نے باپ کی طرف سے تحفے میں ملنے والا نارنجی رنگ کا ایک باسکٹ بال پکڑ رکھا ہے، وہ میری دی ہوئی ٹائی لگائے کھڑا ہے ("آہ لوگ مجھے یہ ٹائی لگائے دیکھ کر بہت اہم ہستی سمجھیں گے")۔ Dave Brubeck کے ایک کنسرٹ میں مجھے اس کے پہلو میں آڈیٹوریم کی تاریکی میں آرام سے بیٹھنے کی شدید کوشش کرنا پڑی کیونکہ اداکاروں کی ٹوٹی پھوٹی لائنیں سمجھ نہیں آ رہی تھیں۔ جونہی باپ تالیاں بجاتا میں بھی بجانے لگتا۔ دن کے وقت تھوڑی سی دیر کے لیے میں اس کے ساتھ لیٹتا۔ ہم دونوں عارضی کرائے پر لیے گئے اپارٹمنٹ میں اکیلے ہوتے جہاں رضائیوں اور ہاتھ سے بنی ہوئی گدیوں کی بہتات تھی۔ ہم دونوں اپنی اپنی کتاب پڑھتے۔ وہ میرے لیے بدستور شفاف ہستی تھی؛ جب میں اس کے انداز واطوار یا بولنے کے انداز کی نقالی کرتا تو اس کے اصل ماخذ اور نہ ہی نتائج کا علم ہوتا؛ میں نہیں دیکھ سکتا تھا کہ اتنے طویل عرصے میں وہ کیسے اثر انداز ہوتے ہیں۔ لیکن میں اس کی صحبت کا عادی ہو گیا۔

روانگی کے دن جب میری ماں اور میں نے اسے پیکنگ میں مدد کی تو اس نے پینتالیس پینتالیس منٹ کے دو ریکارڈز نکالے۔

''باری! اِدھر دیکھو...... میں بھول گیا تھا کہ تمہارے لیے یہ لایا ہوں۔ یہ تمہارے براعظم کی آوازیں ہیں۔''

میرے نانا نانی کے پرانے سٹیریو کو سمجھنے میں اسے کافی دقت ہوئی، لیکن انجام کار ڈسک گھومنے لگی اور اس نے سوئی ریکارڈ پر رکھ دی۔ گٹار کی ہلکی سی آواز آئی، پھر بھونپو کی تیز آواز، ڈھولوں کی تھاپ، دوبارہ گٹار اور پھر کچھ آوازیں، واضح اور پرمسرت۔

میرے باپ نے کہا، '' آؤ، باری! تم استاد سے سیکھو گے۔'' اور اچانک اس کا دبلا پتلا جسم آگے پیچھے جھولنے لگا، کھنکتی ہوئی آواز ابھر رہی تھی، اس کے بازو یوں جھول رہے تھے جیسے غیرمرئی جال میں پھنسے ہوں؛ اس کے کولائی میں ہلتے ہوئے کولہے۔ تال تیز ہوگئی اور وہ آنکھیں بند کر کے مسرت میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے ایک آنکھ کھول کر مجھ پہ نظر ڈالی، اس کے شانت چہرے پر ایک بے وقوفانہ مسکان پھیل گئی، میری ماں مسکرائی اور نانا نانی دیکھنے آئے کہ یہ سارا شوروغل کیوں ہو رہا ہے۔ میں نے آنکھیں بند کر کے جھجکتے ہوئے اولین سٹیپ لیے؛ آوازیں میرے بازو کو جھلا رہی تھیں۔ اور میرے کانوں میں ابھی تک اس کی آواز ہے: اس نے اپنے حلق سے ایک تیز، چہکتی ہوئی چیخ جیسی آواز نکالی...... ایسی چیخ جو قہقہے کے لیے پکارتی ہے۔

چوتھا باب

میں کون ہوں؟

''اب میں ان فضول Punahou پارٹیوں میں نہیں جایا کروں گا۔''

''ہاں، تم نے پچھلی بار بھی یہی کہا تھا۔''

رے اور میں میز پہ بیٹھ کر اپنے ہیم برگر لفافوں سے نکالنے لگے۔ وہ مجھ سے دو سال بڑا اور سینئر تھا۔ اپنے باپ کی فوجی تبدیلی کے نتیجے میں وہ پچھلے سال لاس اینجلس سے آیا تھا۔ عمر میں فرق کے باوجود ہماری بہ آسانی دوستی ہوگئی، کیونکہ ہم دونوں اکیڈمی کی سیاہ فام آبادی کا تقریباً نصف تھے۔ میں اس کی صحبت کا لطف اٹھاتا۔ وہ ایک خاص قسم کی گرم جوشی اور حسِ مزاح رکھتا تھا جس کی بنیاد پر سابقہ .L.A کی زندگی میں اس کے مسلسل حوالے ملتے ہیں...... عورتوں کا ایک حلقہ جو غالباً اب بھی ہر رات اسے دور دراز سے کال کرتی ہیں۔ وہ عورتیں فٹ بال میں اس کی ماضی کی کامیابیوں کی مداح ہیں۔ اس کی بتائی ہوئی زیادہ تر باتوں پر مجھے یقین نہ آتا، لیکن کچھ باتوں پر آ بھی گیا۔ مثلاً یہ کہ وہ جزائر میں تیز رفتار ترین اتھلیٹس میں سے ایک تھا (کچھ کے مطابق اولمپک کے معیار کا) حالانکہ جب وہ بھاگتا تو پسینے سے بھیگی جرسی میں اس کا بڑا سا پیٹ تھل تھل کرتا اور مخالف ٹیم کے کھلاڑی بے یقینی کے عالم میں سر ہلاتے رہ جاتے۔ رے کے توسط سے ہی مجھے سیاہ فام پارٹیوں کے متعلق پتا چلا جو یونیورسٹی میں یا باہر فوجی اڈوں میں منعقد ہوتی تھیں۔ اس کی بدولت مجھے شناسائی پیدا کرنے میں زیادہ مشکل نہ ہوئی۔ واپسی پر میرے تاثرات سن کر وہ جھنجلا جاتا تھا۔

اب وہ مجھ سے کہہ رہا تھا: ''اس مرتبہ میں واقعی جانا چاہتا تھا۔ یہ لڑکیاں اے ون، USDA

سے سند یافتہ نسل پرست ہیں۔ سب کی سب۔ گوری لڑکیاں۔ ایشیائی لڑکیاں ...... گولی ماردینی چاہیے۔ یہ ایشیائی تو گوریوں سے بھی بدتر ہیں۔ سمجھتی ہیں کہ ہمیں کوئی مرض وغیرہ لگا ہے۔"

"ہوسکتا ہے کہ وہ تمہارے بڑے بڑے کولہوں کو دیکھ رہی ہوں۔ یار، میں سمجھا کہ تم زیر تربیت ہو۔"

"چھوڑ دمیری فرائیز۔ تم میری کتیا نہیں ہو، نیگرو کہیں گے، اپنی فرائیز خود خریدو۔ میں کیا کہہ رہا تھا؟"

"کوئی لڑکی صرف اس لیے نسل پرست نہیں ہوسکتی کہ وہ تمہارے ساتھ ڈیٹ پر نہیں جاتی۔"

"زیادہ ہوشیار مت بنو، سمجھے؟ میں کسی ایک موقعے کی بات نہیں کررہا۔ دیکھو، میں نے مونیکا سے کہا کہ چلو، اس نے انکار کیا، میں نے کہا ٹھیک ہے..... تم اتنی بھی گرم نہیں ہو۔" رے نے رک کر میرا ردعمل چیک کیا اور مسکرایا۔ "ٹھیک ہے، میں نے حقیقت میں یہ سب نہیں کہا ہوگا۔ میں نے مونیکا کو بس اوکے کہا، اور ہم اس کے باوجود قریب رہے۔ پتا ہے پھر کیا ہوا؟ وہ بغیر گردن والے سٹیو کے ساتھ پھنس گئی۔ وہ دونوں ہر وقت ہاتھ پکڑے پھرتے ہیں، جیسا لو برڈز کا جوڑا...... ٹھیک ہے جی۔ میرا خیال ہے کہ سمندر میں مچھلیاں ختم ہوگئی ہیں۔ میں نے جا کر پامیلا سے باہر چلنے کو کہا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ ڈانس کرنے جارہی ہے۔ میں نے کہا، بہت اچھے۔ ڈانس میں پہنچے تو پتا ہے وہاں کون تھا۔ اس نے رک کک کو اپنی بانہوں میں لے رکھا تھا۔ 'ہائے رے،' وہ بولی، کہ جیسے وہ صورت حال سے بے خبر ہو رک کک! اب تم تو جانتے ہو کہ وہ لڑکا کتنا فضول ہے۔ اس مادر.....کا میرے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں، ٹھیک ہے نا؟ بالکل نہیں۔"

اس نے مٹھی بھر فرائیز اپنے منہ میں ٹھونس لیں۔ بس ایک میں ہی ایسا نہیں ہوں ویسے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم بھی اس معاملے میں اچھے نہیں جارہے۔"

کیونکہ میں شرمیلا ہوں، میں نے دل میں سوچا؛ لیکن میں اس کے سامنے کبھی یہ تسلیم نہیں کروں گا۔ رے نے اس بات سے فائدہ اٹھایا۔

تو اس وقت کیا ہوتا ہے جب کچھ سسٹرز کے ساتھ پارٹی کرنے جاتے ہیں، ہوں؟ کیا ہوتا ہے؟ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ کیا ہوتا ہے۔ Blam!۔ وہ ہمارے اوپر یوں ٹوٹ پڑتی ہیں جیسے کل آنی ہی نہ ہو۔ ہائی سکول کے چوزے، یونیورسٹی کے چوزے --- اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ

بہت مزے کی حرکات کرتی اور ہنستی ہیں۔ 'یقیناً تم میرا نمبر لے سکتے ہو، بے بی۔' شرط لگالو۔"

"اچھا....."

"کیا اچھا؟ سنو! تم باسکٹ بال ٹیم میں زیادہ وقت کیوں نہیں دیتے، ہوں؟ کم از کم تم سے آگے والے دو لڑکے تو بیکار ہیں، اور تم جانتے ہو، وہ بھی جانتے ہیں۔ میں نے کھیل کے میدان میں تمہیں ان کے چیتھڑے اڑاتے دیکھا تھا۔ کوئی جوڑ ہی نہیں ان کا تمہارے ساتھ۔ میں اس سیزن میں فٹ بال سکواڈ میں کیوں نہ شامل ہوجاؤں، اس سے کچھ نہیں ہوتا کہ آپ دوسرے ساتھی کے کتنے پاس ضائع کرتے ہیں؟ مجھے بتاؤ۔ اگر ہم گورے ہوتے تو کیا ہمارے ساتھ مختلف سلوک نہ ہوتا۔ یا جاپانی، یا ہوائی کے، یا بدبخت اسکیمو۔"

"میں یہ نہیں کہہ رہا۔"

"تو کیا کہہ رہے ہو پھر۔"

"ٹھیک ہے۔ میں بتاتا ہوں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ میں کہہ رہا ہوں کہ آس پاس کوئی سیاہ فام لڑکیاں دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے ڈیٹ پر جانا مشکل ہوتا جارہا ہے۔ لیکن اس وجہ سے یہاں موجود تمام لڑکیوں کو نسل پرست قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے ڈیڈی یا بھائی وغیرہ سے ملتے جلتے کسی شخص کی تلاش میں ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ چاہے میں ٹیم میں کچھ لڑکوں سے بہتر ہی ہوں گا، لیکن وہ گورے لڑکوں کی طرح کھیلتے ہیں اور کوچ بھی اسی انداز کو پسند کرتا ہے، اور وہ اس طریقے سے کھیل کر جیتتے ہیں۔ میں اس انداز میں نہیں کھیلتا۔

"میرے خیال میں کوچ شاید تمہیں سیاہ فام ہونے کی وجہ سے پسند نہ کرتے ہوں، لیکن تم ڈھیر ساری فرائیز کھانا تو بند کرسکتے ہو جن کی وجہ سے چھ ماہ کی حاملہ جیسے لگتے ہو۔ میں یہ کہہ رہا ہوں۔"

رے اٹھا اور لفافے وغیرہ لپیٹ کر پھینکتے ہوئے بولا: "یار! سمجھ نہیں آتی کہ تم ان لوگوں کی صفائی کیوں پیش کرتے ہو۔ آؤ چلیں۔ تمہاری بکواس میری سمجھ سے باہر ہے۔"

رے نے درست کہا تھا؛ چیزیں بہت پیچیدہ ہوگئی تھیں۔ میرے باپ کو واپس گئے پانچ سال گزر چکے تھے اور کم از کم ظاہری سطح پر یہ معمول کے فسادات اور جلوسوں والا ہی ایک دور تھا -- خراب نمبر اور پرنسپل کے دفتر میں بلایا جانا، برگر شاپس پر جز وقتی نوکریاں، ڈرائیونگ ٹیسٹ اور

شدید خواہش۔ میں نے سکول میں اپنے حصے کے دوست حاصل کر لیے تھے، اکا دکا بے ڈھنگ قسم کی ڈیٹس پر بھی گیا۔ میرے کچھ کلاس فیلوز کا رتبہ اپنے جسموں یا کاروں کی بنیاد پر گھٹتا یا بڑھتا تھا۔ اس سارے اتار چڑھاؤ کے درمیان مجھے یہ دیکھ کر تسلی تھی کہ میری اپنی حالت متواتر اچھی ہوتی جا رہی تھی۔ شاذ و نادر میں ایسے بچوں سے ملتا جن کے اہل خانہ میرے خاندان سے کمتر ہوں اور مجھے اچھے مقدر کی یاد آ سکے۔

ماں نے مجھے یاد ا نے کی سر توڑ کوشش کی۔ وہ لولو سے الگ ہو گئی تھی اور ہوائی واپسی کے کچھ ہی عرصہ بعد اینتھر وپولوجی میں ماسٹرز ڈگری میں داخلہ لے لیا۔ تین سال تک میں اس کے اور مایا کے ساتھ Punajou سے پرے ایک بلاک کے چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں رہا، میری ماں کی سٹوڈنٹ گرانٹ ہم تینوں کا پیٹ پال رہی تھی۔ کبھی کبھی جب میں سکول کے بعد اپنے دوستوں کو گھر لاتا تو میری ماں گزرتے گزرتے فریج میں کھانے پینے کی کم اشیا یا سجاوٹی چیزوں کی کمی کے متعلق ان کے تاثرات سن لیتی۔ وہ مجھے ایک طرف بلاتی اور بتاتی کہ وہ ایک طلاق یافتہ ماں ہے، سکول میں پڑھتی ہے اور دو بچوں کا پیٹ پال رہی ہے، لہٰذا کُکیز بیک کرنا اس کی اولین ترجیح نہیں تھی، اور اگرچہ وہ Punahou میں میری تعلیم کو سراہتی تھی مگر میری یا کسی اور کی جانب سے نخروں کو ہرگز برداشت نہیں کرے گی۔ سمجھ میں آیا؟

میری سمجھ میں آ گیا۔ گاہے بگاہے میرے خود مختاری کے دعووں کے باوجود ہم دونوں قریب رہے، اور میں نے ہر ممکن حوالے سے اس کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کی۔ میں دکان سے سامان خریدنے جاتا، کپڑے دھوتا، اپنی کالی آنکھوں والی بہن مایا کی دیکھ بھال کرتا۔ لیکن جب میری ماں اپنا فیلڈ ورک کرنے کے لیے انڈونیشیا جانے کو تیار تھی، اور اس نے کہا کہ میں اور مایا بھی وہاں انٹرنیشنل سکول میں داخلہ لینے اس کے ساتھ چلیں تو میں نے فوراً انکار کر دیا۔ مجھے شک تھا کہ اب انڈونیشیا میں میرے لیے کچھ نہیں تھا اور وہاں جا کر نئے سرے سے جان پہچان بنانا پسند نہ آیا۔ نیز یہ ہے کہ میں نے اپنے نانا نانی کے ساتھ ایک خاموش معاہدہ کر لیا تھا: میں ان کے ساتھ رہ سکتا ہوں اور وہ اتنی دیر تک مجھے نہیں چھیڑیں گے جب تک میں ان کے لیے کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کرتا۔ یہ سمجھوتہ میرے مقصد کے مطابق تھا، ایسا مقصد جو میں بمشکل ہی خود کو بیان کر سکتا تھا۔ اپنی ماں اور نانا نانی سے دور میں دیوانہ وار ایک داخلی جدوجہد میں مصروف تھا۔ میں امریکہ میں خود کو ایک سیاہ

فام شخص کی حیثیت میں سرفراز کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنی شکل و صورت کو چھوڑ کر آس پاس کا کوئی بھی شخص اس بات کا مفہوم نہیں سمجھتا تھا۔

میرے باپ کے خطوط نے کچھ اشارے فراہم کیے۔ کبھی کبھار آتے...... ایک نیلا صفحہ۔ وہ اطلاع دیتا کہ سب بخیریت ہیں، مجھے سکول میں اچھی کارکردگی دکھانے کی تلقین کرتا اور کہتا کہ میں مایا اور میری ماں جب چاہیں اس کے پاس آ کر اپنا بجا مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ گاہے بگاہے تمثیلی انداز میں نصیحت بھی کرتا جن کی مجھے سمجھ نہ آتی (جیسے، ''پانی کی سطح ابھر رہی ہے، تم موزوں کیریئر تک پہنچو گے۔'') میں فوراً کھلی لائنوں والے صفحے پر جواب دیتا اور اس کے خط الماری میں سنبھال دیتا، میری ماں کی رکھی ہوئی اس کی تصاویر کے ساتھ۔

گرامپس کے متعدد سیاہ فام دوست تھے (زیادہ تر پوکر اور برج کھیلنے والے ساتھی) اور اس کے احساسات کو سمجھ پانے کی عمر میں پہنچنے سے پہلے میں بھی گھسٹتا ہوا اس کے ہمراہ جاتا۔ وہ بوڑھے، صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس، کھ دری آواز اور سگار کی مہک والے لوگ تھے...... ایسے لوگ جن کا سب کچھ طے شدہ ہو اور جنہوں نے اتنا کچھ دیکھ رکھا ہو کہ اب اس بارے میں بات کرنا وقت کا ضیاع سمجھتے ہوں۔ وہ ہمیشہ مجھے ملنے پر میری کمر پہ تھپکی دیتے اور پوچھتے کہ میری ماں کا کیا حال ہے؛ لیکن کھیل کا آغاز ہوتے ہی وہ چالوں کے سوا اور کسی چیز پر بات نہ کرتے۔

ایک شخص ذرا مختلف تھا...... فرینک نامی شاعر جو Waikiki کے ایک خستہ حال مکان میں رہتا تھا۔ ایک دور میں وہ کچھ بدنام ہوا، شکاگو میں رچرڈ رائٹ اور لانگسٹن ہیوز کا ہم عصر رہ چکا تھا...... گرامپس نے ایک مرتبہ مجھے اس کی جمع کردہ نظموں کی ایک کتاب دکھائی۔ لیکن جب میں فرینک سے ملا تو وہ 80 سال کا ہو چکا ہوگا۔ بڑا سا چہرہ اور بکھری ہوئی ڈاڑھی جس کی وجہ سے وہ بوڑھا اور بدحال شیر لگتا تھا۔ وہ جب بھی ہمارے گھر کچھ دیر کے لیے آتا تو ہمیں اپنی شاعری سناتا، گرامپس کے ساتھ وہسکی پیتا۔ رات گہری ہونے پر وہ دونوں گندے برتن اٹھانے میں میری مدد مانگتے۔ آخر کار گفتگو عورتوں کے متعلق مرثیہ خوانی کی صورت اختیار کر جاتی۔

فرینک نے مجھے متین انداز میں بتایا: ''یار! وہ آپ کو شراب نوشی پر مجبور کر دیتی ہیں۔ اور آپ انہیں اجازت دیں تو قبر میں پہنچا دیں گی۔''

مجھے بوڑھے فرینک میں دلچسپی ہوئی...... اس کی کتابیں، وہسکی سے لبریز سانس، اور اپنے ا

والی آنکھوں میں حاصل کردہ علم کا ذخیرہ۔ البتہ اس کے گھر جانے پر میں ہمیشہ عجیب طرح کی بے چینی محسوس کرتا، کہ جیسے میں دو آدمیوں کے درمیان ایک پیچیدہ، اَن کہا سودا ہوتے دیکھ رہا ہوں جس کی مجھے سمجھ نہ ہو۔ اس وقت بھی یہی محسوس ہوتا جب کبھی گرامپس مجھے ہونولولو کے بازارِ حسن میں اپنی ایک پسندیدہ بار میں لے کر جاتا۔

"اپنی نانی کو مت بتانا،" وہ [illegible] اور نرم کرخت چہروں، نرم جسموں والی فاحشاؤں کے درمیان سے گزر کر ایک چھوٹی سی تاریک بار میں پہنچتے جہاں دو تین پول ٹیبلز رکھے ہوتے۔ کوئی بھی شخص اس بات پر چیں بہ جبیں نہیں لاتا تھا کہ گرامپس وہاں واحد اکیلا گورا تھا، یا یہ کہ میں ایک گیارہ بارہ سال کا تھا۔ بار کے اوپر بیٹھے ہوئے کچھ ایک مرد ہماری طرف ہاتھ ہلاتے، [illegible] لے کر آتے۔ اگر جیوک باکس ٹیبلز پر اور کوئی نہ کھیل رہا ہوتا تو [illegible] سکھاتا، لیکن عموماً میں بار پر بیٹھ کر ٹانگیں ہلاتا، اپنے ڈرنک میں بلبلے بناتا اور دیواروں پر [illegible] تصاویر دیکھتا رہتا۔ ہیٹ والا روڈنی نامی ایک آدمی اگر قریب ہی ہوتا تو حال چال پوچھنے ضرور آ جاتا۔

"[illegible]، حال کیسا جا رہا ہے؟"

"بالکل ٹھیک۔"

"تم اسے [illegible] رہے ہو نا؟"

"[illegible] مضامین میں۔"

"بہت اچھا۔ سیلی، میرے دوست کو ایک اور کوک دو،" روڈنی یہ کہتے ہوئے اپنی جیب میں سے نوٹ نکالتا اور پھر واپس تاریکیوں میں گم ہو جاتا۔

ان شاموں کے دوران محسوس ہونے والا جوش مجھے اب بھی یاد ہے -- تاریکی کی رازداری اور گیند کی آواز، اور جیوک باکس کی جلتی بجھتی ہوئی سرخ و سبز لائٹیں، اور کمرے میں ناچتا ہوا تھکن زدہ قہقہہ۔ اس کمسنی میں بھی میں محسوس کرنے لگا تھا کہ بار میں آئے ہوئے لوگ اپنی مرضی سے وہاں موجود نہیں تھے، کہ میرا نانا وہاں کچھ لوگوں سے ملنا چاہتا تھا جو اسے اپنے مصائب کو بھولنے میں مدد دے سکتے، ایسے لوگ جو اس کے خیال میں اس پر کوئی حتمی رائے نہ دیتے۔ شاید بار نے اسے واقعی اپنی یادیں فراموش کرنے میں مدد دی ہو، لیکن میں بچوں والی سمجھ بوجھ کی بدولت جانتا

تھا کہ اس کی رائے درست نہیں۔ وہاں ہماری موجودگی کو شدت سے محسوس کیا جاتا، اور جونیئر سکول میں پہنچنے پر میں نے بہانے بنانا سیکھ لیا۔ مجھے جو کچھ بھی چاہیے تھا وہ کسی اور ذریعے سے ملتا تھا۔

ٹی وی، مووِیز، ریڈیو؛ یہ آغاز کرنے کی جگہیں تھیں۔ پاپ کلچر کے اپنے مخصوص رنگ تھے شبیہوں کی ایک گزرگاہ جس میں سے آپ بمشکل ایک دو باتیں، ایک دو قدم آگے بڑھاتے تھے۔ میں مارون گیے کی طرح گنگنا نہیں سکتا تھا، لیکن Soul Train پر ڈانس کے تمام سٹیپس کرنے کے قابل تھا۔ میں شافٹ یا سپر فلائی کی طرح ایک گن پیک نہیں کر سکتا تھا، لیکن یقیناً رچرڈ پرائیور کی طرح بددعا دے سکتا تھا۔

اور میں بڑے ذوق و شوق کے ساتھ باسکٹ بال کھیل سکتا تھا، حتیٰ کہ اپنے محدود ٹیلنٹ سے بھی بڑھ کر۔ باپ کی طرف سے کرسمس پر تحفہ ایسے وقت میں ملا تھا جب ہوائی یونیورسٹی کی باسکٹ بال ٹیم تمام سیاہ فام کھلاڑیوں کی بدولت قومی سطح پر شمار ہونے لگی تھی۔ اسی موسم بہار میں گرامپس مجھے ان کا ایک میچ دکھانے لے گیا۔ میں نے کھلاڑیوں کو وارم اپ ہوتے دیکھا۔ وہ ابھی بچے ہی تھے، لیکن اعتماد سے بھرپور جنگجو، کسی لطیفے پر ہنسی مذاق کرتے ہوئے، سائیڈ لائن پر کھڑی لڑکیوں کو کن اکھیوں سے دیکھتے ہوئے۔ آخر کار سیٹی بجی اور کھلاڑی ایک غضب ناک لڑائی میں مصروف ہو گئے۔

میں نے بھی اس دنیا کا حصہ بننے کا فیصلہ کیا اور سکول سے چھٹی کے بعد نانا نانی کے اپارٹمنٹ کے قریب ایک پلے گراؤنڈ میں جانے لگا۔ دسویں منزل پر اپنے بیڈروم کی کھڑکی میں کھڑی توت مجھے کورٹ میں کھیلتے دیکھتی رہتی۔ آخر کار اندھیرا چھا جانے پر میں گھنٹوں تک اکیلا پریکٹس کرتا رہتا۔ ہائی سکول میں پہنچنے پر میں Punahou کی ٹیموں میں کھیل رہا تھا، اور یونیورسٹی کورٹس میں جا سکتا تھا جہاں مٹھی بھر سیاہ فام لڑکوں نے مجھے ایک رویہ سکھایا جس کا تعلق صرف کھیل کے ساتھ نہیں تھا۔ اس احترام کی بنیاد اس بات پر تھی کہ آپ نے کیا کیا، نہ کہ اس پر کہ آپ کا باپ کون تھا۔ آپ ایسی باتیں کرنا آنا چاہیے تھا جس پر مخالف کھلاڑی بھڑک اٹھتا، لیکن اگر آپ ان باتوں کی تائید اپنے کھیل کے ذریعے نہ کر پاتے تو جہنم کا دروازہ کھل جاتا۔ آپ کے لیے ضروری تھا کہ کسی کو اپنے جذبات کا اندازہ نہ لگانے دیں۔

اس کے علاوہ ایک اور چیز بھی، جس کے متعلق کوئی بھی بات نہیں کرتا تھا: شدید صورتِ حال

میں متحد رہنا، بہترین کھلاڑیوں کا پوائنٹس لینے کے متعلق پریشان ہونا چھوڑنا اور خراب ترین کھلاڑیوں کا سامنے آنا۔ اس صورت حال میں صرف سکور کی اہمیت تھی، کیونکہ اسی کی بدولت آپ قائم رہ سکتے تھے۔ اگر آپ کوئی غلط پاس دیتے یا غیر ضروری چال چلتے تو ساتھی آپ کو یوں مسکرا کر دیکھتا جیسے کہہ رہا ہو، "لعنت ہے......"

اب میری بیوی یہ سن کر آسمان کی طرف دیکھنے لگتی ہے۔ اس کا بھائی بچپن سے ہی باسکٹ بال کا مشہور کھلاڑی ہے، اور جب وہ مجھے یا اپنے بھائی کو طیش دلانا چاہتی ہو تو کہتی ہے کہ اس کا بیٹا باجا بجانا سیکھے گا۔ یقیناً وہ ٹھیک کہتی ہے؛ میں ایک سیاہ فام نوجوان کا جیتا جاگتا کارٹون تھا۔ تاہم، ایک وقت آیا جب [illegible] سے توقع نہیں کی جاتی تھی کہ وہ اپنے باپ کے نقش قدم پر چلیں گے۔ میرے اور آس پاس کے زیادہ تر نوجوانوں میں مرکزی فرق مجھے دستیاب آپشنز کی تعداد میں مضمر تھا۔ ہم میں سے [illegible] ایک بار [illegible] منتخب کرتا، غیر قطعی پن کے خلاف ایک ڈھال۔ کم از کم باسکٹ بال کورٹ میں میں [illegible] پر مشتمل ایک برادری کا لطف اٹھا سکتا تھا، اور داخلی زندگی بھی صحیح سالم رہتی۔ باسکٹ بال کورٹ میں ہی میں نے قریب ترین سفید فام دوست بنائے۔ کورٹ میں کالی رنگت نقصان دہ نہیں تھی۔ وہیں پر میری ملاقات رے اور دیگر ہم عمر سیاہ فام لوگوں سے ہوئی جن کے [illegible] اور تذبذب نے میرے اندر بھی یہ چیزیں پیدا کیں۔

ایسے بیٹھے ہونے کے دوران ان میں سے کوئی کہتا، "گورے تمہارے ساتھ ہمیشہ ایسا ہی کریں گے۔" [illegible] کرتے اور اپنے سر ہلاتے، جبکہ میرا ذہن ماضی کے صفحات کھنگالنے لگتا:

ساتویں کلاس میں پہلی مرتبہ کسی لڑکے نے مجھے coon کہا؛ جب میں نے اس کی ناک پر گھونسا مارا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ٹینس کا ایک کھلاڑی جس نے مجھے ایک ٹورنامنٹ کے دوران بتایا کہ میں بلیٹن بورڈ پر لگے میچوں کے شیڈول کو نہ چھوؤں کیونکہ ان کی سیاہی اتر جائے گی؛ اس کے سرخ چہرے اور پتلے ہونٹوں پر مسکراہٹ ناچنے لگی۔ جب میں نے شکایت کرنے کی دھمکی دی تو وہ بولا: "تم مذاق بھی نہیں سمجھتے؟" نانا نانی کے اپارٹمنٹ والی عمارت میں ایک بوڑھی عورت جو مجھے لفٹ میں اپنے پیچھے داخل ہوتے دیکھ کر غصے میں آگئی اور مینیجر کو بتانے بھاگی کہ میں اس کا تعاقب کر رہا ہوں۔ جب اسے بتایا گیا کہ میں اس عمارت میں ہی رہتا ہوں تو اس نے معذرت سے انکار کر دیا۔ نیویارک سے تعلق رکھنے والے ایک نوجوان اسسٹنٹ باسکٹ بال کوچ نے کچھ

باتونی کالوں کے ساتھ گفتگو کی اور بعد میں مَیں نے اسے اور اپنے تین ساتھیوں کو کہتے سنا کہ انہیں نیگروؤں کے ٹولے سے میچ نہیں ہارنا چاہیے تھا۔ جب میں نے اس سے شکایت کی تو وہ مجھ پر ہی غصہ ہونے لگا۔ پھر اس نے دھیمے لہجے میں سمجھانے کی کوشش کی کہ "کچھ کالے لوگ ہوتے ہیں اور کچھ نیگرو۔ وہ لڑکے نیگرو ہیں۔" (میں نے جواب میں اسے کہا، "یقیناً، کچھ گورے ہیں اور کچھ تمہارے جیسے مادر.... گورے بھی ہیں۔")

گورے تمہارے ساتھ ہمیشہ ایسا ہی کریں گے۔ اس میں محض ظلم ملوث نہیں تھا؛ میں سیکھ رہا تھا کہ سیاہ فام لوگ بھی کمینے ہو سکتے تھے۔ بظاہر ہوش مند نظر آنے والے لوگوں کے مخصوص تکبر اور ہٹ دھرمی نے ہی ہمارے اندر قہقہے کو تحریک دلائی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے گوروں کو اپنے ظالم ہونے کا علم ہی نہ ہو۔ یا کم از کم وہ آپ کو اپنی تضحیک کا مستحق ضرور سمجھتے تھے۔

گورے لوگ۔ اول تو یہ الفاظ ادا کرنا ہی میرے لیے غیر [illegible] بخش تھا؛ مجھے لگتا کہ کوئی غیر ملکی شخص ایک مشکل جملہ بولنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کبھی کبھی میں [illegible] کے ساتھ گوروں کے متعلق گفتگو کر رہا ہوتا تو اچانک ماں کی مسکراہٹ یاد آجاتی اور اپنے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ بے ڈھنگ اور جھوٹے لگنے لگتے۔ یا پھر میں [illegible] کے بعد [illegible] میں مدد دے رہا ہوتا تو توت اندر آ کر بتاتی کہ وہ سونے جا رہی ہے۔ تب "گورے لوگ" کے وہی الفاظ کسی شوخ نیون سائن کی طرح میرے دماغ میں جھپک پڑتے اور میں اچانک خاموش ہو جاتا، کہ جیسے کوئی راز افشا ہونے سے بچانا چاہتا ہوں۔

بعد میں اکیلے بیٹھ کر میں ان مشکل سوچوں سے جان چھڑانے کی کوشش کرتا۔ یقیناً کچھ گوروں کو ہماری بداعتمادی کی عمومی کیٹگری سے باہر رکھا جا سکتا تھا۔ رے ہمیشہ مجھے بتاتا تھا کہ میرے نانا نانی کتنے اچھے تھے۔ میں نے اس کی اصطلاحات میں مضمر خطرے کو شناخت کیا۔ اپنے باسکٹ بال کوچ جیسے خیالات کی کھائی میں جا گرنا کتنا آسان تھا۔ رے نے مجھے یقین دلایا کہ ہم کبھی بھی گوروں کے متعلق بطور گورے تب تک بات نہیں کریں گے جب تک اس امر سے اچھی طرح آگاہ نہ ہوں۔ جانے بغیر اس قسم کی گفتگو کی قیمت ادا کرنا پڑ سکتی تھی۔

لیکن کیا یہ بات درست تھی؟ کیا اب بھی کوئی قیمت ادا کرنا باقی تھی؟ یہ پہلو پیچیدہ تھا جس پر میرا اور رے کا کبھی اتفاق نہیں ہو سکتا تھا۔ کبھی کبھی ایسے مواقع بھی آتے جب میں اسے اس

اینجلس کی گلیوں میں ملنے والی کسی گوری لڑکی سے بات کرتے یا کسی مشتاق نوجوان استاد سے نسل پرستی کے دکھوں کی وضاحت کرتے سنتا۔ مجھے یقین تھا کہ متین جملوں کے نیچے رے مجھ پر دانت نکال رہا تھا، کہ اس نے مجھے پیچھے چھوڑ دیا۔ وہ مجھے بتانا چاہتا تھا کہ گوری دنیا پر ہمارے طیش کو کسی مقصد، کسی غیر جانب دارانہ توثیق کی ضرورت نہیں۔ ہم جب چاہتے اسے آن اور آف کر سکتے تھے۔ کبھی کبھی اس کی اسی کارروائی کے بعد میں اس کے خلوص پر نہیں تو رائے پر ضرور سوال اٹھاتا۔ میں اسے یاد دلاتا کہ ہم Jim Crow والے جنوبی علاقے میں نہیں رہ رہے تھے۔ ہمیں ہارلیم میں کوئی گھٹیا تعمیراتی کام نہیں سونپا گیا تھا۔ ہم اس بدبخت ہوائی میں رہتے تھے۔ ہم جو چاہتے کہہ دیتے، جہاں چاہتے کھانا کھاتے، عام بسوں کی فرنٹ سیٹ پہ بیٹھ کر سفر کرتے تھے۔ ہمارے گورے دوستوں میں سے کوئی بھی ہمارے ساتھ امتیازی سلوک نہیں کرتا تھا۔ وہ ہم سے اور ہم ان سے محبت کرتے تھے۔ ان میں سے کم از کم آدھے تو خود بھی سیاہ فام یا کم از کم ڈاکٹر کنگ ضرور بننا چاہتے تھے۔

ہاں، یہ بات درست ہے، رے میری بات سے اتفاق کرتا۔

شاید ہم موٹے چوتڑوں والے نیگرو پوز کو ایک طرف کر سکتے تھے۔ ضرورت پڑنے تک سنبھال کر رکھ دیتے۔

رے نفی میں سر ہلا دیتا۔

اور مجھے پتا چلا کہ رے نے اپنا ٹرمپ کارڈ پھینک دیا تھا جو وہ شاید ہی کبھی پھینکتا۔ آخر میں مختلف تھا، اور ممکنہ طور پر مشکوک بھی۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں خود کون ہوں۔ کسی صورت حال سے بچنے کی خاطر میں فوراً پناہ گاہ میں جا چھپتا۔

شاید اگر ہم نیویارک یا لاس اینجلس میں رہ رہے ہوتے تو میں اس اونچے داؤ والے کھیل کے اصول جلدی سیکھ لیتا۔ ہوا یوں کہ میں نے اپنی کالی اور سفید دنیا میں جانا اور باہر آنا سیکھ لیا۔ میں جان گیا کہ ہر ایک دنیا کی اپنی اپنی زبان، دستور اور مفہوم تھے؛ کہ تھوڑی بہت ترجمانی کرنے کے ذریعے میں دونوں دنیاؤں کو ہم آہنگ بنا سکتا تھا۔ پھر بھی کچھ ٹھیک نہ ہونے کا احساس میرے اندر ٹھہرا رہا؛ کسی گفتگو کے دوران جب بھی کوئی لڑکی کہتی کہ وہ Stevie Wonder کو کس قدر پسند کرتی ہے؛ یا جب سپر مارکیٹ میں کوئی عورت پوچھتی کہ کیا میں باسکٹ بال کھیلتا ہوں؛ یا جب

سکول کا پرنسپل بتاتا کہ میں کتنا اچھا ہوں...... تو ہمیشہ میرے اندر ایک انتباہ پیدا ہوتا۔ میں تمام موقعوں پر پرسکون رہنے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ اس قسم کی تمام آرا مجھے ہمیشہ ایک کنارے پر کیوں پہنچا دیتی تھیں؟ کہیں نہ کہیں کوئی جادوگری موجود تھی...... البتہ یہ سمجھ نہ آتا کہ جادوگری کون اور کس کے ساتھ کر رہا ہے۔

موسم بہار کی ایک صبح کورے اور میں کلاس کے بعد ملے اور Punahou کیمپس میں برگد کے درخت کے گرد لگے پتھر کے بنچ کی طرف چلنے لگے۔ اسے سینئر بنچ کہتے تھے، لیکن سکول کے لڑکے عموماً یہاں موج میلے کے لیے اکٹھے ہوتے تھے۔ کرٹ نامی ایک سینئر وہاں موجود تھا، اور وہ ہمیں دیکھتے ہی پکارنے لگا۔

''او، رے۔ کیسے ہو یار۔ کیا ہو رہا ہے؟''

رے اس کے پاس گیا اور کرٹ کے آگے بڑھے ہوئے ہاتھ پر پنجا پھینکا۔ کرٹ نے میرے ساتھ بھی ایسا ہی کرنا چاہا، مگر میں نے منہ دوسری طرف کر لیا۔

میں نے کرٹ کو رے سے پوچھتے ہوئے سنا: ''اس کا کیا مسئلہ ہے؟'' چند منٹ بعد رے میرے پاس آیا اور وجہ پوچھی۔

''یار یہ لوگ ہمارا مذاق اڑاتے ہیں،'' میں نے کہا۔

''کیا کہہ رہے ہو تم؟''

''ان کے تمام جملے محض بکواس ہیں۔''

''تو تم اچانک اتنے حساس کیوں بن گئے؟ کرٹ کا مقصد ہمارا مذاق اڑانا نہیں تھا۔''

''اگر تم ایسا سوچتے ہو تو پھر۔۔۔۔''

رے کا چہرہ اچانک غصے سے دمک اٹھا۔ اس نے کہا، ''دیکھو! میں تمہارے ساتھ چل رہا ہوں، ٹھیک ہے نا؟ جیسے میں تمہیں اپنے ساتھ چلتے، اپنے استادوں سے ضرورت کے وقت بات کرتے دیکھتا ہوں۔ یہ ان کی دنیا ہے۔ سمجھے؟ وہ اس کے مالک ہیں اور ہم اس میں رہتے ہیں اس لیے یہ بکواس بند کر دو۔''

اگلے دن ہماری بحث کی کڑواہٹ زائل ہو گئی اور رے نے رائے دی کہ [illegible] دوستوں جیف اور سکاٹ کورے کے گھر پارٹی میں آنے کی دعوت دیں۔ میں [illegible] ہم بھی

گورے دوستوں کو سیاہ فاموں کی پارٹی میں نہیں لائے تھے۔۔لیکن رے نے اصرار کیا اور مجھے اعتراض کی کوئی موزوں وجہ نہ مل سکی۔ جیف یا کاٹ بھی انکار نہ کر پائے؛ انہوں نے آنے پر آمادگی ظاہر کی، بشرطیکہ میں ڈرائیو کروں۔ چنانچہ ہفتے کی رات کو اپنی گیمز ختم کرنے کے بعد ہم تینوں گرامپس کی پرانی فورڈ گریناڈا میں بیٹھے اور کوئی تیس میل دور واقع شوفیلڈ بیرکوں کی جانب روانہ ہو گئے۔

جب ہم پہنچے تو پارٹی زوروں پر تھی، اور ہم کھانے پینے کی چیزوں کی جانب بڑھے۔ لگتا تھا کہ جیف اور کاٹ کی موجودگی نے کوئی لہر پیدا نہیں کی۔ رے نے انہیں کمرے میں موجود تمام لوگوں سے متعارف کروایا، انہوں نے چند باتیں کیں اور دو لڑکیوں کو لے کر ڈانس فلور پر گئے۔ لیکن میں واضح طور پر دیکھ سکتا تھا کہ اس منظر نے میرے گورے دوستوں کو حیران کر دیا تھا۔ وہ مسکراتے رہے۔ وہ ایک کونے میں اکٹھے ہو گئے، موسیقی کی لے پر سر ہلاتے اور ہر چند منٹ بعد ''ایکسیوز می'' کہتے رہے۔ کوئی ایک گھنٹے بعد انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں انہیں گھر چھوڑ سکتا ہوں۔

جب میں رے کو اپنی روانگی کی اطلاع دینے گیا تو وہ اونچی آواز میں بولا، ''کیا مسئلہ ہے؟ ابھی تو محفل گرم ہونا شروع ہوئی ہے۔''

''میرے خیال میں انہیں مزہ نہیں آ رہا۔''

ہماری آنکھیں چار ہوئیں، ہم کچھ دیر ایسے ہی کھڑے رہے۔ شور اور قہقہوں کی آوازیں ہمارے گرد چکر کاٹ رہی تھیں۔ رے کی آنکھوں میں تسکین یا مایوسی کا کوئی شائبہ نہیں تھا؛ بس ایک گھورتی ہوئی نظر، سانپ جیسی۔ آخرکار اس نے ہاتھ بڑھایا اور میں نے نظریں بدستور ملائے ہوئے تھام لیا۔ اس نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا، ''بعد میں سہی۔'' اور میں نے اسے ہجوم میں جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ دوبارہ اسی لڑکی سے بات کرنے لگا جس کے ساتھ چند منٹ قبل کر رہا تھا۔

باہر فضا ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ گلی بالکل خالی تھی، ماسوائے رے کے سٹیریو کی مدھم ہوتی ہوئی آواز کے۔ بیس بال کے ایک میدان میں درختوں کے سائے دکھائی دے رہے تھے۔ کار میں بیٹھے تو جیف نے اپنا بازو میرے کندھے پر رکھا اور جیسے سکھ کا سانس لیتے ہوئے بولا: ''یار، پتا ہے! آج واقعی میں نے کچھ سیکھا ہے۔ اب میں جان گیا ہوں کہ کبھی کبھی سکول کی پارٹیوں میں تم اور رے واحد سیاہ فام لڑکے ہونے کی وجہ سے کیا محسوس کرتے ہو گے۔''

میں نے جواب دیا، ''ہاں، ٹھیک کہتے ہو۔'' ایک مرتبہ تو میرا دل چاہا کہ اس کے منہ پر گھونسا ماروں۔ ہم شہر کی جانب روانہ ہوئے اور خاموشی میں مجھے اس روز کرٹ کے ساتھ رے کی گفتگو اور پھر اپنے ساتھ بحث یاد آنے لگی۔ دوستوں کو ڈراپ کرنے تک میں دنیا کا ایک نیا نقشہ دیکھنے لگا تھا ...... سادگی میں خوفناک اور عملی لحاظ سے سانس گھونٹ دینے والا۔ رے نے مجھے بتایا تھا کہ ہم گوروں کی کورٹ میں، گوروں کے اصولوں کے مطابق کھیل رہے ہیں۔ اگر پرنسپل یا کوچ یا ٹیچر یا کرٹ ہمارے چہرے پر تھوکنا چاہتا تو ایسا کر سکتا تھا، کیونکہ اس کے پاس طاقت تھی اور ہمارے پاس نہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کرنے کا فیصلہ کرتا، اگر وہ آپ کو انسان سمجھتا یا آپ کے دفاع کو آتا تو اس کی وجہ اسے یہ علم ہونا تھی کہ جو الفاظ آپ بولتے، جو کپڑے پہنتے، جو کتابیں پڑھتے، اور جو عزائم اور خواہشات رکھتے ہیں ان کا وہ پہلے سے مالک تھا۔ وہ جو بھی فیصلہ کرتا، وہ اسی کا فیصلہ تھا، نہ کہ آپ کا۔ آپ کے اوپر اسے حاصل اس اساسی قدرت کے باعث ہی اچھے اور برے گوروں کے درمیان کوئی بھی امتیاز اس کے لیے بے [illegible] تھا۔ درحقیقت آپ اس بارے میں بھی پر یقین نہیں ہو سکتے تھے کہ آپ کی اختیار کردہ ہر چیز آپ نے [illegible] کا ایک بیان تھی [illegible] مزاح، [illegible] کمر کے پیچھے سے پاس دینا ...... اور آپ نے اپنی مرضی سے اس کا انتخاب کیا تھا۔ بہترین حالت میں یہ چیزیں ایک پناہ گاہ اور بدترین حالت میں ایک پھندا تھیں۔ اس پاگل کر دینے والی منطق پر عمل کرتے ہوئے آپ غضب ناکی کے بس چھوٹے سے چھوٹے حلقے میں ہی سمٹ سکتے تھے، یہاں تک کہ کالا پن آپ کی اپنی ناطاقتی اور شکست سے آگاہی بن کر رہ جاتا۔ اور ایک آخری مضحکہ خیز سوال: اگر آپ کو شکست سے انکار کرتے ہوئے اپنے صیادوں پر کوڑے برسانے چاہیں تو وہ اس کے لیے بھی ایک اصطلاح رکھتے ہیں، ایسی اصطلاح جو آپ کو دوبارہ پنجرے میں بند کر دے گی: ذہنی مریض، جارحیت پسند، متشدد، نیگرو۔

آئندہ چند ماہ میں مَیں اس خوفناک خواب کی توثیق تلاش کرتا رہا۔ میں نے اپنی [illegible] سے کتب جمع کیں ...... بالڈون، ایلیسن، ہیوز، رائٹ، ڈوبوئس۔ رات کے وقت [illegible] نانی سے کہتا کہ مجھے ہوم ورک کرنا ہے، پھر کمرے کا دروازہ بند کرتا اور بیٹھا [illegible] میں اچانک شدید بحث میں لگ جاتا، خود کو ملنے والی دنیا اور اپنی پیدائش [illegible]

کی کوشش کرتا۔ لیکن کوئی راہ فرار نہ ملتی۔ ہر کتاب کے ہر صفحے پر مجھے بار بار وہی غیض وغضب، وہی شکوک ملے؛ ایک تحقیر ذات جسے مضحکہ اور نہ ہی عقل منتشر کرتی معلوم ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ ڈوبوئس کا علم، بالڈوِن کی محبت اور لانگسٹن کا مزاح بھی انجام کار اس کی ہیبت ناک قوت کے آگے ہار گئے۔ ان سب نے انجام کار آرٹ کی نجات دینے کی قوت پر شک کیا، تینوں آخر میں پسپا ہو گئے -- ایک افریقہ میں، دوسرا یورپ میں اور تیسرا ہارلیم کی انتڑیوں میں۔ لیکن تینوں کو فرار ہونا پڑا۔ تینوں تھک گئے تھے۔

صرف میلکم ایکس کی خودنوشت سوانح کچھ مختلف لگی۔ اس کا خود کو بار بار نئے سرے سے تخلیق کرنا مجھے اچھا لگا --- اس کے دوٹوک شاعرانہ الفاظ، احترام پر بے لاگ اصرار، عسکری نظم وضبط، آہنی عزم۔ میں نے فیصلہ کیا کہ باقی کی تمام چیزیں، نیلی آنکھوں والے شیطانوں اور خاتمۂ زماں کی بات اس پروگرام میں اتفاقی ہیں۔ یہ سارا مذہبی عنصر میلکم ایکس نے غالباً اپنی زندگی کے آخری دنوں میں ترک کر دیا تھا۔ پھر بھی خود کو میلکم کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے تصور کرنے کے باوجود کتاب میں ایک لائن میرے ذہن میں اٹک گئی۔ اس نے اپنے دل کی ایک خواہش کے بارے میں بتایا: یہ خواہش کہ اس کی رگوں میں دوڑنے والا سفید خون کسی متشدد طریقے سے نکال لیا جائے۔ مجھے معلوم تھا کہ میلکم کے لیے یہ خواہش ہرگز اتفاق نہیں ہوگی۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ احترام ذات کی شاہراہ پر چلتے ہوئے میرا اپنا گورا خون کبھی بھی محض ایک تجرید نہیں بنے گا۔ میں سوچنے لگا کہ اگر میں نے کبھی اپنی ماں اور نانا نانی کو چھوڑا تو میرا کیا کچھ کٹ کر علیحدہ ہو جائے گا۔

اور یہ بھی کہ اگر زندگی کے آخر میں میلکم نے دریافت کیا تھا کہ کچھ گورے اس کے ساتھ مسلم بھائیوں کی حیثیت میں رہ سکتے ہیں تو یہ دریافت آخر کار مفاہمت کی ایک امید پیش کرتی تھی -- یہ امید مستقبل کے زماں و مکاں میں بہت دور معلوم ہوتی تھی۔ دریں اثنا، میں نے غور کیا کہ اس مستقبل کو حاصل کرنے اور نئی دنیا کو بسانے کی جدوجہد کرنے والے لوگ کہاں سے آئے۔ ایک روز یونیورسٹی جم میں باسکٹ بال کی پریکٹس کے بعد رے اور میں نے ایک دراز قد اور نہایت دبلے پتلے ملک نامی آدمی سے گفتگو شروع کر دی جو کبھی کبھار ہمارے ساتھ کھیلنے آیا کرتا تھا۔ ملک نے بتایا کہ وہ "نیشن آف اسلام" کا پیروکار تھا لیکن میلکم کی موت کے بعد ہوائی آ جانے پر وہ مسجد یا سیاسی اجلاسوں میں نہیں جاتا، مگر اب بھی اکیلے عبادت کرنے میں راحت محسوس کرتا ہے۔ قریب بیٹھے

لڑکوں میں سے ایک نے یقیناً یہ بات سن لی ہوگی۔ وہ چہرے پر مکارانہ تاثرات لیے آگے کو جھکا۔

"تم سب میلکم کے متعلق بات کرتے ہو، ہوں؟ میلکم جو کچھ کہتا ہے وہی ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔"

ایک اور لڑکے نے تائید کی، "ہاں۔ لیکن میں تمہیں بتاؤں -- تم جلد مجھے کسی افریقی جنگل میں گھومتے یا کسی منحوس صحرا میں کچھ عربوں کے ساتھ قالین پر بیٹھے عبادت کرتے نہیں دیکھو گے۔ نہیں جناب۔ اور تم مجھے پسلیاں کھانے سے پرہیز کرتے بھی نہیں دیکھنے والے۔"

"ان کے پاس پسلیاں تو ہوں گی۔"

"اور فرج بھی۔ کیا میلکم نے فرج کے بارے میں بات نہیں کی؟ ایسے تو کام نہیں چلے گا۔"

میں نے دیکھا کہ رے ہنس رہا ہے اور اسے کرختگی سے گھورا۔ "تم کیوں دانت نکال رہے ہو؟ تم نے کبھی میلکم کو پڑھا ہی نہیں۔ تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کیا کہتا ہے۔"

رے نے میرے ہاتھ سے باسکٹ بال چھینا اور مخالف رم کی طرف جاتے ہوئے بولا، "مجھے یہ جاننے کے لیے کسی کتاب کی ضرورت نہیں کہ کالے آدمی نے طور پر زندگی کیسے گزارنی ہے۔" میں نے جواب دینا شروع کیا اور تائید کے لیے ملک کی طرف دیکھا۔ لیکن مسلمان چپ رہا۔ اس کے ہڈیلے چہرے پر ایک دور دراز مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

میں نے فیصلہ کیا کہ آئندہ صرف خود سے مشورہ کروں گا۔ میں نے اپنے تیز مزاج کو پردوں میں چھپانا سیکھ لیا۔ البتہ چند ہفتے بعد آنکھ کھلی تو کچن میں سے باتوں کی آواز آئی -- میری نانی کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی اور نانا غرا رہا تھا۔ دروازہ کھولا تو توت کپڑے بدلنے کے لیے اپنے بیڈروم میں جاتی نظر آئی۔ میں نے پوچھا کہ کیا مسئلہ ہے۔

"کچھ بھی نہیں۔ بس تمہارے نانا آج مجھے کار میں دفتر چھوڑنے نہیں جانا چاہتے۔ بس۔"

جب میں کچن میں گیا تو گرامپس منہ ہی منہ میں کچھ بول رہا تھا۔ وہ کپ میں کافی ڈالنے لگا اور میں نے بتایا کہ اگر وہ تھکا ہوا ہے تو میں توت کو دفتر چھوڑ آتا ہوں۔ یہ ایک جرأت مندانہ پیش کش تھی کیونکہ میں جلدی اٹھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے میری تجویز سن کر تیوری چڑھائی۔

"بات یہ نہیں ہے۔ وہ بس مجھے ذلیل کرنا چاہتی ہے۔"

''نہیں، ایسا نہیں ہے، گرامپس۔''

''ایسا ہی ہے۔'' اس نے کافی کا ایک گھونٹ بھرا۔ ''جب سے بینک میں ملازمت شروع ہوئی ہے وہ ہمیشہ سے بس پر جا رہی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے زیادہ سہولت رہتی ہے اور اب کچھ خفا ہونے کی وجہ سے وہ سب کچھ تبدیل کر دینا چاہتی ہے۔''

توت سارے ہال میں منڈلاتے ہوئے اپنے چشموں کے پیچھے سے ہماری طرف دیکھ بھی رہی تھی۔

''یہ بات غلط ہے، ٹینا۔''

میں اسے دوسرے کمرے میں لے گیا اور پوچھا کہ کیا ماجرا ہے۔

''ایک آدمی نے کل مجھ سے پیسے مانگے۔ جب میں بس کا انتظار کر رہی تھی۔''

''بس؟''

اس کے ہونٹ بھینچے گئے۔ ''وہ بہت مشتعل تھا، باری، بہت مشتعل۔ میں نے اسے ایک نوٹ دیا اور وہ مزید مانگتا رہا۔ اگر بس نہ آ جاتی تو میرا خیال ہے کہ وہ میرا سر توڑ ڈالتا۔''

میں واپس کچن میں گیا۔ گرامپس اپنا کپ دھو رہا تھا، اس کی پشت میری جانب تھی۔ میں نے کہا، ''سنیں۔ اگر میں انہیں چھوڑ آؤں تو کیسا ہے۔ وہ کافی اَپ سیٹ لگتی ہیں۔''

''کسی منگتے کے ہاتھوں پریشان؟''

''ہاں، میں جانتا ہوں لیکن شاید وہ کچھ ڈر گئی ہیں۔ یقیناً یہ کوئی بڑی بات نہیں۔''

اس نے منہ میری طرف کیا تو میں نے دیکھا کہ وہ کانپ رہا تھا۔ ''یہ بڑی بات ہے۔ میرے لیے یہ واقعی بڑی بات ہے۔ پہلے بھی اسے مردوں نے تنگ کیا ہے۔ تم جانتے ہو کہ اس بار وہ اتنی سہمی ہوئی کیوں ہے؟ میں تمہیں بتاتا ہوں۔ تمہارے اندر آنے سے قبل اس نے مجھے بتایا کہ وہ آدمی کالا تھا۔'' اس نے یہ لفظ سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ''اس کے خوفزدہ ہونے کی اصل وجہ یہ ہے۔ اور میرے خیال میں یہ ٹھیک بات نہیں۔''

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے پیٹ میں گھونسا مار دیا ہو۔ میں سنبھلنے کی کوشش کرنے لگا۔ آواز کو مستحکم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے اسے بتایا کہ یہ رویہ میرے لیے بھی باعث

پریشانی تھا، لیکن اسے تسلی دی کہ توت کا خوف دور ہو جائے گا اور اس دوران ہمیں چاہیے کہ خود اسے چھوڑنے جائیں۔ گرامپس لونگ روم میں رکھی ہوئی ایک کرسی میں دھنس گیا اور یہ بات مجھے بتانے پر معذرت چاہی۔ میری نظروں کے سامنے وہ بہت منحنی، بوڑھا اور افسردہ ہو گیا۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ کوئی بات نہیں، میں سمجھتا ہوں۔

وہ کئی منٹ تک ایسے ہی تکلیف دہ خاموشی میں رہا۔ آخرکار اس نے اصرار کیا کہ توت کو خود لے کر جائے گا، اور کپڑے بدلنے کے لیے اٹھنے کی کوشش کی۔ ان کے جانے کے بعد میں بستر کے کنارے پر بیٹھ گیا اور اپنے نانا نانی کے متعلق سوچا۔ انہوں نے میری خاطر بار بار قربانی دی تھی۔ انہوں نے اپنی تمام خواہشات میری کامیابی کی نذر کر دی تھیں۔ انہوں نے کبھی بھی مجھے اپنی محبت کے متعلق شک کرنے کی وجہ نہیں دی تھی؛ اگر ایسا ہوتا تو مجھے شک ہو جاتا۔ اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ بہ آسانی میرے بھائی بن سکنے والے آدمی بھی ان میں گھٹیا ترین خوف جگا سکتے تھے۔

اس رات میں کار پر Waikiki گیا، روشنیوں سے لبریز ہوٹلوں کے قریب سے گزرا اور Ala-Wai نہر کی طرف گیا۔ خستہ حال پورچ اور نیچی چھت والا مکان شناخت کرنے میں مجھے کچھ دیر لگی۔ اندر روشنی جل رہی تھی اور میں فرینک کو پھولی ہوئی کرسی پر بیٹھے شاعری کی ایک کتاب پڑھتے دیکھ سکتا تھا۔ اس کے چشمے ناک کی نوک پر کھسکے ہوئے تھے۔ میں کار میں بیٹھا کچھ دیر دیکھتا رہا اور انجام کار باہر نکل کر دروازے پر دستک دی۔ بوڑھے نے اوپر اٹھتے ہوئے بمشکل ہی اوپر دیکھا اور کنڈی کھول دی۔ مجھے اس سے ملے ہوئے برسوں گزر چکے تھے۔

''کچھ پیو گے؟'' اس نے پوچھا۔ میں نے سر ہلایا اور اسے وہسکی کی ایک بوتل اور پلاسٹک کے دو کپ کچن کی الماری میں سے نکال کر لاتے ہوئے دیکھا۔ وہ بالکل پہلے جیسا لگتا تھا۔ بس مونچھ تھوڑی سفید ہو گئی تھی۔

''تمہارا نانا کیسا ہے؟''

''وہ ٹھیک ہے۔''

''سو تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

میرے پاس کوئی واضح جواب نہیں تھا۔ میں نے فرینک کو واقعے سے آگاہ کیا۔ اس نے سر ہلایا اور دو جام بھرے۔ پھر وہ بولا: ''تمہارا نانا بڑی مزے کی بلی ہے۔ تم جانتے ہو کہ شاید صرف پچاس میل کے فاصلے پر ہم دونوں نے پرورش پائی؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''یہ بات درست ہے۔ ہم دونوں وچیٹا (Wichita) کے قریب رہتے تھے۔ یقیناً ہم دونوں ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے۔ جب اس نے ہوش سنبھالی تو میں کافی بڑا ہو چکا تھا۔ کبھی کبھی اس کے کچھ عزیزوں سے ملاقات البتہ ہو جاتی تھی۔ کبھی گلی میں آمنا سامنا ہوتا۔ اگر وہ سامنے سے آ رہے ہوتے تو میں انہیں راستہ دینے کے لیے ایک طرف ہو جاتا۔ کیا تمہارے نانا نے تمہیں کبھی یہ بات بتائی ہے؟''

میں نے دوبارہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہسکی اپنے حلق میں انڈیلی۔

''ناں۔ میرے خیال میں اس نے نہیں بتائی ہوگی یہ بات۔ سٹینلے کنساس کے اس پہلو پر بات کرنا پسند نہیں کرتا۔ یہ چیز اسے بے چین کر دیتی ہے۔ ایک بار اس نے مجھے ایک سیاہ فام لڑکی کے متعلق بتایا جو اس نے تمہاری ماں کی دیکھ بھال کرنے کے لیے رکھی تھی۔ میرے خیال میں وہ کسی مبلغ کی بیٹی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ کس طرح وہ کنبے کا مستقل حصہ بن گئی۔ اسے یہ اسی انداز میں یاد ہے: جیسے کہ یہ لڑکی کسی اور کے بچوں کی دیکھ بھال کرنے آتی ہے، اس کی ماں کسی اور کے کپڑے دھونے جاتی ہے۔ کنبے کا باقاعدہ حصہ۔''

میں نے ہاتھ بڑھا کر بوتل پکڑی اور اپنا گلاس بھرا۔ فرینک میری طرف نہیں دیکھ رہا تھا؛ اس کی آنکھیں بند تھیں، سر کرسی کی پشت پر ٹکا ہوا تھا اور بڑا سا جھریوں زدہ چہرہ پتھر سے تراشا لگتا تھا۔ پھر اس نے دھیمے انداز میں کہا، ''فرینک جیسا بھی ہے اس کا الزام اسے نہیں دیا جا سکتا۔ وہ بنیادی طور پر ایک اچھا آدمی ہے۔ لیکن وہ مجھے نہیں جانتا۔ بس اتنا ہی جانتا ہے جتنا تمہاری ماں کی دیکھ بھال کے لیے آنے والی لڑکی کو۔ وہ مجھے نہیں جان سکتا، اس انداز میں نہیں جیسے میں اسے جانتا ہوں۔ شاید ہوائی کے کچھ لوگ یا کچھ انڈینز جان سکتے ہیں۔ ان کے باپوں نے تذلیل سہی ہے۔ ان کی ماؤں کی بے حرمتی ہوئی۔ لیکن تمہارا نانا کبھی نہیں جان سکے گا کہ وہ کیسا محسوس کرتے ہیں۔

اسی لیے وہ یہاں آ کر میری وہسکی پی سکتا اور تمہارے والی کرسی پر سو سکتا ہے۔ بچوں کی طرح سو سکتا ہے۔ دیکھو! میں اس کے گھر میں یہ کام کبھی نہیں کر سکتا۔ کبھی بھی نہیں۔ چاہے میں کتنا بھی تھک گیا ہوں، لیکن اب بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اپنی بقا کے لیے مجھے ہوشیار رہنا پڑتا ہے۔''

فرینک نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ ''میں تمہیں یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کی تمہاری نانی خوفزدہ ہونے کا حق رکھتی ہے۔ وہ بھی کم از کم سٹینلے جتنی ہی حق پر ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ کالے لوگوں سے نفرت کرنے کی ایک وجہ موجود ہے۔ جو ہے سو ہے۔ تمہاری خاطر میں کچھ اور کی خواہش کرتا ہوں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ سو تم بھی اس کی عادت ڈال لو۔''

فرینک نے دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ اس کی سانسیں مدھم پڑنے لگیں اور آخر وہ محو خواب معلوم ہونے لگا۔ پہلے میں نے اسے جگانے کا سوچا، مگر پھر ارادہ بدل دیا اور واپس چلتا ہوا کار کی طرف آ گیا۔ زمین میرے پیروں تلے لرز اٹھی۔ لگتا تھا کہ وہ ابھی پھٹے گی اور مجھے نگل لے گی۔ میں رک گیا، خود کو سنبھالنے کی کوشش کی، اور پہلی بار معلوم ہوا کہ میں قطعی تنہا تھا۔

☙❧

پانچواں باب

سیاہ فام ذلت

صبح کے تین بجے ہیں۔ چاندنی میں نہائی گلیاں خالی ہیں، دور کی کسی سڑک پر رفتار پکڑی ہوئی کار کی گڑگڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ جشن منانے والے لوگ جوڑوں کی صورت میں یا اکیلے اکیلے جا چکے تھے، بیئر سے بوجھل نیند کا بار اٹھائے۔ حسن اپنی نئی خاتون کے مکان پر ہے --- اس نے آنکھ میچ کر کہا تھا، اوپر ہی نہ رہ جانا۔ اور اب صرف ہم دونوں سورج نکلنے کا انتظار کر رہے ہیں: میں اور بلی ہالیڈے۔ اس کی آواز تاریک کمرے میں گنگنا رہی ہے، عاشق کی طرح میری طرف آتی ہوئی:

I'm a fool . . . to want you.

Such a fool . . . to want you.

میں نے اپنے لیے ایک ڈرنک بنایا اور کمرے میں نظر ڈالی۔ بسکٹوں کے مچڑے ہوئے ڈبے، حد سے زیادہ بھری ہوئی ایش ٹریز، دیوار کے ساتھ خالی بوتلوں کی قطار۔ زبردست پارٹی۔ ہر کسی نے یہی کہا تھا: باری اور حسن نے گھر کو راک کر دیا۔ ریجینا کے سوا ہر کسی نے کہا۔ اسے مزہ نہیں آیا تھا۔ اس نے جانے سے پہلے کیا کہا تھا؟ تم ہمیشہ یہی سمجھتے ہو کہ بس ایک تم ہی ہو۔ اور پھر اپنی نانی کے بارے میں وہ باتیں۔ کہ جیسے ساری سیاہ فام نسل کی ذمہ داری مجھ پر ہو۔ کہ جیسے میں نے ہی اس کی نانی کو ساری زندگی گھٹنوں کے بل جھکائے رکھا ہو۔ بھاڑ میں جائے ریجینا۔ وہ مجھے نہیں جانتی تھی۔ اسے سمجھ نہیں تھی کہ میں کہاں سے آیا ہوں۔

میں کوچ پر پیچھے کی طرف گر گیا اور ایک سگریٹ سلگائی اور دیا سلائی کو اپنی انگلیوں میں جل کر راکھ ہوتے دیکھا۔ شعلے کو دبا کر بجھانے پر اپنی انگلیوں کے پوروں میں چبھن محسوس ہوئی۔ 'کیا

ٹرِک ہے؟' آدمی نے پوچھا۔ 'ٹرِک یہ ہے کہ تکلیف کی پروا نہ کی جائے۔' میں نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ یہ جملہ کہاں سنا تھا، لیکن یاد نہ آیا، کسی بھولے ہوئے چہرے کی طرح۔ کوئی بات نہیں۔ بلی بھی یہی ٹرِک جانتی تھی؛ اس کی تھرتھراتی اور چیرتی ہوئی آواز میں یہ موجود تھا۔ اور میں نے بھی اسے سیکھا تھا؛ ہائی سکول میں اپنے آخری دو برس کے دوران، جب رے کسی اور جونیئر سکول میں چلا گیا تھا اور میں نے کتابیں ایک طرف رکھ دی تھیں؛ جب میں نے اپنے باپ کو خط لکھنا اور اس نے جواب دینا چھوڑ دیا تھا۔ میں ایک الجھاؤ سے نکلنے کی کوشش کرتے کرتے تھک گیا تھا جو میری اپنی پیداوار نہیں تھا۔

میں نے لاپروائی سیکھ لی تھی۔

میں دھوئیں کے کچھ مرغولے بناتے ہوئے ان برسوں کو یاد کرتا رہا۔ افیون نے کچھ مدد اور نشہ دیا۔ البتہ میں دھت نہیں ہوا تھا -- مجھے اس پر لگانے والا ملکی چاہتا تھا کہ میں نشے میں مست ہو جاؤں۔ اس نے کہا کہ وہ آنکھوں پہ پٹی باندھ کر بھی ایسا کر سکتا ہے، لیکن وہ یہ بات کہتے ہوئے بھی کسی خراب انجن کی طرح لرز رہا تھا۔ شاید اسے ٹھنڈ لگ رہی ہو؛ ہم ایک سٹور (جہاں وہ کام کرتا تھا) کے پیچھے گوشت والے فریزر میں کھڑے تھے اور وہاں کا درجہ حرارت 20 ڈگری سینٹی گریڈ سے زیادہ نہیں ہوگا۔ لیکن اس کے لرزنے کی وجہ ٹھنڈک نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اسے پسینہ آ رہا تھا، چہرہ چمکتا ہوا اور تنا ہوا۔ اس نے سوئی نکالی اور سرنج بھرنے لگا۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے اسے دیکھا۔ ہمارے اردگرد سور اور گائے کے گوشت کے حصے لٹکے تھے۔ عین اس لمحے میرے دماغ میں بلبلے جیسی ایک شبیہ ابھری۔ وہ آہستہ آہستہ ورید سے گزر کر دل میں جا رکی......

جنکی، پاٹ ہیڈ (Pothead ، Junkie)۔ میں یہ بننے جا رہا تھا: نوجوان سیاہ فام آدمی کا آخری، مہلک کردار۔ میں ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں کس قدر گھٹیا ہوں۔ میں ایسا اس لیے کر رہا تھا تاکہ اپنی ہستی کے متعلق سوالات کو ذہن سے نکال سکوں، کوئی ایسی چیز جو میرے دل کی کھائیوں کو پر کر سکے، میرے حافظے کے کناروں کو کند کر دے۔ مجھے پتا چلا کہ کسی گورے ہم جماعت کی چمکتی ہوئی نئی وین میں، یا جم میں ملنے والے کسی دوسرے بھائی کے کمرے میں یا ساحل پر سکول سے بھاگے ہوئے دیسی ہوائی لڑکوں کے ساتھ ہیروئن والا سگریٹ پینے میں کوئی فرق نہیں۔ کوئی بھی سوال نہیں کرتا تھا کہ آیا آپ کا باپ بیوی سے بے وفائی کرنے والا ایلیٹ کلرک جیسا

ایگزیکٹو یا کوئی اور ہے۔ ہوسکتا تھا کہ آپ بس بور یا اکیلے ہوتے۔ عدم محبت کے کلب میں ہر کسی کو خوش آمدید کہا جاتا۔ اور اگر وجد کی حالت بھی آپ کو مصیبت کے احساس سے نجات نہ دلاتی تو کم از کم دنیا کی حماقت پر ہنسنے اور منافقت و اخلاقیات کے پردے کے اس پار دیکھنے کے قابل تو بنا ہی سکتی تھی۔

بہرحال، اس وقت یہ سب مجھے ایسے ہی نظر آتا تھا۔ کوئی دو سال بعد ہی میں تقدیر کا کھیل دیکھنے کے قابل ہوا --- کہ جب آپ گریں تو زمین کتنی نرم یا سخت ہوگی۔ یقیناً ہر دو صورتوں میں آپ کو کچھ قسمت کی ضرورت تھی۔ پبلو میں کافی حد تک اسی چیز کا فقدان تھا...... اس روز وہ اپنا ڈرائیونگ لائسنس بھول گیا اور پولیس والے نے اس کی کار کی تلاش لے لی۔

میں نے ایک بار اپنی ماں سے اس بارے میں بات کرنے کی کوشش کی کہ دنیا میں قسمت کا کتنا عمل دخل ہے۔ ہائی سکول میں میرا سینئر سال شروع ہو چکا تھا، ماں واپس ہوائی آئی ہوئی تھی؛ پبلو کی گرفتاری کی تفصیلات معلوم کرنے میرے کمرے میں چلی آئی۔ میں نے مسکرا کر اسے تسلی دی، اس کا ہاتھ تھپتھپایا اور کہا کہ پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں، میں کوئی احمقانہ حرکت نہیں کروں گا۔ میرا سیکھا ہوا یہ حربہ عموماً کارگر رہتا: اگر آپ خوش اخلاقی سے مسکراتے رہیں اور کوئی اچانک حرکت نہ کریں تو لوگ مطمئن رہتے ہیں۔ وہ حد سے زیادہ مطمئن اور پرسکون تھے...... ایک نہایت خوش آداب نوجوان کالے آدمی سے ملاقات کی خوشگوار حیرت۔

بس میری ماں ہی مطمئن نہیں لگتی تھی۔ وہ سامنے بیٹھ کر میری آنکھوں کا مطالعہ کرتی اور چہرے پر کرختگی تنی رہتی۔

''کیا تم اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ غیر سنجیدہ نہیں ہو گئے؟'' اس نے کہا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''تمہیں معلوم ہے کہ میرا کیا مطلب ہے۔ حال ہی میں تمہارا ایک دوست منشیات رکھنے کے جرم میں گرفتار ہوا ہے۔ تمہارے گریڈز گھٹ رہے ہیں۔ تم نے ابھی اپنے کالج کی درخواستیں بھی لکھنا شروع نہیں کیں۔ میں جب بھی تم سے اس بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں تم پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتے۔''

مجھے یہ سب سننے کی ضرورت نہیں تھی۔ ایسا نہیں کہ میں نکما تھا۔ میں نے اسے بتانا شروع کیا

کہ کس طرح میں کالج نہ جانے کے امکان پر غور کر رہا تھا، کیسے میرا خیال تھا کہ میں ہوائی میں ہی رہوں اور کچھ کلاسز لوں اور جز وقتی ملازمت کروں۔ اس نے میری بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔ اس نے کہا کہ اگر میں تھوڑی سی کوشش کروں تو ملک کے کسی بھی سکول میں داخلہ لے سکتا تھا۔

''یاد ہے نا کہ کوشش کیا ہوتی ہے؟ خدا کا نام لو یاری! تم اس طرح ہاتھ پہ ہاتھ دھرے انتظار نہیں کر سکتے کہ کب قسمت تمہیں اٹھا کر اوپر پہنچا دے۔''

''ہاتھ پہ ہاتھ دھرے کا کیا مطلب ہے؟''

''ہاتھ پہ ہاتھ دھرے، بے کار اور آوارہ۔''

میں نے ماں کو بے چینی کی حالت میں وہاں بیٹھے دیکھا، اپنے بیٹے کی تقدیر کے متعلق پر یقین۔ میری بقا کا دارومدار قسمت پر ہونے کا تصور بدستور اس کے لیے ایک کلمۂ کفر رہا۔ اس نے کچھ نہ کچھ ذمہ داری لینے پر اصرار کیا --- اپنی، گرامپس اور توت کی، میری۔ اچانک مجھے یوں لگا جیسے میں نے اس کے یقین کے غبارے میں سے ہوا نکال دی ہو --- یہ بتا کر کہ میرے اوپر کیا ہوا اس کا تجربہ ناکام ہو گیا تھا۔ میں چلانے کے بجائے ہنس دیا۔ ''بے کار اور آوارہ۔ ہوں؟ اچھا، کیوں نہیں؟ ہوسکتا ہے کہ میں زندگی میں یہی چاہتا ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ گرامپس کی طرف دیکھیں۔ وہ تو کالج بھی نہیں گئے۔''

اس موازنے نے میری ماں کو بوکھلا دیا۔ اس کا چہرہ کالا پڑ گیا اور آنکھیں پھیل گئیں۔ اچانک مجھ پر عیاں ہوا کہ اس کا مہیب ترین خوف کیا ہے: ''کیا تم اس وجہ سے پریشان ہو؟ کہ میں گرامپس جیسا بن جاؤں گا؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے اپنا سر نفی میں ہلایا اور بولی: ''تم اب بھی اپنے نانا سے کہیں زیادہ تعلیم حاصل کر چکے ہو۔'' لیکن قطعیت اس کی آواز سے معدوم ہو گئی تھی۔ اپنے نکتے پر مزید بات کرنے کے بجائے میں اٹھا اور کمرے سے چلا گیا۔

بلی نے گانا بند کر دیا تھا۔ خاموشی کھولنے لگی اور اچانک میں نے خود کو بہت تیمن ہوا پایا۔ میں صوفے سے اٹھا، ریکارڈ کی سائیڈ بدلی، گلاس حلق میں خالی کیا اور نیا بنایا۔ اوپر والی منزل میں کسی کو ٹوائلٹ فلش کرتے اور کمرے میں چلتے ہوئے سن سکتا تھا۔ شاید ایک اور بے خوابی کا

مریض جو اپنی زندگی کی گھڑیاں گن رہا ہے۔ افیم اور منشیات کے ساتھ یہی مسئلہ تھا، ہے نا؟ کسی موقع پر وہ اس خالی پن میں گونجتی ہوئی ٹک ٹک کو نہیں روک سکتے۔ اور میرے خیال میں اس روز میں اپنی ماں کو یہی بتانے کی کوشش کر رہا تھا: کہ انصاف اور استدلال پر اس کا ایمان بے تک تھا، کہ ہم کبھی بھی اس ساری تعلیم پر غالب نہیں آ سکتے تھے اور دنیا کی نیک خواہشات کائنات میں موجود رخنوں کو بند نہیں کر سکتی تھیں یا آپ کو اس کا اندھا دھند سفر تبدیل کرنے کا اختیار نہیں دے سکتی تھیں۔

پھر بھی اس گفتگو کے بعد میں نے برا محسوس کیا؛ یہ ایک ٹرک ہمیشہ سے میری ماں کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ اس طرح وہ مجھے احساس جرم میں مبتلا کر دیتی تھی۔ وہ اس بارے میں کچھ چھپاتی بھی نہ۔ ایک مرتبہ اس نے مجھے بتایا: "تم اس سے دور نہیں رہ سکتے۔ یہ تمہاری بچپن کی غذا کا حصہ تھا۔ پریشان مت ہو۔" وہ بلی کی طرح مسکرائی اور بولی، "احساس جرم کی ایک بھاری مقدار کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچاتی۔ تہذیب کی بنیاد ہی احساس جرم پر ہے۔ اس جذبے کی قدر صحیح معنوں میں جانچی نہیں گئی۔"

تب ہم اس بارے میں مذاق کر سکتے تھے، کیونکہ ماں کے بدترین خوف دور ہو چکے تھے۔ میں نے کسی حادثے کے بغیر گریجوایشن کر لی، متعدد مؤقر سکولوں میں داخل کیا گیا اور لاس اینجلس کے آکسیڈینٹل کالج کو منتخب کیا کیونکہ میری ملاقات برینٹ ووڈ کی ایک لڑکی سے ہوئی تھی جو اپنے اہل خانہ کے ہمراہ ہوائی میں چھٹیاں منانے آئی تھی۔ لیکن میں اب بھی کالج سے اتنا ہی بیزار تھا جتنا زیادہ تر دوسری چیزوں سے۔ حتیٰ کہ فرینک نے بھی مجھے بدتہذیب خیال کیا، حالانکہ اسے بالکل پتا نہیں تھا کہ میں اپنے آپ کو کیسے تبدیل کروں۔

فرینک کالج کو کیا کہتا تھا: سمجھوتے کی ایڈوانسڈ ڈگری۔ مجھے یاد ہے کہ میں ہوائی کو الوداع کہنے سے چند روز قبل اس بوڑھے شاعر سے آخری بار ملا تھا۔ ہم نے کچھ دیر ہلکی پھلکی باتیں کیں، اس نے اپنے پیروں کی تکلیف بیان کی، کہ کیسے امریکی پیروں کو یورپی جوتوں میں ڈالنے کی وجہ سے مسئلہ پیدا ہوا۔ آخر میں اس نے پوچھا کہ میں کیا توقعات لے کر کالج جا رہا تھا۔ میں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس نے اپنا بڑا سا سر ہلایا اور کہا:

ٹھیک ہے۔ یہ ایک مسئلہ ہے۔ ہے نا؟ تم نہیں جانتے۔ تم بھی وہاں باہر گھومتے ہوئے جوان بلوں جیسے ہی ہو۔ تمہیں بس اتنا معلوم ہے کہ تمہارا اگلا کام کالج میں جانا ہے۔ اور تمہیں کالج

تک پہنچانے کے لیے عمر بھر تگ و دو کرنے والے لوگ اتنے بوڑھے ہو چکے ہیں کہ وہ بھی نہیں جانتے --- وہ تو بس تمہیں کالج میں دیکھ کر خوش ہیں اور اس خوشی میں تمہیں سچ نہیں بتائیں گے۔ داخلے کی حقیقی اصل قیمت۔"

"وہ قیمت کیا ہے؟"

"اپنی نسل کو گھر کی دہلیز پر چھوڑ جانا۔ اپنے لوگوں کو چھوڑ کر چلے جانا۔" اس نے اپنے مطالعے والے چشموں میں سے مجھے سرتاپا دیکھا۔ "کچھ سمجھ آئی نوجوان؟ تم تعلیم حاصل کرنے کے لیے کالج میں نہیں جا رہے۔ تم تربیت لینے جا رہے ہو۔ وہ تمہیں ایسی چیز کی طلب کرنا سکھائیں گے جو تمہیں نہیں چاہیے۔ وہ تمہیں الفاظ اس طرح استعمال کرنا سکھائیں گے کہ وہ بے معنی ہو کر رہ جائیں گے۔ وہ تمہیں پہلے سے معلوم چیزیں بھولنے کی تربیت دیں گے۔ وہ تمہیں اچھی طرح تیار کریں گے اور تم مساوی مواقع، امریکی انداز حیات اور اس قسم کی ساری بکواس کے متعلق ان کی بتائی ہوئی باتوں پر یقین کرنے لگو گے۔ وہ تمہیں ایک کارنر آفس دے کر اعلیٰ درجے کے ڈنر پر دعوت دیں گے اور بتائیں گے کہ تم اپنی نسل کا ایک قیمتی اثاثہ ہو۔ یہاں تک کہ تم واقعی ایسا سوچنے لگو گے اور تب وہ تمہاری لگامیں کھینچ کر بتائیں گے کہ تم اعلیٰ تربیت یافتہ، اچھے تنخواہ یافتہ نیگرو سہی، لیکن پھر بھی محض ایک نیگرو ہی ہو۔"

"تو آپ مجھے کیا بتانا چاہ رہے ہیں --- کہ مجھے کالج نہیں جانا چاہیے؟"

فرینک کے کندھے جھک گئے اور وہ آہ بھر کر اپنی کرسی کی پشت سے لگ گیا۔ "نہیں۔ میں نے یہ نہیں کہا۔ تمہیں جانا ہی ہے۔ میں بس یہ کہہ رہا ہوں کہ اپنی آنکھیں کھلی رکھنا۔ جاگتے رہنا۔"

میں تصور میں فرینک اور اس کی بوڑھی کالی طاقت کو یاد کر کے مسکرا اٹھتا ہوں۔ کچھ اعتبار سے وہ میری ماں جیسا ہی لاعلاج اور اپنے یقین پر محکم تھا۔ وہ 60ء کی دہائی میں ہوائی کے تخلیق کردہ تانے بانے کا حصہ تھا۔ اس نے مجھے اپنی آنکھیں کھلی رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ یہ کام اتنا آسان نہیں تھا جتنا لگتا ہے۔ دھوپ سے لبریز لاس اینجلس میں تو ہرگز آسان نہیں تھا۔ اس وقت بھی نہیں جب آپ آکسیڈینٹل کالج کے کیمپس میں چہل قدمی کر رہے ہوتے۔ طلبا دوستانہ تھے اور اساتذہ حوصلہ افزا۔ 1979ء کے موسم خزاں میں کارٹر، گیس لائنز اور سینہ کوبی سب کچھ دم توڑ رہا تھا۔ امریکہ میں نئی صبح میں ریگن کا ستارہ طلوع ہو رہا تھا۔ آپ کیمپس سے نکل کر فری وے کے راستے واٹس تک پہنچ یا

ویسٹ ووڈ کی طرف آتے، ایسٹ لاس اینجلس یا ساؤتھ سنٹرل سے گزرتے۔ ہر طرف پام کے درخت نظر آتے۔ لاس اینجلس بھی ہوائی سے زیادہ مختلف نہیں تھا، کم از کم یہ حصہ تو نہیں۔ بس یہ کچھ بڑا تھا اور کوئی ماہر حجام ڈھونڈنا بھی نسبتاً آسان تھا۔

بہرحال، آکسیڈینٹل کالج میں دیگر سیاہ فام طلبا میں سے زیادہ تر کو سمجھوتے کے حوالے سے کوئی پریشانی نہیں لگتی تھی۔ کیمپس میں ہماری تعداد اتنی تھی کہ ہم ایک قبیلہ بنا سکتے، اور جب بھی موقعہ ملتا تو ہم میں سے متعدد ایک قبیلے کی طرح ہی عمل کرتے، پاس پاس رہتے، ٹولیوں میں سفر کرتے۔ فریشمین ایئر کے دوران میں کالج کے ہاسٹل میں ہی رہتا تھا۔ وہاں بھی اسی طرح کی بحثیں ہوتیں جیسی ہوائی میں رے اور دیگر کالوں کے ساتھ کر چکا تھا۔ ویسی ہی غراہٹیں، ویسی ہی شکایات۔ باقی تمام پریشانیاں گورے لڑکوں والی ہی تھیں۔ کلاسز میں اچھی کارکردگی دکھانا۔ گریجوایشن کے بعد کوئی اچھی تنخواہ والی عارضی ملازمت ڈھونڈنا۔ کسی لڑکی کی صحبت۔ میں کالے لوگوں کے متعلق ایک خفیہ راز میں چوک کر بیٹھا تھا: ہم میں سے زیادہ تر کو بغاوت میں دلچسپی نہیں تھی؛ کہ ہم میں سے بیشتر ہر وقت نسل کے متعلق سوچ سوچ کر تھک گئے تھے؛ کہ اگر ہم اپنے آپ میں ہی رہنے کو ترجیح دیتے تھے تو اس کی بڑی وجہ اس سوچ سے چھٹکارا پانا تھی؛ اس طرح ہم ہر وقت یہ سوچنے سے بچ جاتے تھے کہ گورے لڑکے ہمارے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں۔

سو میں اس چیز کو ترک کیوں نہیں کر سکتا تھا؟

معلوم نہیں۔ شاید میرے پاس قبیلے کی قطعیت والی سہولت نہیں تھی۔ کامپٹن میں پرورش پائیں تو بقا ایک انقلابی اقدام بن جاتی ہے۔ آپ کالج میں جاتے ہیں اور پیچھے آپ کے گھر والے بدستور آپ کی خاطر کھیتوں میں محنت کرتے رہتے ہیں۔ وہ آپ کو فرار پاتے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں؛ غداری کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا۔ لیکن میری پرورش کامپٹن یا واٹس میں نہیں ہوئی تھی۔ مجھے اپنے داخلی شک کے سوا اور کسی بھی چیز سے فرار نہیں پانا تھا۔ میں مضافات میں پرورش پانے والے سیاہ فام طلبا سے زیادہ مشابہت رکھتا تھا جن کے والدین فرار کی قیمت ادا کر چکے تھے۔ آپ ان کے انداز گفتگو اور کیفے ٹیریا میں ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں کے ذریعے انہیں فوراً شناخت کر لیتے۔ زور دیے جانے پر وہ بتاتے کہ انہیں زمروں میں بند کیا جانا منظور نہیں۔ وہ آپ کو بتاتے کہ اپنی جلد کی رنگت ان کا تعین نہیں کرتی تھی، کہ وہ انفرادی شناخت رکھتے تھے۔

جوائس کو اسی طرح کی بات پسند تھی۔ وہ پرکشش عورت تھی --- سبز آنکھیں، شہد جیسی جلد اور ابھرے ہوئے ہونٹ۔ میرے فریشمین ایئر کے دوران ہم ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ ایک روز میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ "بلیک سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن" کے اجلاس میں جا رہی ہے۔ اس نے مضحکہ خیز انداز میں میری جانب دیکھا اور پھر بچے کی طرح نفی میں سر ہلانے لگی۔

"میں سیاہ فام نہیں۔ میں کثیر نسلی ہوں۔" جوائس نے کہا۔ پھر وہ مجھے اپنے باپ کے متعلق بتانے لگی جو اطالوی تھا اور اس دنیا کا دلکش ترین آدمی تھا؛ اور اس کی ماں اتفاق سے نیم افریقی اور نیم فرانسیسی تھی۔ "مجھے ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔ اس کی آواز تڑخ گئی اور میں نے سوچا کہ وہ ابھی رو دے گی۔ "اصل میں گورے لوگ مجھے انتخاب پر مجبور نہیں کر رہے۔ ایسا ہوا کرتا ہوگا، لیکن اب وہ مجھے ایک انسان کے طور پر لینے کو تیار ہیں۔ نہیں --- اصل میں کالے لوگ ہی ہمیشہ مجھے ہر چیز کو نسلی تناظر میں دیکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ وہی مجھے بتاتے ہیں کہ میں کیا نہیں ہو سکتی......"

وہ۔ وہ۔ وہ۔ جوائس جیسے لوگوں کے ساتھ یہ مسئلہ تھا۔ وہ اپنی بھرپور کثیر نسلی میراث کے متعلق بات کرتے اور آپ کو بہت اچھا لگتا، لیکن تب آپ دیکھتے کہ کالوں سے گریز کر رہے ہیں۔ یہ شعوری انتخاب کا نہیں بلکہ کشش کی قوت کا معاملہ تھا۔ اتحاد ہمیشہ اسی طرح کام کرتا ہے، ایک قسم کی بندگلی۔ اقلیت خود کو غالب ثقافت میں ضم کر دیتی ہے، نہ کہ اس کے برعکس۔ صرف گوروں کی ثقافت غیر جانبدار اور معروضی ہو سکتی تھی۔ صرف گوری ثقافت کا نسلی امتیاز سے پاک ہونا ممکن تھا۔ صرف گوری ثقافت میں افراد موجود تھے۔ اور ہم کالج کے طلبا اس صورت حال کا جائزہ لیتے اور اپنے بارے میں سوچتے تھے۔ ہم نہ چاہتے ہوئے بھی ہارے ہوؤں میں کیسے شمار ہو گئے؟ ہم اس قدر مشکور صرف اس لیے ہوئے کہ خود کو ہجوم میں کھو دیں؟ امریکہ ایک خوش و خرم، بے چہرہ بازار ہے؛ اور ہم اس وقت ہرگز غضب میں نہ آتے جب کوئی ٹیکسی ہمارے پاس سے گزر جاتی یا لفٹ میں موجود عورت اپنے پرس کو مضبوطی سے پکڑ لیتی۔ ہم خود کو شائستہ تصور کرتے اور یہی [illegible] غلط ہے ہمیں کوئی عام نیگرو تصور کیا جا رہا ہے۔

آپ نہیں جانتے کہ میں کون ہوں؟ میں ایک فرد ہوں؟

میں اٹھ کر بیٹھا، ایک اور سگریٹ سلگائی، بوتل اپنے گلاس میں انڈیلی۔ مجھے معلوم تھا کہ میں بے چاری جوائس کے لیے بہت زیادہ مسئلہ پیدا کر رہا تھا۔ سچی بات یہ تھی کہ میں اسے سمجھتا تھا، اسے اور تمام سیاہ فام بچوں کو بھی جو اس کی طرح محسوس کرتے تھے۔ میں ان کے انداز و اطوار، طرز گفتگو، دل کی ملی جلی کیفیات میں خود کو جزواً شناخت کر سکتا تھا۔ اور عین اسی چیز نے مجھے خوفزدہ کیا۔ ان کی بوکھلاہٹ نے مجھے اپنے نسلی اوصاف پر ایک مرتبہ پھر سوال اٹھانے پر مائل کیا۔ ریس کا ٹرمپ کارڈ اب بھی میرے ذہن کے کسی گوشے میں موجود تھا۔ مجھے ان کے اور اپنے درمیان فاصلہ رکھنے، خود کو سمجھوتے سے پاک سمجھنے کی ضرورت تھی --- کہ میں واقعی اب بھی بیدار تھا۔

میں نے دوستوں کے انتخاب میں بہت احتیاط برتی۔ ان میں سے زیادہ تر سرگرم سیاہ فام سیاسی کارکن تھے۔ غیر ملکی طلبا۔ Chicanos۔ مارکسسٹ پروفیسرز، حقوق نسواں کی حامی، پنک راک شاعر۔ ہم سگریٹ پھونکتے اور چمڑے کی جیکٹیں پہنتے۔ رات کے وقت اپنے ہاسٹل کے کمروں میں ہم نوآبادیات، فرانز فینن، یورپ کی مرکزیت اور پدرسری نظام پر بحث کرتے۔ جب ہم راہداری کے قالین تلے اپنے سگریٹ چھپاتے یا اتنی اونچی آواز میں سٹیریو لگاتے کہ دیواریں کانپنے لگتیں تو ہم بورژوا معاشرے کی سخت پابندیوں کی مدافعت کر رہے ہوتے۔ ہم لاپروا یا بے احتیاط یا غیر محفوظ نہیں تھے۔ ہم بیگانگیت کا شکار تھے۔

لیکن صرف یہی حکمت عملی مجھے جوائس اور اپنے ماضی سے دور نہیں کر سکتی تھی۔ آخر کیمپس میں ہزاروں نام نہاد انقلابی موجود تھے، زیادہ تر گورے اور منجھے ہوئے۔ نہیں، اب بھی ثابت کرنا لازمی تھا کہ آپ کس طرف ہیں۔ سیاہ فاموں کے ساتھ اپنی وفاداری ظاہر کرنا یا ہڑتال کرنا اور ناموں کی نشاندہی کرنا۔

جب میں کالج کے ہاسٹل میں ریگی، مارکس اور اپنے ایک ساتھ گزارے ہوئے دنوں کے متعلق سوچتا ہوں تو کھڑکی پر بارش کی پھوہار پڑتی یاد آتی ہے۔ ہم بیئر پی رہے تھے اور مارکس ہمیں L.A.P.D کے ساتھ اپنی روبروئی کے متعلق بتا رہا تھا۔ "ان کے پاس مجھے روکنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس کے سوا کوئی وجہ نہیں تھی کہ میں سفید فاموں کے علاقے میں گھوم پھر رہا تھا۔ ان میں سے ایک نے اپنا پستول نکالا، مگر میں خوفزدہ نہ ہوا۔ وہ لوگ کسی کالے کی آنکھوں میں خوف دیکھ کر ہی شیر ہو جاتے ہیں......"

ٹِم چلتا ہوا کمرے میں آیا اور ہاتھ ہلا کر چہکا، "ہیلو دوستو۔" وہ میری طرف مڑا، "سنو! باری ......کیا انہوں نے تمہیں Econ کے لیے اسائنمنٹ دے دی ہے؟"

ٹِم برادری کا باشعور طور پر رکن نہیں تھا۔ وہ بزنس میں ڈگری لینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کی گوری محبوبہ غالباً اوپر کمرے میں اس کے انتظار میں بیٹھی دیسی موسیقی سن رہی تھی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا، اور میری بس یہی خواہش تھی کہ وہ چلا جائے۔ میں اٹھا، اسے اسائنمنٹ دی اور ساتھ چلتا ہوا کمرے سے باہر آیا۔ ریگی کے کمرے میں واپس آتے ہی میں نے کچھ وضاحت ضروری سمجھی۔

میں نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا، "ٹِم ذرا مختلف قسم کا ہے نا۔ اسے چاہیے کہ اپنا نام ٹِم سے بدل کر ٹام رکھ لے۔"

ریگی ہنس دی، "لیکن مارکس نہیں۔" اس نے کہا، "یار! تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟"

اس سوال نے مجھے لاجواب کر دیا۔ "مجھے نہیں معلوم۔ وہ ذرا احمق سا آدمی ہے۔ بس۔"

مارکس نے بیئر کا ایک گھونٹ بھرا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ "ٹِم مجھے تو بالکل ٹھیک لگتا ہے۔ وہ اپنا کام کرتا ہے، کسی کو تنگ نہیں کرتا۔ مجھے لگتا ہے کہ ہمیں دوسرے لوگوں پر تاثرات دینے کے بجائے اپنے باہمی معاملات پر بات کرنی چاہیے۔"

ایک سال بعد بھی اس بات کا کوئلہ میرے حافظے میں دہک رہا تھا۔ اس لمحے میں محسوس ہونے والا غصہ اور ناراضگی مجھے اب بھی یاد تھی۔ مارکس نے مجھے ریگی کے سامنے ذلیل کر کے رکھ دیا تھا۔ لیکن اس نے اچھا کیا تھا۔ ہے نا؟ اس نے میرا جھوٹ پکڑا تھا۔ اصل میں دو جھوٹ --- ایک جھوٹ ٹِم کے بارے میں اور دوسرا اپنے بارے میں۔ درحقیقت وہ سارا پہلا سال ایک طویل جھوٹ جیسا لگتا تھا۔ میں نے اپنی ساری توانائی اِدھر اُدھر کے حلقوں میں بھاگنے اور اپنی راہ ڈھونڈنے میں صرف کی۔

ماسوائے ریجینا کے۔ غالباً یہی چیز مجھے ریجینا کی جانب لے گئی...... وہ مجھے جھوٹ کی ضرورت نہیں رہنے دیتی تھی۔ حتیٰ کہ ہماری ملاقات کے پہلے دن ہی اس نے یہ احساس دلا دیا تھا۔ جب وہ کافی شاپ میں آئی اور مجھے مارکس کے ساتھ باتیں کرتے دیکھا۔ مارکس نے ایک [illegible] گھسیٹنے کے لیے تھوڑا سا اٹھتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے اسے بلایا۔

مارکس نے کہا، "ریجینا بہن۔ تم بارک سے ملی ہو، نہیں نا؟ میں بارک کو [illegible] کے متعلق

اس کی پڑھی ہوئی ایک کتاب کے متعلق سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔" اس نے "Heart of Darkness" کی ایک کاپی بطور ثبوت دکھائی۔ میں اسے چھیننے کی خاطر آگے لپکا۔

"یار، اسے دکھانا بند کرو۔"

مارکس بولا: "دیکھا، تم بوکھلا گئے نا--- اس قسم کی کتاب اپنے ساتھ دیکھ لیے جانے پر ہی تمہیں بوکھلاہٹ ہونا شروع ہوئی۔ یار، اس قسم کی چیزیں تمہارے دماغ میں زہر بھر دیں گی۔" اس نے گھڑی دیکھی۔ "لعنت ہے۔ کلاس کا ٹائم ہو گیا۔" وہ آگے جھکا اور ریجینا کی گال پر تھپکی دی۔ "اس بھائی سے بات کرو، ٹھیک ہے؟ میرے خیال میں اسے اب بھی بچایا جا سکتا ہے۔"

ریجینا مسکرائی اور سر ہلا دیا۔ ہم دونوں نے مارکس کو تیز تیز قدموں سے دروازے کی طرف جاتے دیکھا۔ "مارکس آج تبلیغ کے موڈ میں لگتا ہے۔"

میں نے کتاب اپنے بیگ میں ڈالی اور کہا، "دراصل اس نے ٹھیک کہا۔ یہ واقعی ایک نسل پرست کتاب ہے۔ اس کے نقطہ نظر سے افریقہ دنیا کی غلاظت کا گڑھا ہے، سیاہ فام لوگ وحشی ہیں اور ان سے تعلق بھی کسی قسم کا رابطہ انفیکشن میں مبتلا کر دیتا ہے۔"

ریجینا نے اپنی کافی میں پھونک ماری۔ "تو پھر تم کیوں پڑھ رہے ہو اسے؟"

"کیونکہ مجھے اسائنمنٹ دی گئی ہے۔" میں نے کچھ توقف کیا اور بولا، "اور کیونکہ......"

"کیونکہ...."

"اور کیونکہ یہ کتاب مجھے کچھ باتیں سکھاتی ہے۔ میرا مطلب ہے گوروں کے متعلق۔ دیکھو، یہ کتاب حقیقت میں افریقہ یا کالوں کے متعلق نہیں۔ یہ انسان کے بارے میں ہے جو یورپی ہے، امریکی ہے۔ دنیا کو دیکھنے کا ایک مخصوص انداز۔ اگر آپ فاصلہ قائم رکھ سکیں تو یہ سب کچھ موجود ہے، کہا بھی اور ان کہا بھی۔ چنانچہ میں یہ جاننے کے لیے کتاب پڑھ رہا ہوں کہ گورے لوگ اس قدر خوف زدہ کیوں ہیں۔ اس سے مجھے سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ لوگ نفرت کرنا کیسے سیکھتے ہیں۔"

"اور یہ بات تمہارے لیے اہم ہے۔"

میں نے دل میں سوچا کہ میری زندگی کا دارومدار اس پر ہے۔ لیکن یہ بات ریجینا کو نہ بتائی اور صرف مسکرا کر بولا: "کسی مرض کے علاج کا ایک ہی طریقہ ہے نا؟ اس کی تشخیص کرنا۔"

جواباً وہ بھی مسکرائی اور کافی کا گھونٹ بھرا۔ میں پہلے بھی اسے آس پاس دیکھ چکا تھا۔ وہ عموماً

لائبریری میں کتاب لیے بیٹھی ہوتی ...... بڑی سی کالی عورت جو سٹاکنگز اور گھر کے سلے ہوئے کپڑے پہنتی، بڑے سائز کا چشمہ لگاتی اور ہمیشہ سر پہ سکارف لیے رکھتی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ایک جونیئر ہے، اس نے سیاہ فاموں کے پروگرام منعقد کرنے میں مدد دی، زیادہ گھومنے پھرنے نہیں جاتی۔ اس نے یونہی کافی میں چمچ ہلایا اور پوچھا، "مارکس نے ابھی ابھی تمہیں کس نام سے پکارا تھا؟ کوئی افریقی نام تھا نا؟"

"میں سمجھی کہ تمہارا نام باری ہے۔"

"گھر والوں نے میرا نام بارک رکھا تھا۔ یہ میرے باپ کا نام ہے۔ وہ کینیا سے تھا۔"

"کیا اس کا کوئی مطلب ہے؟"

"عربی میں اس کا مطلب رحمت یا فتح بنتا ہے۔ میرا دادا مسلمان تھا۔"

ریجینا نے یہ نام دہرایا، جیسے صوتی تاثر کو آزما رہی ہو۔ "بارک۔ یہ خوب صورت نام ہے۔" وہ میز پر آگے کو جھکی، "تو ہر کوئی تمہیں باری کیوں کہتا ہے؟"

"شاید عادتاً۔ میرا باپ جب سٹیٹس میں آیا تھا تو اس نے یہ نام استعمال کیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس نے خود یہ نام سوچا تھا یا کسی اور نے۔ شاید باری کو پسند کرنے کی وجہ اسے بولنے میں آسانی تھی۔ اس پر یہ بہت مناسب رہا۔ پھر مجھے بھی باری کہا جانے لگا۔ سو یہ میرے لیے بھی مناسب ہو سکتا ہے۔"

"اگر میں تمہیں بارک کہا کروں تو تم برا تو نہیں مانو گے؟"

میں مسکرا دیا، "اگر تم صحیح تلفظ کے ساتھ کہو تو نہیں مانوں گا۔"

اس نے بے تابی سے اپنا سر ایک طرف کو کیا، اس کا منہ 'ہاہاہے' کے انداز میں کھل گیا اور پھر ہم دونوں ہنسنے لگے۔ ہم نے ساری دوپہر ساتھ گزاری، باتیں کرتے اور کافی پیتے ہوئے۔ اس نے مجھے شکاگو میں گزارے ہوئے اپنے بچپن کے متعلق بتایا...... باپ کی عدم موجودگی، ماں کی جدوجہد، سردیوں میں سرد اور گرمیوں میں بہت گرم رہنے والا فلیٹ۔ اس نے نواحی بلاک کے متعلق بتایا، اور یہ بھی کہ کیسے وہ ماموؤں اور نانا نانی کے ساتھ اتوار کی شامیں کچن میں گزارا کرتے تھے۔ اس کی آواز نے سیاہ فام زندگی کی تصویر کھینچ دی۔ جب ہم اٹھنے لگے تو میں نے ریجینا کو بتایا کہ مجھے اس پر رشک آ رہا ہے۔

''وہ کیوں؟''

''پتا نہیں۔شاید تمہاری یادوں کی وجہ سے۔''

ریجینا نے میری طرف دیکھا اور ہنسنے لگی۔

''اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟''

''اوہ بارک!''اس نے سانس درست کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔''کیا زندگی کچھ بھی نہیں؟میں یہاں بیٹھی تمام وقت خواہش کرتی رہی کہ کاش میں نے ہوائی میں پرورش پائی ہوتی۔''

کتنی عجیب بات ہے کہ صرف ایک گفتگو آپ کو اتنا بدل دیتی ہے۔یا شاید پیچھے مڑ کر دیکھنے پر ہی ایسا لگتا ہے۔ایک سال گزرتا ہے اور آپ کو کچھ مختلف محسوس ہونے لگتا ہے،لیکن آپ کو یقین نہیں ہوتا کہ کیا یا کیوں یا کیسے،لہٰذا آپ کا ذہن کسی ایسی چیز کی جانب رجوع کرتا ہے جو اس کو مختلف شکل دے سکتی ہے:ایک لفظ،ایک نظر یا ایک لمس۔میں جانتا ہوں کہ ایک طویل ظاہری غیر حاضری کے بعد میں نے اس روز ریجینا کے ساتھ دوپہر میں اپنی آواز کو واپس پلٹتے ہوئے محسوس کیا:یہ بعد میں بھی لرزتی ہوئی اور مسخ شدہ رہی۔لیکن دوسرے سال میں داخل ہونے پر میں اسے زیادہ مضبوط،زیادہ مستحکم اور زیادہ مستقل حصہ بنتے محسوس کرسکتا تھا...... میرے آئندہ اور میرے ماضی کے درمیان ایک پل۔

تقریباً اسی دور میں میں divestment مہم میں سرگرم ہوا۔میرے خیال میں اس کا آغاز محض شغل کے طور پر ہوا تھا۔لیکن مہینے گزرنے کے ساتھ ساتھ میں نے خود کو ایک زیادہ بڑے کردار میں پایا۔ میں افریقن نیشنل کانگریس کے نمائندوں کو کیمپس میں تقریر کی دعوت دیتا، یونیورسٹی انتظامیہ کے نام خطوط لکھتا،پمفلٹ چھاپتا،حکمت عملی پر بحث کرتا...... میں نے غور کیا کہ لوگ میری آرا پر کان دھرنے لگے تھے۔اس دریافت نے مجھے الفاظ کا بھوکا بنا دیا۔خود کو چھپانے کے لیے نہیں بلکہ پیغام آگے پہنچا سکنے والے الفاظ۔جب ہم نے ٹرسٹیز کے اجلاس کے لیے ریلی کی منصوبہ سازی شروع کی اور کسی نے تجویز دی کہ میں ابتدا کروں تو میں فوراً مان گیا۔میں نے غور کیا کہ میں بالکل تیار تھا اور لوگوں تک مؤثر انداز میں پہنچ سکتا تھا۔میں نے سوچا کہ میری آواز مجھے دغا نہیں دے گی۔

چلو دیکھتے ہیں۔ریلی سے پہلے کے ان دِنوں میں مَیں کیا سوچ رہا تھا؟ایجنڈا بڑی باریک بینی سے مرتب کیا جا چکا تھا...... مجھے بس چند ابتدائی کلمات کہنا تھے اور اس دوران پیراملٹری یونیفارم میں ملبوس دو سفید فام طلبا سٹیج پر آتے اور مجھے گھسیٹ کر لے جاتے۔ایک قسم کا سٹریٹ تھیٹر،جنوبی افریقہ میں کارکنوں کے لیے صورت حال کو ڈرامائی صورت دینے کا ایک طریقہ۔مجھے تعداد کا علم تھا اور سکرپٹ کی تیاری میں بھی مدد دی تھی۔اپنی تقریر کے چند جملے لکھنے کے لیے بیٹھا تو کچھ واقعہ پیش آیا۔میرے ذہن میں یہ محض دو منٹ کی ایک تقریر سے زیادہ بن گئی۔یہ اب میرے لیے اپنی سیاسی راسخ العقیدگی ثابت کرنے کا ایک انداز نہیں رہ گئی تھی۔مجھے مس ہیفٹی کی کلاس میں اپنے باپ کی آمد کا منظر یاد آیا؛اس روز کوریٹا کے چہرے کے تاثرات یاد آئے؛اپنے باپ کے الفاظ کی بدل کر رکھ دینے والی قوت ذہن میں تازہ ہوگئی۔میں نے خود سے کہا کہ کیا میں درست الفاظ ڈھونڈ سکوں گا۔درست الفاظ کے ساتھ سب کچھ بدل سکتا تھا...... جنوبی افریقہ، صرف چند میل دور یہودی بستیوں میں بچوں کی زندگیاں،دنیا میں میرا اپنا نازک مقام۔

اسی وجدانی قسم کی حالت میں میں سٹیج پر آیا۔معلوم نہیں کہ میں کتنی دیر وہاں کھڑا رہا۔سامنے چند سو افراد کا بے چین مجمع تھا۔دو طلبا لان میں فرزبی کھیل رہے تھے؛دیگر ایک طرف کو کھڑے تھے اور کسی بھی لمحے لائبریری میں گھسنے کو تیار تھے۔کوئی اشارہ ملنے کا انتظار کیے بغیر میں مائیکروفون کے سامنے چلا گیا۔

''ایک جدوجہد جاری ہے،''میں نے کہا۔میری آواز بمشکل ہی پہلی چند قطاروں سے آگے جا سکی۔چند لوگوں نے اوپر دیکھا اور میں نے مجمعے کے خاموش ہونے کا انتظار کیا۔

''میں نے کہا ہے کہ ایک جدوجہد جاری ہے!''

فرزبی کھیلتے ہوئے لڑکے رک گئے۔

''یہ جدوجہد سمندر کے اس پار ہو رہی ہے۔لیکن یہ جدوجہد ہم میں سے ہر ایک کے ساتھ مربوط ہے۔چاہے ہمیں معلوم ہو یا نہ ہو۔چاہے ہم اس کے خواہش مند ہوں یا نہ ہوں۔ایک جدوجہد جو ہم سے کوئی ایک راہ منتخب کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔کالے یا گورے اور امیر یا غریب میں سے ایک کو چننا نہیں۔نہیں...... یہ اس سے کہیں زیادہ سخت انتخاب ہے۔یہ وقار اور غلامی میں سے ایک کا انتخاب ہے۔انصاف اور ناانصافی،راسخ عزم اور بے تعلقی کے درمیان انتخاب۔

درست اور غلط میں سے ایک کا انتخاب.....''

میں رک گیا۔ اب مجمع خاموشی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

کسی نے تالیاں بجانا شروع کیں۔ ''جاری رکھو، بارک،'' کسی نے چلا کر کہا، ''جو ہے کہہ دو۔'' پھر باقی لوگ بھی چیخنے اور تالیاں بجانے لگے۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ میرے اور ان کے درمیان رابطہ قائم ہو گیا تھا۔ میں نے مائیک ہاتھ میں پکڑا اور آگے بڑھنے والا ہی تھا کہ مجھے پیچھے سے دو ہاتھ خود کو جکڑتے ہوئے محسوس ہوئے۔ یہ سب ہمارے منصوبے کا حصہ تھا۔ اینڈی اور جوناتھن کالے چشمے لگائے ہوئے اور کرخت چہرہ بنائے مجھے سٹیج سے نیچے گھسیٹنے لگے۔ منصوبے کے مطابق مجھے مزاحمت کرنا تھی۔ میں واقعی وہاں ٹھہرنا اور لوگوں کے درمیان اپنی گونجتی ہوئی آواز سننا چاہتا تھا۔ کہنے کو بہت کچھ رہ گیا تھا۔

لیکن میرا کردار ختم ہو چکا تھا۔ میں ایک طرف کھڑا ہوا تھا جب مارکس سٹیج پر چڑھا اور مائیک تک گیا۔ اس نے سامعین کو بتایا کہ ابھی ابھی انہوں نے کیا دیکھا تھا، جنوبی افریقہ کے مسئلے پر حکومت کی ٹال مٹول کیوں ناقابل قبول تھی۔ پھر ریجینا نے اٹھ کر تائید کی اور بتایا کہ اس کے گھر والے اسے کالج میں دیکھ کر کتنے فخر مند تھے اور اب وہ جاننے کے بعد کتنی شرم محسوس کرتی تھی کہ یہ ادارہ استحصال کے ذریعے کمائے ہوئے منافعوں کی بدولت سہولیات فراہم کر رہا تھا۔ مجھے ان دونوں پر فخر کرنا چاہیے تھا؛ انہوں نے بلیغ انداز اپنایا، اور آپ مجمعے پر اثر ہوتے دیکھ سکتے تھے۔ لیکن اب میں کچھ بھی نہیں سن رہا تھا۔ میں دوبارہ باہر آ چکا تھا...... دیکھتے، سوچتے، شک کرتے ہوئے۔ فرزبی کھیلنے والے لڑکے دوبارہ کھیل میں مصروف ہو گئے تھے۔

اس رات پارٹی میں ریجینا میرے پاس آئی اور مبارک دی۔ میں نے مبارک کی وجہ پوچھی۔

''اس زبردست تقریر کے لیے۔''

میں نے بیئر کی بوتل کا کارک کھولا۔ ''وہ تو بہت مختصر سی تھی۔''

ریجینا نے میری بات کو نظر انداز کر دیا اور بولی: ''اسی لیے تو وہ اتنی مؤثر ثابت ہوئی۔ بارک تم نے اپنے دل کی بات کہی۔ اس کی وجہ سے لوگ مزید سننے کے خواہش مند تھے۔ جب انہوں نے تمہیں پیچھے کھینچا تو یوں لگ رہا تھا جیسے......''

میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''دیکھو ریجینا۔ تم ایک بہت نفیس خاتون ہو۔ اور مجھے خوشی ہے کہ

آج میری مختصر سی کارکردگی تمہیں پسند آئی۔ لیکن آج کے بعد تم کبھی مجھے تقریر کرتے نہیں دیکھو گی۔ میں یہ تبلیغ کا کام تمہارے اور مارکس کے سپرد کرتا ہوں۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ سیاہ فاموں کے حق میں بولنے سے اب میرا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔''

''اس کی کیا وجہ ہے؟''

میں نے بیئر کا گھونٹ بھرا۔ میری نظریں سامنے ڈانسرز پر گھوم رہی تھیں۔ ''کیونکہ میرے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں، ریجینا۔ مجھے یقین نہیں کہ ہمارے آج والے طریقہ کار سے کوئی فرق پڑے گا۔ محض الفاظ سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ سو میں ایسا کیوں ظاہر کروں؟ میں تمہیں اس کی وجہ بتاتا ہوں۔ اس لیے کہ یہ چیز مجھے اپنی اہمیت کا احساس دیتی ہے، کیونکہ مجھے واہ واہ کروانا پسند ہے۔ یہ چیز مجھے ایک گھٹیا سا جوش دیتی ہے۔ بس۔''

''تم اس بات کو دل سے نہیں مانتے۔''

''میں مانتا ہوں۔''

اس نے حیران ہو کر میری جانب گھورا اور جاننے کی کوشش کی کہ آیا میں اس کی ٹانگ کھینچ رہا تھا۔ آخر کار وہ بولی، ''ٹھیک ہے۔ شاید تم نے مجھے بے وقوف بنایا ہو گیا۔ مجھے لگتا تھا کہ میں کسی شخص کو اپنے دل کی بات کہتے سن رہی ہوں۔ لیکن شاید میں احمق ہوں۔''

میں نے بیئر کی ایک اور چسکی بھری اور دروازے میں سے اندر آتے ہوئے کسی شخص کی طرف ہاتھ ہلایا۔ ''ریجینا تم احمق نہیں، سادہ ہو۔''

وہ کولہوں پہ ہاتھ رکھے ایک قدم پیچھے ہٹی۔ ''سادہ؟ تم مجھے سادہ کہہ رہے ہو؟ اونہہ۔ میں تو ایسا نہیں سمجھتی۔ اصل میں تم خود سادہ ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ خود سے فرار پا لو گے۔ تمہارا خیال ہے کہ تم اپنے محسوسات سے گریز کر سکتے ہو۔'' اس نے اپنی انگلی میری چھاتی میں چبھوئی۔ ''تم جاننا چاہتے ہو کہ تمہارا اصل مسئلہ کیا ہے؟ تم ہمیشہ اپنے حوالے سے سوچتے ہو۔ تم بھی بالکل ریگی اور مارکس اور سٹیو اور یہاں کے تمام بھائیوں جیسے ہو۔ ریلی تمہارے لیے تھی۔ تقریر تمہارے متعلق تھی۔ چوٹ ہمیشہ تمہاری چوٹ ہوتی ہے۔ میں تمہیں بتاتی ہوں، مسٹر اوباما۔ اس سب کا تعلق صرف تم سے ہی نہیں۔ ہرگز نہیں۔ اس کا تعلق ان لوگوں سے ہے جنہیں تمہاری مدد چاہیے۔ ان بچوں سے جو تم پر منحصر ہیں۔ انہیں تمہارے طنز یا تمہاری شائستگی یا انا کے مجروح ہونے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اور نہ

ہی مجھے ہے۔"

ابھی اس نے اپنی بات مکمل ہی کی تھی کہ ریگی مجھ سے بھی زیادہ دھت حالت میں کچن سے باہر آیا۔ وہ جھول رہا تھا اور اپنی بازو میرے کندھے پر ڈالتے ہوئے بولا، "اوباما! زبردست یار!" اس نے ریجینا کی طرف دیکھا، "ریجینا، میں تمہیں بتاتا ہوں۔ اوباما اور میں بہت پرانے واقف ہیں۔ ہماری پارٹیاں پچھلے سال ہی ہو جانی چاہیے تھیں۔ یار تمہیں وہ وقت یاد ہے جب ہم نے چھٹی کا سارا دن اکٹھے گزارا تھا؟ چالیس گھنٹے، سوئے بغیر۔ ہفتے سے لے کر سوموار تک۔"

میں نے موضوع بدلنے کی کوشش کی، لیکن ریگی بہکا ہوا تھا۔ "میں تمہیں بتاتا ہوں ریجینا۔ بڑا مزہ آیا۔ سوموار کی صبح کو جب نوکرانیاں آئیں تو ہم ہال میں ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ ہر طرف بوتلیں اور سگریٹوں کے ٹکڑے بکھرے تھے....." ریگی میری طرف مڑا اور ہنسنے لگا۔ بیئر چھلک کر قالین پر گری۔ "تمہیں وہ سب یاد ہے نا یار؟ اتنا گند بکھرا ہوا تھا کہ ان دونوں میکسیکی عورتوں نے رونا شروع کر دیا۔ ہمارا تو دماغ ہی خراب ہو گیا تھا......"

میں ہلکا سا مسکرایا اور محسوس کیا کہ ریجینا مجھے تیز نظروں سے گھور رہی تھی۔ آخر کار وہ یوں بولی جیسے ریگی وہاں موجود ہی نہ ہو۔

"تم اس سب کو مذاق سمجھتے ہو؟" اس کی آواز لرز رہی تھی۔ "بارک! کیا تمہاری نظر میں یہی اصل حقیقت ہے۔ گند مچانا تاکہ دوسرے صاف کریں؟ تمہیں پتا ہے کہ وہ میری دادی بھی ہو سکتی تھی۔ اس نے زیادہ تر زندگی دوسروں کا ڈالا ہوا گند صاف کرنے میں گزاری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جن لوگوں کے لیے وہ کام کرتی تھی ان کی نظر میں بھی یہ سب کچھ ایک مذاق تھا۔"

اس نے جھپٹ کر اپنی کافی ٹیبل سے پرس اٹھایا اور دروازے کی جانب لپکی۔ میں نے اس کے پیچھے بھاگنے کے متعلق سوچا، لیکن غور کیا کہ چند لوگ میری جانب گھور رہے تھے اور میں کوئی منظر نہیں بنانا چاہتا تھا۔ ریگی نے میرے بازو سے پکڑ کر کھینچا۔ وہ گڑبڑایا ہوا اور دکھی لگ رہا تھا۔

"اسے کیا ہو گیا ہے؟" اس نے کہا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے ریگی کے ہاتھ سے بیئر لی اور بک شیلف کے اوپر رکھ دی۔ "وہ صرف ایسی چیزوں پر ایمان رکھنا چاہتی ہے جو موجود ہی نہیں۔"

میں صوفے سے اٹھا اور سامنے والا دروازہ کھولا، جمع شدہ دھواں کمرے میں کسی روح کی طرح میرے پیچھے پیچھے آیا۔ اوپر آسمان پر چاند نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ بس بادلوں میں اس کی روشنی کا ایک ہالہ سا دکھائی پڑ رہا تھا۔ آسمان روشن ہونے لگا، ہوا میں شبنم کا ذائقہ محسوس ہوا۔

کوئی حتمی رائے دینے سے پہلے اپنے اوپر نظر ڈالو۔ اپنا ڈالا ہوا گند دوسروں کے صاف کرنے کے لیے مت چھوڑو۔ یہ صرف آپ سے ہی متعلق نہیں۔ یہ بہت سیدھی سادی باتیں تھیں جنہیں کتابوں، ٹیلی ویژن ڈراموں، کتابوں، نانا نانی کی گفتگو وغیرہ میں بارہا سن اور پڑھ چکا تھا۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ میں نے ایک خاص نکتے سے آگے غور کرنا چھوڑ دیا تھا۔ میں اپنے زخموں کو ہی چاٹنے میں مصروف تھا اور گوری حاکمیت کے لگائے ہوئے خیالی پھندوں سے فرار پانے کا بے قرار تھا۔

مگر اب میں وہی باتیں ان کالوں سے بھی سن رہا تھا جن کی میں عزت کرتا تھا، ایسے لوگ جن کے پاس میرے مقابلے میں کہیں زیادہ کٹھور پن کے بہانے موجود تھے۔ وہ مجھ سے پوچھتے: تمہیں کس نے بتایا ہے کہ ایمان داری صرف گوروں کا خاصا ہے؟ تم نے یہ چیزیں کہاں سے سیکھ لیں کہ تمہاری حالت تمہیں پرفکر یا ہوشیار یا مہربان بننے سے مستثنیٰ قرار دے دیتی ہیں یا اخلاقیات کا کوئی رنگ ہوتا ہے؟ بھائی، تم اپنی راہ بھول بیٹھے ہو۔ اپنے بارے میں تمہارے خیالات -- کہ تم کون ہو اور کیا بن سکتے ہو...... خفیف اور پست ہو گئے ہیں۔

میں دروازے کی چوکھٹ میں بیٹھ گیا اور سر کی پچھلی جانب کھجایا۔ یہ سب کیسے ہو گیا تھا؟ میں نے خود سے سوال کرنا شروع کیا، لیکن میرے ذہن میں سوال اٹھنے سے پہلے ہی میں جواب مل گیا تھا۔ خوف۔ وہی خوف جس کے تحت میں نے گرامر سکول میں کوریٹا کو پیچھے دھکیلا تھا۔ وہی خوف جس نے مجھے ٹم کو مارکس اور ریگی کے سامنے ذلیل کرنے پر مائل کیا۔ متواتر رینگتا ہوا خوف کہ میں بے تعلق ہوں، کہ کوئی کرتب دکھانے، اپنا آپ چھپانے یا کچھ اور بن کر دکھانے کے بغیر میں ہمیشہ ایک اجنبی رہوں گا...... گوروں اور کالوں سب کے لیے۔

سو ریجینا نے درست کہا تھا؛ میں صرف اپنے متعلق سوچتا تھا۔ میرا خوف، میری ضروریات۔ اور اب؟ میں نے ریجینا کی دادی کو کسی جگہ کمر جھکائے فرش کی صفائی کرتے تصور کیا۔ آہستہ آہستہ بوڑھی عورت اپنا سر اٹھا کر میری طرف دیکھتی اور اس کے تھکن زدہ چہرے میں مجھے وہ چیز دکھائی دی

جو ہم دونوں کو اکٹھا باندھتی تھی، کسی غصے یا مایوسی یا رحم کے بغیر۔

تو وہ مجھ سے کیا مطالبہ کر رہی تھی؟ زیادہ تر مستحکم ارادہ۔ اس طاقت کے خلاف عزم جو اسے سیدھا کھڑا ہونے کی بجائے جھکائے رکھتی تھی۔ آسان یا فوری کی مدافعت کا عزم۔ اس کی آنکھوں نے کہا کہ آپ کسی اور کی بنائی ہوئی دنیا میں خود کو مقفل کر سکتے ہیں، لیکن پھر بھی آپ اس کی تشکیل پر ایک دعویٰ رکھتے ہیں۔ پھر بھی آپ کے اوپر ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔

بوڑھی عورت کا چہرہ میرے ذہن سے تحلیل ہو گیا، مگر اس کی جگہ یکے بعد دیگرے کئی چہرے آئے۔ کوڑا سمیٹتی ہوئی میکسیکی نوکرانی کا تانبے جیسا چہرہ۔ لولو کی ماں کا دکھ زدہ چہرہ جو اپنے گھر کو ڈچ کے ہاتھوں جلتے ہوئے دیکھ رہی ہے۔ توت کا مقفل ہونٹوں والا سفید چہرہ جو صبح ساڑھے چھ بجے بس کے انتظار میں کھڑی ہے۔ صرف تخیل کے فقدان نے ہی مجھے ان میں سے ایک کا انتخاب کرنے پر مائل کیا تھا۔ وہ سب نانیاں اور دادیاں مجھ سے ایک ہی بات پوچھتی تھیں۔

شاید میری شناخت کا آغاز میری نسل سے ہو، لیکن یہ بس یہیں پر ختم نہیں ہو سکتی تھی۔

کم از کم مجھے اس بات پر یقین ضرور آ گیا تھا۔

میں مزید کچھ منٹ دروازے میں بے حرکت بیٹھا سورج کو ابھرتے دیکھتا اور ریجینا کو اسی روز کال کرنے کے متعلق سوچتا رہا۔ میرے پیچھے بلی اپنا آخری گیت گا رہی تھی۔ میں نے کچھ بول گنگنائے۔ اب مجھے اس کی آواز کچھ مختلف لگی۔ دکھ کی تہوں والی اور میں نے پھڑپھڑاتے قہقہے کے نیچے ایک تحمل کی آمادگی سنی۔

ജ്ഞ

چھٹا باب

صادق پاکستانی

میں نے مین ہیٹن میں اپنی پہلی رات ایک بغلی گلی میں گچھا مچھا ہو کر گزاری۔ ایسا جان بوجھ کر نہیں کیا تھا؛ لاس اینجلس میں ہی قیام کے دوران میں نے سنا تھا کہ میرے ایک دوست کی دوست ہسپانوی ہارلیم، نزد کولمبیا میں اپنا اپارٹمنٹ چھوڑ رہی ہے اور نیو یارک کی رینٹل اسٹیٹ مارکیٹ کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے جلد از جلد وہاں پہنچ کر قبضہ کر لینا چاہیے۔ باہمی اتفاق رائے ہو گیا؛ میں نے بذریعہ تار پیشگی اطلاع کر دی کہ میں اگست کی فلاں تاریخ کو پہنچوں گا؛ اور ایئر پورٹ، سب وے، ٹائمز سکوائر اور براڈ وے تا ایمسٹرڈم تک اپنا سامان گھسیٹنے کے بعد میں رات دس بجے سے چند منٹ اوپر دروازے پر کھڑا تھا۔

میں نے بار بار گھنٹی کا بٹن دبایا، مگر کوئی جواب نہ آیا۔ گلی خالی تھی، دونوں طرف کی عمارتیں کرائے پر تھیں۔ آخر کار ایک پورٹو ریکی عورت عمارت سے نکلی، مجھ پر نظر ڈالی اور پھر گلی کی طرف بڑھ گئی۔ میں تیزی سے آگے بڑھا تاکہ دروازہ بند ہونے سے پہلے ہی اندر گھس جاؤں۔ میں نے اپنا سامان اندر کھینچا، بالائی منزل پر گیا اور دستک دی؛ پھر دونوں ہاتھوں سے دروازہ پیٹا۔ جواب ندارد۔

نیو یارک بالکل ویسا تھا جیسا میں نے اسے تصور کیا تھا۔ میں نے اپنا بٹوہ چیک کیا اتنی رقم نہیں تھی کہ کسی موٹل میں جا سکتا۔ نیو یارک میں صرف ایک شخص میرا واقف تھا صادق نامی ایک لڑکا جو مجھے لاس اینجلس میں ملا تھا لیکن اس نے بتایا تھا کہ وہ ساری رات کسی بار میں کام کرتا تھا۔ انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ میں اپنا سامان واپس نیچے لے گیا اور اس کے اوپر بیٹھ

گیا۔ پچھلی جیب سے وہ خط نکال کر پڑھنے لگا جو لاس اینجلس چھوڑتے وقت ساتھ لیا تھا۔

پیارے بیٹے،

اتنے عرصے بعد تمہاری خیر خبر ملنے پر بہت خوشی ہوئی۔ میں ٹھیک ہوں اور سب کچھ بالکل ٹھیک جا رہا ہے۔ میں ایک سرکاری کام کے سلسلے میں لندن گیا تھا اور ابھی ابھی واپس پہنچا ہوں۔ درحقیقت بہت زیادہ سفر کرنے کی وجہ سے ہی تمہیں خط لکھنے کا موقع نہیں ملتا۔ بہرحال، اب امید ہے کہ کچھ فرصت نکال لیا کروں گا۔

تمہارے بہن بھائی خوش ہیں۔ اس اعتبار سے تمام بہن بھائی ٹھیک ہیں اور تمہیں سلام کہہ رہے ہیں۔ میری طرح وہ بھی گریجوایشن کے بعد تمہاری وطن واپسی کے فیصلے کو سراہتے ہیں۔ جب تم آؤ گے تو ہم مل کر فیصلہ کریں گے کہ تمہیں کتنا عرصہ ٹھہرنا ہے۔ بالکل، چاہے تم چند دن کے لیے ہی آؤ، مگر اہم چیز یہ ہے کہ تم اپنے لوگوں کو جانتے ہو، اور یہ بھی کہ تمہیں اپنے اصل وطن کا علم ہے۔

اپنا خیال رکھنا اور ماں، توت اور سٹینلے کو میرا سلام بولنا۔ تمہارے جلد جواب کی امید رکھتا ہوں۔

پیار

تمہارا ڈیڈ

میں نے خط کو تہہ کر کے واپس جیب میں رکھ لیا۔ باپ کو خط لکھنا آسان کام نہیں تھا؛ ہماری خط و کتابت گزشتہ چار برس کے دوران تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ درحقیقت میں بار بار خط لکھتا اور ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتا تھا۔ مجھے موزوں انداز اور تحریک نہیں مل رہی تھی۔ ''ڈیئر فادر''، ''ڈیئر ڈیڈ''، ''ڈیئر ڈاکٹر اوباما'' اور اب اس نے مجھے خط بھیجا تھا، خوشی سے بھرپور اور پرسکون۔ اس نے تلقین کی تھی کہ اپنے اصل وطن کو یاد رکھوں۔ اس کے انداز سے یہ بہت سادہ سی بات لگتی تھی -- کہ جیسے یہ محض نام پتا بتانے کا معاملہ ہی ہو۔

شاید اس کے لیے یہ واقعی اتنا معاملہ تھا۔ میں نے اپنے باپ کو نیروبی میں اپنے ڈیسک پر

بیٹھے تصور کیا۔ وہ ایک بڑا سرکاری افسر تھا اور آس پاس کلرک کاغذات پر دستخط کروانے کے منتظر تھے۔ ایک وزیر اسے کال کر کے مشورہ مانگ رہا تھا۔ گھر میں ایک خوب صورت بیوی اور بچے منتظر تھے۔ اس کا آبائی گھر صرف ایک دن کی مسافت پر تھا۔ اس خیال نے مجھے مبہم سا خفا کیا، اور میں اسے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر یہ خیالات دل کی دھڑکن کی طرح بار بار آ جاتے۔ میرا تعلق کہاں سے تھا؟ اس رات کو ریجینا کے ساتھ میری گفتگو نے شاید میرے اندر تبدیلی کو تحریک دلائی اور نیک خواہشات کو بیدار کیا۔ لیکن کسی تھکے ماندے شرابی کے مانند میں جلد ہی اپنے نئے عزم کو تحلیل ہوتے محسوس کرنے لگا۔ گریجوایشن میں دو سال باقی تھے، اور مجھے ابھی تک اندازہ نہیں تھا کہ میں اپنی زندگی کا کیا کروں گا، یا حتیٰ کہ کہاں زندگی گزاروں گا۔ ہوائی بچپن کے سپنوں کی طرح پیچھے رہ گیا تھا۔ اب میں وہاں رہنے کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ چاہے میرا باپ کچھ بھی کہتا، لیکن میں جانتا تھا کہ افریقہ کو اپنا وطن قرار دینے کا وقت گزر چکا تھا۔ اور میں خود کو اب صرف سیاہ فام امریکی سمجھتا تھا، اور یہ تفہیم راسخ ہو چلی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے ایک برادری کی ضرورت تھی جو سیاہ فام دوستوں والی مشترکہ مایوسی سے زیادہ گہری ہو۔ کوئی ایسی جگہ جہاں میں اپنے خدشات سر سے اتار کر اپنے عزائم کو پرکھ سکوں۔

چنانچہ جب میں نے آکسیڈینٹل کالج اور کولمبیا یونیورسٹی کے درمیان تبادلے کے ایک پروگرام کے متعلق سنا تو فوراً درخواست دے دی۔ میں نے سوچا کہ اگر کولمبیا میں سیاہ فام طلبا کی تعداد آکسیڈینٹل کالج کی نسبت کم بھی ہوئی تو کم از کم میں شہر کے قلب میں تو رہوں گا اور سیاہ فاموں کی بستیاں بھی وہاں سے قریب ہوں گی۔ لاس اینجلس میں زیادہ کچھ نہیں تھا کہ جو میری راہ روکتا۔ اس برس میرے زیادہ تر دوست گریجوایشن کر لیتے: حسن واپس لندن میں اپنے اہل خانہ کے پاس، ریجینا ہسپانوی جپسیوں پر تحقیق کے لیے اندلسیہ کی جانب۔

اور مارکس؟ مجھے یقینی طور پر علم نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا۔ اس کا ایک اور سال باقی تھا، لیکن جونیئر ایئر کے دوران اس پر کوئی افتاد آن پڑی۔ مجھے کچھ کچھ اندازہ تو ہو گیا تھا۔ ایک شام کو ہم لائبریری میں بیٹھے تھے جب اس نے سکول چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ ایک زیادہ عمر کا ایرانی طالب علم میز کی دوسری طرف بیٹھا تھا۔ اس نے مارکس کو غلامی کی معاشیات کے موضوع پر ایک کتاب

پڑھتے دیکھا۔ وہ آگے جھکا اور مارکس سے کتاب کے متعلق پوچھا۔

"کیا تم مجھے بتاؤ گے کہ تمہارے خیال میں اتنے طویل عرصہ تک غلامی جائز کیوں رہی؟"

"گورے لوگ ہمیں انسان نہیں سمجھتے۔ بس اتنی سی بات ہے۔ ان میں سے زیادہ تر اب بھی نہیں سمجھتے،" مارکس نے جواب دیا۔

"ہاں، وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن میرا پوچھنے کا مقصد یہ ہے کہ سیاہ فام لوگ لڑے کیوں نہیں؟"

"وہ لڑے تھے۔ نیٹ ٹرنر، ڈنمارک ویسکی......"

ایرانی نے بات کاٹی، "غلام بغاوتیں۔ ہاں، میں نے ان کے متعلق کچھ پڑھا ہے۔ وہ بہت بہادر لوگ تھے۔ لیکن ان کی تعداد بہت کم تھی۔ اگر میں ایک غلام ہوتا اور ان لوگوں کو اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ یہ سب کچھ کرتے دیکھتا...... تو میں موت کو ترجیح دیتا۔ یہی چیز میری سمجھ میں نہیں آتی...... اتنی زیادہ تعداد میں ہونے کے باوجود یہ انسان لڑے کیوں نہیں۔ تادم مرگ، ہے نا؟"

میں نے جواب کے انتظار میں مارکس کی جانب دیکھا۔ لیکن وہ خاموش رہا۔ اس کی نگاہیں میز کی سطح پر کسی جگہ ٹکی ہوئی تھیں۔ اس کی لاجوابی نے مجھے پریشان کیا، لیکن میں میدان میں کودا اور ایرانی سے پوچھا کہ کیا وہ ان ہزاروں لوگوں کے نام جانتا ہے جو بحری جہاز امریکی ساحلوں پر پہنچنے سے پہلے ہی سمندر میں کود کر شارکس کا لقمہ بن گئے؟ کیا وہ جہازوں کے لنگر انداز ہونے کے بعد بھی موت کو ترجیح دیتے حالانکہ انہیں پتا ہوتا کہ یہ چیز عورتوں اور بچوں کو مزید مصیبتوں سے دوچار کرے گی۔ کیا کچھ غلاموں کی ملی بھگت ان چند ایرانیوں کی خاموشی سے مختلف تھی جو آرام سے کھڑے رہے اور ساواک بدمعاشوں کو شاہ مخالف لوگوں کی قتل و غارت کرتے دیکھتے رہے؟ خود کو دوسروں کی جگہ پر رکھے بغیر ہم ان پر کوئی حتمی رائے کیسے دے سکتے تھے؟

لگتا تھا کہ آخری جملے نے اسے متزلزل کر دیا اور مارکس نے بھی دوبارہ بحث میں شامل ہوتے ہوئے میلکم ایکس کے پرانے جملے بولے۔ لیکن وہ اپنے الفاظ کا قائل نہیں لگ رہا تھا۔ چند منٹ بعد وہ ایک دم کھڑا ہوا اور دروازے کی جانب چل دیا۔

مارکس اور میں نے پھر کبھی اس گفتگو کا ذکر نہ کیا۔ شاید اس سے کوئی وضاحت نہیں ہوتی تھی؛ آکسیڈینٹل جیسی کسی جگہ پر مارکس جیسے کسی شخص کو پریشان کرنے والی کافی وجوہ موجود تھیں۔ آنے

والے مہینوں میں میں اس کے اندر تبدیلی محسوس کرنے لگا۔ ابتدا میں وہ نسلی تفاخر کا اظہار زیادہ کھل کر کرنے لگا۔ بعد میں وہ کم آمیز ہو گیا۔ اس نے شیو کرنا چھوڑ دی اور بال بھی بڑھا لیے۔

انجام کار اس نے مجھے بتایا کہ وہ سکول سے کچھ عرصہ کی رخصت لے رہا ہے۔ اس نے کہا، "میں اس بکواس سے کچھ دیر دور رہنا چاہتا ہوں۔" ہم کومپٹن کے ایک پارک میں سیر کر رہے تھے۔ کچھ دیر چہل قدمی کے بعد ہم ایک درخت تلے بیٹھ گئے۔ مجھے بوریت محسوس ہوئی تو اٹھا اور گوشت فروخت کرتی ہوئی ایک خوب صورت جوان عورت سے چند باتیں کر کے واپس آیا۔ مارکس وہیں کا وہیں بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ بے تاثر، آنکھیں بھنچی ہوئی تھیں۔ مجھے لگا کہ مارکس کو میری اتنی ہی مدد چاہیے جتنی مجھے اس کی، کہ ایک میں ہی جوابات کی تلاش میں نہیں تھا۔

اب میں نے نیویارک کی خالی گلیوں میں نظر ڈالی۔ کیا مارکس جانتا تھا کہ اس کا وطن کہاں ہے؟ کیا ہم میں سے کسی کو بھی یہ بات معلوم تھی؟ باپ، چچا اور دادا کہاں تھے جو ہمارے دل کا بوجھ ہلکا کرتے؟ شفا کار کہاں تھے جو ہمیں احساس شکست سے نجات دلاتے؟ وہ سب وقت کی دھند میں غائب ہو چکے تھے۔ بس ان کی مبہم سی شبیہیں باقی تھیں، اور سال میں ایک بار آنے والے خطوط جو نصیحتوں سے بھرے ہوئے ہوتے......

تقریباً آدھی رات کے وقت میں نے بغلی گلی میں ایک خشک جگہ ڈھونڈی، اپنا سامان رکھا اور اس کے اوپر سو گیا۔ صبح آنکھ کھولی تو ایک مرغی میرے قریب ہی پڑے کوڑے میں چگ رہی تھی۔ گلی کے اس پار ایک بے گھر آدمی عوامی نل پر منہ ہاتھ دھو رہا تھا اور جب میں بھی وہاں گیا تو اسے کوئی اعتراض نہ ہوا۔ اپارٹمنٹ میں ابھی تک کوئی نہیں آیا تھا، لیکن صادق کو کال کی تو اس نے کہا کہ ٹیکسی لے کر اپر ایسٹ سائیڈ میں ایک جگہ پر پہنچ جاؤں۔

وہ گلی میں مجھے ملا-- درمیانہ قد کا ٹھوس بدن پاکستانی جو دو سال قبل لندن سے نیویارک آیا تھا اور اپنی دولت کمانے کی تڑپ کو شہر کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ پایا۔ اس کے سیاحتی ویزہ کی میعاد ختم ہو چکی تھی اور اب وہ غیر قانونی طور پر مزدوری کر کے آمدنی حاصل کرتا تھا۔ اپارٹمنٹ میں داخل ہونے پر میں نے ایک عورت کو دیکھا جو انڈرویئر پہنے کچن کی ٹیبل پر کام کر رہی تھی۔ ایک

طرف ایک شیشہ اور سیفٹی رکھے ہوئے تھے۔

صادق نے کہنا شروع کیا، ''سوفی، یہ باری ہے......''

''بارک،'' میں نے تصحیح کرتے ہوئے اپنے بیگ فرش پر رکھ دیے۔ عورت نے دھیرے سے ہاتھ ہلایا اور پھر صادق کو بتانے لگی کہ اس کے واپس آنے تک وہ چلی جائے گی۔ میں صادق کے پیچھے واپس نیچے گیا اور گلی کے پار ایک یونانی کافی شاپ میں پہنچا۔ میں نے ایک بار پھر اتنی صبح سویرے کال کرنے پر معذرت کی۔

''فکر نہ کرو۔ کوئی بات نہیں۔ وہ پچھلی رات کو کہیں زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔'' صادق نے مینیو پر نظر ڈالی اور ایک طرف رکھ دیا۔ ''سو، تم بتاؤ، باری، اوہ سوری، بارک۔ ہمارے اس خوب صورت شہر میں کیسے آنا ہوا؟''

میں نے وضاحت کرنا چاہی کہ میں سارے موسم گرما کے دوران اپنی جوانی کی بربادی پر غور و فکر کرتا رہا تھا دنیا کی اور اپنی روح کی حالت۔ ''میں کچھ تلافیاں کرنا چاہتا ہوں۔ میں خود کو استعمال میں لانا چاہتا ہوں،'' میں نے کہا۔

صادق نے اپنے کانٹے سے ایک انڈے کی زردی توڑی اور بولا، ''ٹھیک ہے، تم دنیا کو بچانے کے متعلق جو باتیں چاہو کرو، لیکن یہ شہر اس قسم کے تمام اعلیٰ جذبات کو کھا جاتا ہے۔ اُدھر دیکھو۔'' اس نے فرسٹ ایونیو پر چلتے ہوئے ہجوم کی طرف اشارہ کیا۔ ''ہر کوئی نمبر ون کی تلاش میں ہے۔ موزوں ترین کی بقا۔ جبڑے اور پنجہ۔ دوسرے کو دبا کر آگے بڑھ جاؤ۔ میرے دوست! یہ ہے نیویارک۔ لیکن......'' اس نے کندھے اچکائے اور ٹوسٹ میں انڈہ رکھ کر نوالہ بنایا۔ کسے معلوم؟ شاید تم ایک استثنیٰ بن جاؤ۔ اُس صورت میں مَیں تمہیں سلام پیش کروں گا۔''

صادق کی آنکھیں مجھ میں تبدیلی کے کوئی بھی فوری نشانات تلاش کر رہی تھیں۔ اور آنے والے مہینوں میں وہ مجھے مین ہیٹن کی گلیوں میں کسی تجربہ گاہ کے چوہے کی طرح سفر کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب میں سب وے سفر کے دوران اپنی سیٹ کسی بڑی عمر کی عورت کو پیش کرتا، لیکن کوئی بدتمیز نوجوان پہلے ہی سیٹ پر قبضہ کر لیتا تو صادق بمشکل اپنی مسکراہٹ روک پاتا۔ جب میں نے 109th سٹریٹ والا اپارٹمنٹ حرارت کی کمی کی وجہ سے چھوڑا تو اس نے دوبارہ مجھے اپنے پاس

رہنے کی دعوت دی اور ایک موقعہ پر میرے ساتھ ہاؤسنگ کورٹ میں بھی گیا۔

''دانت اور پنجے، بارک۔ یہاں پھرتے ہوئے لوگوں کے متعلق پریشان ہونا چھوڑو اور بس یہ سوچو کہ تم نے ڈگری حاصل کرنے کے بعد کچھ دولت کیسے کمانی ہے۔''

جب صادق کے اپارٹمنٹ کے کرایہ نامہ کی مدت ختم ہو گئی تو وہ میرے پاس آ گیا۔ چند ماہ بہت قریب سے مشاہدہ کرنے پر وہ واقعی میرے اوپر شہر کے کچھ اثرات دیکھنے لگا۔ میں روزانہ تین میل دوڑ لگاتا اور اتوار کے دن فاقہ کرتا۔ کئی سال میں پہلی مرتبہ میں نے خود کو باقاعدہ طور پر مطالعہ میں لگایا اور روزمرہ تاثرات کے علاوہ نہایت خراب قسم کی شاعری بھی اپنی ڈائری میں لکھنے لگا۔ جب بھی صادق مجھ سے کسی بار میں جانے کی بات کرتا تو میں کوئی بہانہ بنا لیتا۔ میرے پاس کام بہت زیادہ اور رقم بہت کم تھی۔ ایک روز کسی بہتر ساتھی کی تلاش میں اپارٹمنٹ سے باہر جاتے وقت اس نے نہایت کٹیلی بات کہی۔

''تم بہت بور ہو گئے ہو۔''

مجھے معلوم تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ البتہ مجھے خود بھی اصل بات کا اندازہ نہیں تھا۔ ایک اعتبار سے میں شہر کے مزاج کے متعلق صادق کی رائے کی توثیق کر رہا تھا۔ شہر کی خوب صورتی، گندگی، شور اور ہر قسم کی زیادتی میرے حواس مختل کر رہی تھی۔ میں اعتدال کا راستہ اپنانے کے سلسلے میں اپنی قابلیت پر یقین نہیں رکھتا تھا۔

میں نے انڈونیشیا میں بدترین غربت دیکھی تھی؛ لاس اینجلس میں اندرون شہر کے لڑکوں کا پرتشدد مزاج دیکھا تھا؛ میں ہر جگہ پر نسلوں کے درمیان شکوک و شبہات دیکھ دیکھ کر ان کا عادی ہو گیا تھا۔ لیکن نیویارک کی گنجان آبادی یا پھر وسعت کی وجہ سے اب ہی میں نے تقریباً کامل درستگی کے ساتھ سمجھنا شروع کیا کہ امریکہ کے نسلی اور طبقاتی مسائل کس طرح باہم گتھے ہوئے تھے۔ مجھے قبائلی جنگوں کی گہرائی اور غضب ناکی کا اندازہ ہوا۔ کولمبیا کے باتھ روم نیگروؤں اور گوروں کے درمیان خوفناک جملے بازی سے بھرے ہوئے تھے۔

یوں سمجھ لیں کہ جیسے تمام درمیانی راہیں ختم ہو گئی تھیں۔ اور میری محبوب سیاہ فام برادری میں یہ انہدام سب سے زیادہ واضح تھا۔ کبھی کبھی میں ہارلیم میں ان جگہوں پر گھومنے پھرنے جاتا جن کے

متعلق سن یا پڑھ رکھا تھا۔ جب شہر میں رہنے والے مختلف لوگوں سے بات چیت کی تو انہوں نے میرے مشاہدات کو بے بنیاد قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ شہر قابو سے باہر ہو گیا تھا، کہ دھڑے بازی ایک بالکل فطری چیز تھی۔ سیاسی بحثیں (جو آکسیڈینٹل کالج میں بڑی بامعنی لگا کرتی تھیں) سوشلسٹ کانفرنسوں کا تاثر دینے لگیں۔ مین ہیٹن کے زیادہ تر متوسط طبقے کے سیاہ فام کی طرح میں بھی سیاسی لگاؤ رکھنے، دوست بنانے اور اپنی زندگی کو منظم کرنے کے لیے آزاد تھا۔ البتہ، مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی مرحلے پر آپ کی منتخب کردہ راہ ناقابل تنسیخ تھی۔ اب خلیج کو پاٹنا ناممکن تھا، اور آپ خود کو ایک لکیر کے پار پاتے جہاں ہونے کی ہرگز خواہش نہیں رکھتے تھے۔

میں ایک سال تک مین ہیٹن کے ایک سے دوسرے سرے تک چہل قدمی کرتے ہوئے راہ منتخب کرنے سے گریزاں رہا۔ کسی سیاح کی طرح میں نے انسانی امکانیت کو دیکھا، اردگرد کے لوگوں کے درمیان اپنے مستقبل کے نقش کھوجنا چاہے، کوئی ایسی درز تلاش کرنے کی کوشش کی جہاں سے واپس اندر آسکتا۔

اسی بے ذوقی کے دنوں میں میری ماں اور بہن نیو یارک میں مجھ سے ملنے آئیں۔

''وہ تو بہت کمزور ہے،'' مایا نے میری ماں سے کہا۔

''اس کے پاس صرف دو تولیے ہیں!'' میری ماں باتھ روم پر نظر ڈالتے ہوئے بولی۔ ''اور تین پلیٹیں!'' دونوں ہنسنے لگیں۔

انہوں نے چند راتیں میرے اور صادق کے پاس گزاریں اور پھر پارک ایونیو میں چلی گئیں جہاں ماں کی ایک دوست نے اسے کچھ دن قیام کی دعوت دی تھی۔ اس موسم گرما میں مجھے ایک تعمیراتی جگہ پر صفائی کا کام مل گیا۔ چنانچہ ماں اور بہن نے اپنا زیادہ تر وقت شہر میں اکیلے گھومتے پھرتے ہوئے گزارا۔ جب ہم کھانے پر ملتے تو وہ مجھے سیر کی ساری کہانی سناتیں۔ میں ان کی باتیں سنتے ہوئے خاموشی سے کھاتا رہتا اور پھر شہر کے مسائل اور محروم لوگوں کی سیاست کے بارے میں طویل تقریر شروع کر دیتا۔ میں مایا پر ناراض ہوا کہ اس نے میرے خریدے ہوئے ناول پڑھنے کی بجائے پوری ایک شام ٹیلی ویژن دیکھنے میں صرف کر دی تھی۔ میں نے اپنی ماں کو

سمجھایا کہ کس طرح غیر ملکی عطیاتی ادارے اور بین الاقوامی تنظیمیں تیسری دنیا میں لوگوں کی خود انحصاری ختم کرنے کے لیے کام کر رہی تھیں۔ جب وہ دونوں کچن میں جاتیں تو مجھے اپنی ماں کی شکایت کرنے کی آواز سنائی دیتی۔

''ویسے باری ٹھیک ہے نا؟ میرا مطلب ہے کہ وہ گلیوں میں گھومتے پھرتے نظر آنے والے خبطی لوگوں جیسا تو نہیں بن گیا۔''

ایک شام کو ''The Village Voice'' رسالہ دیکھتے ہوئے ایک مووی ''Black Orpheus'' کا اشتہار سامنے آیا تو میری ماں کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ماں نے اصرار کیا کہ ہم وہ فلم دیکھنے چلیں اور کہا کہ یہ اس کی زندگی کی پہلی غیر ملکی فلم تھی۔

لفٹ میں داخل ہوتے وقت اس نے ہمیں بتایا، ''تب میری عمر سولہ سال تھی۔ میں نے شکاگو یونیورسٹی میں نیا نیا داخلہ لیا تھا ..... گرامپس نے ابھی اجازت نہ دینے کی بات نہیں کی تھی ...... اور میں گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کے لیے وہاں گئی تھی۔ تب زندگی میں پہلی مرتبہ میں پوری طرح خود مختار ہوئی تھی۔ میں نے خود کو واقعی بالغ محسوس کیا۔ اور جب میں نے یہ فلم دیکھی تو لگا کہ آج تک اس زیادہ خوب صورت چیز نہیں دیکھی تھی۔''

فلم کے زیادہ تر اداکار برازیلی سیاہ فام تھے اور یہ 50ء کی دہائی میں بنائی گئی تھی۔ کہانی بہت سادہ سی تھی: بدنصیب عاشقوں آرفیئس اور یوریڈائس کی داستان۔ ابھی فلم آدھی گزری تھی کہ میں نے اسے چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے مڑ کر ماں کی طرف دیکھا کہ وہ جانے پر آمادہ ہے یا نہیں۔ لیکن سکرین کی روشنیوں میں دمکتا ہوا اس کا چہرہ شوق اور انہماک سے بھرپور تھا۔ اس لمحے مجھے محسوس ہوا کہ میں اس کے دل کی کھڑکی سے اندر جھانک رہا تھا۔

میرے پیچھے مڑ کر دیکھنے کے باعث ماں اور آس پاس کے لوگوں میں ہلچل ہوئی۔ فلم ختم ہونے تک میں مختلف باتیں سوچتا رہا۔ آخر کار اپنی بہن اور ماں کے ہمراہ تھیئٹر سے باہر آیا۔ آئندہ کئی روز تک میں ماں کے ساتھ گفتگو کا کوئی بھی موقعہ پیدا ہونے سے بچتا رہا۔ ان کے واپس جانے سے چند روز قبل ماں نے میرے ہاتھ میں باپ کے نام لکھا ہوا ایک خط دیکھ لیا۔ میں اس سے پوچھنے گیا تھا کہ کیا اس کے پاس کوئی انٹرنیشنل ٹکٹ موجود ہے۔

''تم لوگ ملنے کا پروگرام بنا رہے ہو؟''

جب وہ پرس میں ٹکٹ ڈھونڈ رہی تھی تو میں نے اسے مختصراً اپنے منصوبوں سے آگاہ کیا۔ اس نے واقعی دو ٹکٹ ڈھونڈ نکالے جو گرمی کے باعث آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ ماں نے پانی گرم کرنے کے لیے رکھا تاکہ بھاپ دے کر ٹکٹ علیحدہ کیے جا سکیں۔ وہ کچن میں سے ہی بولی۔

''ٹھیک ہے۔ میرے خیال میں تم دونوں کا ایک دوسرے سے جان پہچان پیدا کرنا اچھی بات ہے۔ نو سالہ لڑکے کے لیے وہ ذرا الگ ثابت ہوا ہوگا، لیکن اب تم بڑے ہو گئے ہو.....''

میں نے کندھے اچکائے ''کیا معلوم؟''

ماں نے گردن باہر نکال کر کہا ''مجھے امید ہے کہ تمہیں اس سے کوئی شکایت نہیں۔''

''مجھے کیوں ہوگی شکایت؟''

''مجھے نہیں پتا۔'' وہ واپس لونگ روم میں چلی گئی۔ چائے کے برتن نے سیٹی بجائی اور میں نے لفافے پر ٹکٹ چسپاں کر دیے۔ تب میری ماں بلاتمہید ایک پرانی کہانی دہرانے لگی۔ وہ خود سے باتیں کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

''پتا ہے، تمہارے باپ کو چھوڑنے کی وجہ اس کی کوئی غلطی نہیں تھی۔ میں نے اسے طلاق دی۔ جب ہم دونوں کی شادی ہوئی تو تمہارے نانا نانی خوش نہیں تھے۔ لیکن انہوں نے ہاں کر دی شاید اس لیے کہ وہ ہمیں روک نہیں سکتے تھے، اور انجام کار انہیں بھی محسوس ہو گیا کہ انہوں نے ٹھیک کیا تھا۔ تب بارک کے باپ، تمہارے دادا حسین نے گرامپس کو ایک طویل خط لکھا اور کہا کہ وہ اس شادی کے حق میں نہیں، وہ نہیں چاہتا تھا کہ اوباما خون ایک گوری عورت کی وجہ سے خراب ہو۔ خیر، تم تصور کر سکتے ہو کہ گرامپس نے کیا ردعمل دیا ہوگا۔ اور تب تمہارے باپ کی پہلی بیوی کا مسئلہ کھڑا ہوا..... اس نے مجھے بتایا تھا کہ ان کی علیحدگی ہو چکی ہے، لیکن یہ دیہی شادی تھی لہٰذا طلاق کی کوئی دستاویز پیش نہیں کی جا سکتی تھی.....''

ماں کی ٹھوڑی تھرکنے لگی اور اس نے اپنا اوپر والا ہونٹ دانتوں سے کاٹتے ہوئے خود کو سنبھالا۔ اس نے کہا، ''تمہارے باپ نے جوابی خط میں کہا کہ وہ خود نمٹ لے گا۔ تب تم پیدا ہوئے اور ہم نے وعدہ کیا کہ اس کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد ہم تینوں واپس کینیا چلے جائیں گے۔

تمہارا دادا حسین اب بھی تمہارے باپ کو خط لکھتا اور اس کا سٹوڈنٹ ویزا منسوخ کروانے کی دھمکی دیتا۔ اُس وقت توت ہسٹیریائی ہو چکی تھی...... اس نے چند سال قبل کینیا میں ماؤ ماؤ بغاوت کے متعلق سنا تھا جسے مغربی پریس نے بہت اچھالا...... اور اسے یقین تھا کہ میرا سر کاٹ ڈالا جائے گا اور تمہیں چھین لیا جائے گا۔

''تب بھی کوئی نہ کوئی صورت نکالی جا سکتی تھی۔ جب تمہارے باپ نے گریجوایشن کی تو اسے سکالرشپس کی دو پیش کشیں ہوئیں۔ ایک پیشکش نیویارک میں نیوسکول اور دوسری ہارورڈ کے لیے تھی۔ نیوسکول نے تمام اخراجات کی ادائیگی پر رضامندی ظاہر کی تھی...... کمرے اور رہائش کا خرچ، کیمپس میں ایک نوکری جس سے ہم تینوں کا گزارا ہو جاتا۔ ہارورڈ نے صرف ٹیوشن فیس کی ادائیگی کا کہا تھا۔ لیکن بارک ایسا ڈھیٹ حرامی تھا کہ اس نے ہارورڈ جانے کی ٹھان لی۔ اس نے کہا کہ وہ بہترین تعلیم کو کیسے ٹھکرا سکتا تھا۔ اس کے ذہن میں بس یہی سوچ تھی، یہ ثابت کرنا کہ وہ بہترین.....''

ماں نے آہ بھری اور اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ ''ہم نوجوان تھے۔ اس وقت میری عمر تمہاری موجودہ عمر سے بھی کم تھی اور وہ مجھ سے چند سال بڑا تھا۔ بعد میں جب وہ ہوائی میں ہم سے ملنے آیا تو ہمیں اپنے ساتھ رکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن اس وقت بھی میں لولو کی بیوی تھی اور تیسری بیوی حال ہی میں اسے چھوڑ کر گئی تھی۔ اور میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ......''

وہ ٹھہری اور اپنے آپ پر ہی ہنسی۔ ''کیا میں نے تمہیں بتایا ہے کہ ہماری پہلی ڈیٹ پر وہ دیر سے پہنچا تھا؟ اس نے مجھے ایک بجے یونیورسٹی کی لائبریری کے سامنے ملاقات کا ٹائم دیا تھا۔ جب میں پہنچی تو وہ نہیں آیا تھا، لیکن میں نے چند منٹ انتظار کرنے کا سوچا۔ دن بہت خوشگوار تھا اور میں وہاں رکھے ایک بنچ پر سو گئی۔ ایک گھنٹہ گزر گیا...... پورا ایک گھنٹہ! تب وہ اپنے دو دوستوں کے ہمراہ آتا دکھائی دیا۔ آنکھ کھلی تو وہ تینوں میرے اوپر کھڑے تھے۔ میں نے تمہارے باپ کو کہتے سنا:

''دیکھا نا یار۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ وہ ایک بہت اچھی لڑکی ہے اور میرا انتظار کرے گی۔''

میری ماں پھر ایک مرتبہ ہنسی اور ایک بار پھر میں نے دیکھا کہ وہ بچیوں جیسی لگ رہی تھی۔ بس اس بار کچھ اور بھی دکھائی دیا: اس کے مسکراتے اور ہلکے سے بوکھلاہٹ زدہ چہرے میں ایک سیانا پن

بھی تھا۔ میری ماں ایک لڑکی تھی جس کے ذہن میں خوب صورت سیاہ فام لوگوں کی فلم تھی، میرے باپ کی توجہ اسے سراہ رہی تھی؛ وہ گڑبڑائی ہوئی اور اکیلی بیٹھی اپنے والدین کی زندگیوں کی جکڑ سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس روز اس میں نظر آنے والی معصومیت، میرے باپ کا انتظار، اس کے اپنے ناقص تصورات، اس کی اپنی ضروریات سے داغ دار تھی۔ لیکن یہ ایک بے سمت ضرورت تھی، اپنے آپ سے بے خبر۔ شاید ہر محبت اسی طرح شروع ہوتی ہے۔ امنگیں اور دھندلے خاکے ہمیں اپنی تنہائی میں سے نکلتے اور تب اگر قسمت اچھی ہو تو ہم انجام کار زیادہ مضبوط بن کر نکلتے ہیں۔ اس روز اپنی ماں سے باپ کے متعلق سنی ہوئی باتیں ایسی باتیں تھیں جو میرا خیال ہے کہ بیشتر امریکی کبھی کسی دوسرے نسل کے فرد کے منہ سے نہیں سنیں گے، لہٰذا گوروں اور کالوں کے درمیان ان باتوں کی موجودگی پر شاید انہیں یقین بھی نہ آئے: کسی ایسے شخص کی محبت جو آپ کی زندگی کو پوری طرح جانتا ہو، ایسی محبت جو مایوسیوں کا نشانہ بننے سے بچ گئی ہو۔ اس نے میرے باپ کو بالکل اسی طرح دیکھا جیسا ہر شخص کم از کم دوسرے کی نظر میں نظر آنا چاہتا ہے۔ اور اس روز ماں کے چہرے کا تاثر مجھے مہینوں بعد بھی یاد رہا جب میں نے کال کر کے اسے بتایا کہ میرا باپ مر گیا ہے اور فون پر اس کے رونے کی آواز سنی۔

ماں سے بات کر لینے کے بعد میں نے بوسٹن میں اپنے چچا کو فون کیا اور ہم نے مختصر سی بے ڈھنگ گفتگو کی۔ میں جنازے پر نہ گیا، اس لیے نیروبی میں اپنے باپ کے گھر والوں کو ایک خط لکھ کر تعزیت کر دی۔ میں نے انہیں جواب دینے کی تاکید کی اور سوچا کہ ان کا کیا حال ہو گا۔ لیکن مجھے کوئی دکھ محسوس نہ ہوا۔ بس ایک موقعہ ہاتھ سے چلے جانے کا مبہم سا احساس تھا۔ مجھے دکھ کا دکھاوا کرنے کی کوئی تک بھی نہ نظر آئی۔ میرے کینیا جانے کا منصوبہ غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی ہو گیا تھا۔

ایک اور سال گزر چکا تھا جب میں اپنے خوابوں کے ایک گوشے میں اس سے کولڈ سیل میں ملا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں بس کے ذریعے دوستوں کے ہمراہ سفر کر رہا تھا۔ ہماری بس گھاس کے ایک میدان اور پہاڑیوں کے درمیان سے گزری۔

ایک بوڑھا فربہ آدمی میرے پہلو میں بیٹھا تھا اور میں اس کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ اپنی بیٹی سے ملنے جا رہا تھا۔

ہم ایک ہوٹل پر رکے...... ایک بڑا سا ہوٹل۔ وہاں لابی میں ایک پیانو تھا اور لاؤنج میں نرم و ملائم صوفے رکھے تھے، اور ایک بوڑھا گورا آدمی پیانو کے سامنے بنچ پر بیٹھا دکھائی دیا۔ جب میں نے دوبارہ دیکھا تو وہ ایک سیاہ فام بچی تھی جس کے پاؤں بمشکل ہی پائیدان تک پہنچ رہے تھے۔ وہ مسکرائی اور پیانو بجانے لگی۔ تب ایک ویٹرس آئی، ایک ہسپانوی عورت، اور اس نے تیوری چڑھا کر ہماری طرف دیکھا، لیکن وہ مسکرا بھی رہی تھی۔ ویٹرس نے اپنی انگلی لبوں پر رکھی کہ جیسے ہم کسی راز میں شریک ہوں۔

میں باقی سفر کے دوران سویا رہا۔ لیکن جب آنکھ کھلی تو آس پاس کوئی بھی نظر نہ آیا۔ بس رک گئی اور میں نیچے اتر کر ایک جگہ پر جا بیٹھا۔ اَن گھڑ پتھر سے بنی ایک عمارت کے اندر کسی وکیل کے دلائل دینے کی آواز آ رہی تھی۔ جج نے کہا کہ شاید میرے باپ نے کافی وقت جیل میں گزار لیا تھا، کہ شاید یہ اس کی رہائی کا وقت تھا۔ لیکن وکیل نے شدید اعتراض کرتے ہوئے مختلف شقوں کا حوالہ دیا۔ جج نے کندھے اچکائے اور بنچ سے اٹھ گیا۔

میں کمرے کے سامنے کھڑا ہو گیا، پیڈ لاک کھولا اور احتیاط سے ایک کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھ دیا۔ میرا باپ میرے سامنے تھا، صرف ایک لنگوٹی میں ملبوس۔ وہ بہت دبلا، بڑے سر اور چوڑے شانوں والا، بے بال بازوؤں اور سینے والا تھا۔ اس کا رنگ زرد دکھائی دیا، اس کی کالی آنکھیں راکھ جیسے چہرے میں چمک رہی تھیں، لیکن اس نے مسکرا کر اشارے سے مجھے بلایا۔

اس نے کہا، ''ذرا خود کو دیکھو۔ اتنے لمبے اور اتنے دبلے۔ حتیٰ کہ سفید بال بھی!'' اور میں نے غور کیا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا، اور اس کے پاس جا کر اسے گلے لگا لیا۔ میں رونے لگا اور شرمندگی محسوس کی، لیکن خود کو روک نہ پایا۔

''بارک، میں ہمیشہ تمہیں یہ بتانا چاہتا تھا کہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے،'' اس نے کہا۔ اب وہ میرے بازوؤں کے حلقے میں کسی بچے جیسا ننھا سا لگ رہا تھا۔

وہ اپنی چارپائی کے کنارے پر بیٹھ گیا اور ٹھوڑی ہاتھوں پہ رکھ کر مجھ سے پرے دیوار کو تکنے

لگا۔اس کے چہرے پر ایک اداسی بکھر گئی۔ میں نے اس کا دل بہلانا چاہا؛ اسے بتایا کہ میں صرف اس کا خیال رکھنے کی وجہ سے اتنا دبلا ہوں۔لیکن اس کا دھیان نہ بٹ سکا، اور جب میں نے سرگوشی میں کہا کہ شاید ہم اکٹھے جا سکتے ہیں تو اس نے اپنا سر ہلایا اور کہا کہ بہتر یہی ہے میں چلا جاؤں۔

آنکھ کھلی تو میرے آنسو بہہ رہے تھے... باپ کے لیے اور اپنے لیے نکلنے والے اولین آنسو۔ یہ آنسو جیلر، جج اور اس کے بیٹے کے لیے بھی تھے۔ مجھے اس سے ہونے والی واحد ملاقات یاد آئی اس کی جانب سے تحفے میں باسکٹ بال ملنا اور مجھے ڈانس سکھانا۔ اور شاید پہلی بار مجھے پتا چلا کہ اس کی عدم موجودگی میں بھی اس کا مستحکم تاثر مجھے ایک سہارا دیے رہا۔

میں کھڑکی تک گیا اور باہر جھانکا، صبح کی اولین آوازیں سنیں......کوڑا اٹھانے والے ٹرکوں کی گڑگڑاہٹ، ساتھ والے اپارٹمنٹ میں قدموں کی چاپ۔ میں نے دل میں سوچا کہ مجھے اسے تلاش کرنے اور اس سے دوبارہ بات کرنے کی ضرورت ہے۔

دوسرا حصہ

شکاگو

ساتواں باب

برادری کی خدمت

1983ء میں میں نے ایک کمیونٹی آرگنائزر بننے کا فیصلہ کیا۔

اس خیال کے پیچھے کوئی لمبی چوڑی بنیاد نہیں تھی؛ میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا تھا جس نے اس طریقے سے زندگی گزاری ہو۔ جب کالج میں ہم جماعتوں نے مجھ سے پوچھا کہ کمیونٹی آرگنائزر کا کیا کام ہوتا ہے تو میں براہ راست کوئی جواب نہ دے سکا۔ اس کے بجائے میں نے تبدیلی کی ضرورت کو اجاگر کیا۔ وائٹ ہاؤس میں تبدیلی، جہاں ریگن اور اس کے ساتھی اب گھناؤنے کام کر رہے تھے۔ بدعنوان کانگریس میں تبدیلی۔ ملک کے خبطی اور لاپروا مزاج میں تبدیلی۔ میں کہتا کہ تبدیلی اوپر سے نہیں بلکہ نیچے سے آتی ہے۔

میں یہی کروں گا۔ میں سیاہ فام ساتھیوں کو منظم کروں گا۔ بہت نچلی سطح پر۔ تبدیلی کے لیے۔

اور میرے گورے و کالے دوستوں نے میرے نظریات کی بھرپور تائید کی۔ پھر میں گریجوایٹ سکول کے نام درخواست پوسٹ کرنے پوسٹ آفس گیا۔

درحقیقت میں انہیں تشکیکی رویہ اختیار کرنے پر ملزم نہیں ٹھہرا سکتا تھا۔ اب پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے میں اپنے فیصلے کے لیے ایک مخصوص منطق تعمیر کر سکتا اور دکھا سکتا ہوں...... کہ کیسے میرا کمیونٹی آرگنائزر بننا اپنے باپ اور پیچھے اس کے باپ، میری ماں اور اس کے والدین، انڈونیشیا میں دیکھے ہوئے فقیروں اور کسانوں کی یادوں، دوستوں کے ساتھ ہونے والی بحثوں، نیویارک منتقلی اور میرے باپ کی موت کے ساتھ منسلک تھا۔ میں دیکھ سکتا ہوں کہ میری منتخب کردہ راہوں کے فیصلے ہمیشہ صرف اور صرف میرے نہیں تھے......اور ہونا بھی یہی چاہیے۔
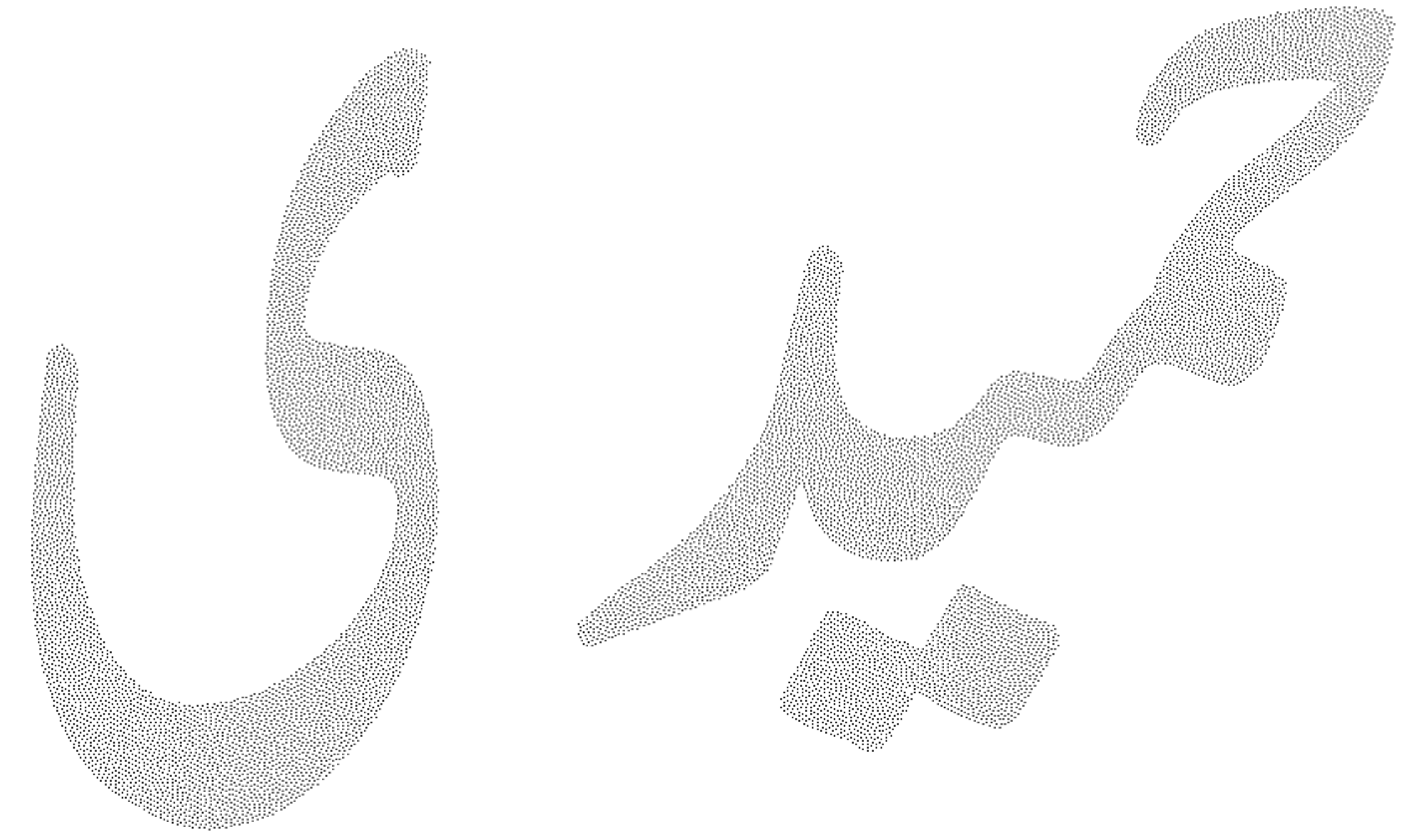
لیکن میں یہ باتیں کافی بعد میں تسلیم کرنے کے قابل ہوا۔ اس وقت، یعنی کالج سے گریجوایشن کے وقت میں زیادہ کچھ اپنی دل کی امنگوں کے تحت کر رہا تھا، جیسے سیلمون مچھلی اپنے تصور میں موجود کسی مقام کی طرف بہاؤ کے الٹے رخ پر اندھا دھند تیرتی ہے۔ میں نے کلاسوں اور سیمیناروں میں ان امنگوں کو کتابوں میں ملنے والے نعروں اور نظریات کا جامہ پہنایا اور...... غلط طور پر...... یہی سوچتا رہا کہ نعروں کا کوئی مطلب ہوتا ہے، کہ انہیں ثابت کر کے دکھایا جا سکتا ہے۔ لیکن رات کے وقت بستر میں لیٹے ہوئے میں ان نعروں کو ذہن سے جھٹک دیتا اور ان کی جگہ نامعلوم ماضی کی شبیہیں اور رومانوی تصورات لے لیتے۔

زیادہ تر مناظر سول حقوق کی تحریک کے ہوتے...... بلیک اینڈ وائٹ اخباری تصاویر جو ہر ماہ فروری میں ''بلیک ہسٹری منتھ'' کے دوران چھپتیں۔ یہ تصاویر میرے لیے ایک قسم کی عبادت بن گئیں۔ ان سے مجھے پتا چلا کہ میں اپنی کاوشوں میں تنہا نہیں، کہ کمیونیٹیز یا انجمنوں کو اس ملک میں بھی پھلنے پھولنے نہیں دیا گیا، کم از کم سیاہ فاموں کی انجمنوں کو تو ہرگز نہیں۔ کمیونیٹیز بنانا، ان کے لیے لڑنا اور ان کی آبیاری کرنا ضروری تھا۔ وہ انسانوں کے خوابوں کی طرح بست و کشاد سے عبارت تھیں...... اور سول حقوق کی تحریک میں وہ خواب بہت بڑے تھے۔ دھرنوں، احتجاجی مظاہروں، جیل میں گائے ہوئے گیتوں میں میں نے افریقی امریکی کمیونٹی کو ایک ایسی جگہ بنتے دیکھا جہاں آپ محض پیدا ہی نہیں ہوئے تھے یا آپ نے محض پرورش ہی نہیں پائی تھی۔ تنظیم سازی اور مشترکہ قربانی کے ذریعے رکنیت ملتی تھی۔ اور چونکہ رکنیت حاصل ہوگئی تھی، اس لیے مجھے یقین تھا کہ وقت گزرنے پر یہ میری زندگی کو ایک نیا رنگ دے گی۔

تنظیم سازی کے بارے میں یہ تھا میرا تصور۔ یہ نجات کا ایک وعدہ تھا۔

چنانچہ گریجوایشن سے پہلے کے چند ماہ کے دوران میں نے سول حقوق کی ہر تنظیم کو اپنے خیالات لکھ بھیجے، ترقی پسند ایجنڈا رکھنے والے ملک کے ہر منتخب اہل کار کو لکھا، پڑوس کی کونسلوں اور حقوق کی جدوجہد کرنے والے گروپس کے نام خط بھیجے۔ کسی کا بھی جواب نہ آنے پر میرا حوصلہ نہ ٹوٹا۔ میں نے ایک سال کے لیے زیادہ روایتی قسم کا کام کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ طالب علمی میں لیے ہوئے قرض چکا سکوں اور شاید کچھ بچا بھی لوں۔ میں نے خود سے کہا کہ مجھے بعد میں رقم کی ضرورت پڑے گی۔ تنظیم سازی کرنے والوں کو رقم نہیں ملتی تھی؛ ان کی غربت ہی ایمان داری کا

ثبوت تھی۔

انجام کار ملٹی نیشنل کارپوریشنز کے لیے کام کرنے والے ایک کنسلٹنگ ہاؤس نے مجھے بطور ریسرچ اسسٹنٹ نوکری دینے کا فیصلہ کر لیا۔ میں ہر روز دشمن کی اگلی صفوں کے پیچھے کسی جاسوس کی طرح دفتر پہنچ کر کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ جاتا اور چیک کرتا کہ رائٹرز مشین دنیا بھر سے آتے ہوئے سفید چمکتے ہوئے پیغامات پرنٹ کر رہی ہے یا نہیں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، میں کمپنی کا واحد سیاہ فام شخص تھا۔ مجھے اس پر بہت شرمندگی ہوتی لیکن کمپنی والوں کے لیے یہ بڑی فخر کی بات تھی۔ سیاہ فام عورتیں میرے ساتھ بیٹے جیسا سلوک کرتیں اور امید ظاہر کرتیں کہ ایک روز میں یہ کمپنی چلا رہا ہوں گا۔ کبھی کبھی لنچ کے دوران میں انہیں تنظیم سازی کے حوالے سے اپنے تمام زبردست منصوبوں کے متعلق بتاتا۔ وہ مسکرا کر کہتیں: ''بہت اچھے، بارک،'' لیکن ان کی آنکھوں کا تاثر مجھے اندر ہی اندر مایوس کرتا۔ صرف لابی میں کھڑا سیاہ فام سکیورٹی گارڈ Ike آ کر بتاتا کہ میں ایک غلطی کر رہا ہوں۔

''تنظیم سازی؟ یہ سیاست کی کوئی قسم ہے نا؟ تم اس قسم کی کوئی حرکت کیوں کرنا چاہتے ہو؟''

میں نے اپنے سیاسی نظریات کی وضاحت کرنا چاہی، غریبوں کو تحریک دلانے اور کمیونٹی کی خدمت کرنے پر روشنی ڈالی۔ لیکن Ike نے اپنا سر ہی ہلایا، ''مسٹر بارک۔ مجھے امید ہے کہ تم میری چھوٹی سی نصیحت کا برا نہیں مناؤ گے۔ تم ابھی میری بات نہیں سمجھو گے، لیکن میں بھی سمجھا کر رہوں گا۔ اس تنظیم سازی کے چکر کو بھول جاؤ اور کوئی ایسا کام کرو جس میں چار پیسے حاصل کر سکو۔ یہ لالچ والی بات نہیں ہے۔ میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کیونکہ میں تمہارے اندر صلاحیت دیکھتا ہوں۔ تم جیسے ہونہار...... اوہ تمہاری آواز۔ تم تو ٹیلی ویژن پر اناؤنسر بھی بن سکتے ہو۔ یا سیلز میں...... میرا تمہاری ہی عمر کا ایک بھتیجا واقعی کافی کما رہا ہے۔ دیکھو! اسی چیز کی ہمیں ضرورت ہے۔ تم ان لوگوں کی مدد نہیں کر سکتے جنہیں کوئی سمجھ ہی نہیں اور وہ تمہاری کوششوں کو سراہیں گے بھی نہیں۔ جو لوگ کچھ کرنا چاہتے ہیں، انہیں کوئی راہ مل ہی جاتی ہے۔ ویسے تمہاری عمر کیا ہوگی؟''

''بائیس۔''

''دیکھو۔ اپنی جوانی ضائع مت کرو، مسٹر بارک۔ کسی صبح کو آنکھ کھلے گی تو مجھ جیسے بوڑھے

آدمی بن چکے ہو گے، اور تھکن کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔"

میں نے اس وقت Ike کی باتوں پر کوئی توجہ نہ دی؛ میرا خیال تھا کہ وہ میرے نانا نانی جیسی باتیں کرتا تھا۔ بایں ہمہ، مہینے گزرتے جانے پر مجھے تنظیم کار بننے کا خیال بھولنے لگا۔ کمپنی نے مجھے فنانشل رائٹر کے عہدے پر ترقی دیدی۔ میرا اپنا دفتر، اپنا سیکرٹری اور اپنا اکاؤنٹ تھا۔ کبھی کبھی جاپانی سرمایہ کاروں یا جرمن بانڈ ڈیلروں سے ملاقات کر کے واپس آتے ہوئے میں لفٹ میں اپنا عکس دیکھتا ـــ سوٹ، ٹائی، ہاتھ میں بریف کیس..... اور لمحہ بھر کے لیے خود کو صنعت کا ایک کیپٹن تصور کرتا: ہدایات دیتے ہوئے، احکامات جاری کرتا، سودے کرتا۔ تب مجھے یاد آتا کہ میں کیا بننا چاہتا تھا، اور میں احساسِ جرم میں مبتلا ہو جاتا۔

تب ایک روز جب میں اپنے کمپیوٹر پر شرح سود کے بارے میں ایک مضمون لکھنے بیٹھا تو کچھ غیر متوقع واقعہ پیش آیا۔ Auma نے کال کی۔

اپنی اس سوتیلی بہن سے میری کبھی بھی ملاقات نہیں ہوئی تھی جو مجھے بڑے شوق سے خط لکھتی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ تعلیم کے سلسلے میں کینیا سے جرمنی گئی تھی، اور اپنے خطوط میں ہم نے ذکر کیا تھا کہ شاید میں کبھی وہاں آؤں یا شاید وہ امریکہ آئے۔ لیکن یہ منصوبے ہمیشہ معطل ہی رہے۔ ہم میں سے کسی کے پاس بھی اتنی رقم نہیں تھی؛ اور بات اگلے سال پر پڑ جاتی۔ ہماری خط و کتابت میں ایک دوستانہ فاصلہ برقرار رہا۔

اب اچانک میں نے پہلی بار اس کی آواز سنی۔ وہ بے مقام مگر مانوس آواز بہت نرم اور گہری تھی جس میں نوآبادیاتی لہجے کا تاثر بھی ملتا تھا۔ کچھ لمحوں تک میں اس کی بات ہی نہ سمجھ سکا۔ اس نے بتایا کہ وہ متعدد دوستوں کے ہمراہ سٹیٹس آ رہی تھی۔ کیا وہ نیویارک میں مجھ سے ملاقات کر سکتی ہے؟

"یقیناً۔ تم میرے پاس ٹھہر سکتی ہو۔ میں شدت سے انتظار کر رہا ہوں،" میں نے کہا۔ وہ ہنسنے لگی اور پھر بولی، "ٹھیک ہے۔ میں زیادہ لمبی بات نہیں کر سکتی۔ کافی مہنگی کال ہے۔ میں تمہیں فلائٹ کی انفارمیشن دیتی ہوں؛" اور ہم نے اس کے فوراً بعد فون رکھ دیا۔

میں نے آئندہ چند ہفتے تیاری کے لیے بھاگ دوڑ میں گزارے: صوفہ کے نئے کور، فالتو

پلیٹیں اور تولیے، ٹب صاف کرنے کا سامان۔ لیکن اپنی کی متوقع آمد سے دو دن قبل اوما نے دوبارہ کال کی اور بوجھل سرگوشی جیسی آواز میں بولی۔

"میں نہیں آ سکوں گی۔ ہمارا ایک بھائی ڈیوڈ..... ہلاک ہو گیا ہے۔ ایک موٹر سائیکل کے حادثے میں۔ مجھے اس سے زیادہ کچھ بھی معلوم نہیں۔" اور وہ رونے لگی۔ "اوہ، بارک۔ ہمارے ساتھ اس قسم کے واقعات کیوں پیش آتے ہیں؟"

میں نے اسے تسلی دینے کی اپنی سی کوشش کی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا میں اس کے لیے کچھ کر سکتا ہوں اور کہا کہ شاید پھر کبھی ملاقات ہو جائے۔ آخر کار وہ خاموش ہو گئی۔ اس نے بتایا کہ وہ کینیا واپس جانے کے لیے ٹکٹ بک کروانے جا رہی تھی۔

"او کے، بارک۔ پھر ملیں گے۔ بائے۔"

اس نے فون رکھا تو میں سیکرٹری کو بتا کر آفس سے باہر نکل گیا۔ میں گھنٹوں مین ہیٹن میں گھومتا پھرتا رہا۔ اوما کی آواز بار بار میرے کانوں میں گونجتی تھی۔ دوسرے براعظم میں ایک عورت رو رہی ہے۔ ایک گرد بھری سڑک پر موٹر سائیکل چلاتا ہوا لڑکا پھسل کر گر جاتا ہے۔ میں نے خود سے پوچھا: یہ لوگ کون تھے، یہ اجنبی جن کی رگوں میں میرے والا خون تھا؟ اس عورت کے دکھ کا مداوا کیسے ہو سکتا ہے؟ اس نوجوان کی آنکھوں میں کیسے کیسے خواب سجے ہوں گے؟ میں کون تھا، جو اپنے اس نقصان پر کوئی آنسو بہانے کے قابل نہیں تھا؟

میں آج بھی سوچتا ہوں کہ اوما کے ساتھ اس پہلے رابطے نے کیسے میری زندگی بدل کر رکھ دی۔ یا ہو سکتا ہے کہ اس رابطے سے کوئی فرق نہ پڑا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ میں پہلے ہی اپنے تنظیم سازی کے ارادے پختہ کر چکا ہوں اور اوما کی آواز نے محض مجھے یاد دلایا ہو کہ میرے بہت سے زخم ابھی تک تازہ تھے اور میں انہیں خود ہی ٹھیک نہیں کر سکتا تھا۔ یا ہو سکتا ہے کہ ڈیوڈ نہ مرتا، اوما نیویارک آتی اور مجھے کینیا اور باپ کے متعلق اس سے وہ کچھ معلوم ہو جاتا جو بعد میں معلوم ہوا۔

مجھے نہیں معلوم۔ پر یہ بات یقینی ہے کہ اوما کی کال کے چند ماہ بعد میں نے کنسلٹنگ فرم میں نوکری سے استعفیٰ دیا اور تنظیم سازی کی ایک نوکری کی تلاش کرنے لگا۔ ایک مرتبہ پھر میرے خطوط کا

کوئی جواب نہ آیا۔لیکن کوئی ایک ماہ بعد شہر میں ایک ممتاز سول حقوق کی تنظیم کے ڈائریکٹر نے مجھے انٹرویو کے لیے کال کیا۔وہ ایک دراز قد، خوبرو سیاہ فام تھا۔اس کے دفتر میں اطالوی کرسیاں اور افریقی مجسمے رکھے تھے۔

ڈائریکٹر نے میرے بایوڈیٹا پر نظر ڈال کر کہا،"مجھے پسند آیا ہے یہ۔بالخصوص کارپوریٹ میں تجربہ۔آج کل سول حقوق کی تنظیم کا حقیقی کام یہی ہے۔اب احتجاجی مظاہرے اور دھرنے کارآمد نہیں رہے۔کام کرنے کے لیے ہمیں کاروبار، حکومت اور اندرون شہر کے درمیان روابط بنانے کی ضرورت ہے۔" اس نے اپنے بوڑھے ہاتھ آپس میں رگڑے، مجھے چمک دار کاغذ پر چھپی ایک سالانہ رپورٹ اٹھا کر دی۔ اس کے پچھلے صفحے پر تنظیم کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کی فہرست تھی۔ان میں ایک سیاہ فام وزیر اور دس سفید فام کارپوریٹ ایگزیکٹوز تھے۔ڈائریکٹر بولا،"دیکھا تم نے؟ پبلک۔پرائیویٹ پارٹنرشپ۔ مستقبل کی کنجی۔اور یہیں تم جیسے نوجوانوں کی جگہ بنتی ہے۔تعلیم یافتہ، پراعتماد، بورڈ روم میں پرسکون۔ پتا ہے، پچھلے ہفتے ہی میں وائٹ ہاؤس میں ایک ڈنر کے موقعہ پر HUD کے سیکرٹری کے ساتھ اس مسئلے پر گفتگو کر رہا تھا۔ جیک، بہت زبردست آدمی ہے۔وہ تم جیسے نوجوان سے مل کر بہت خوش ہوگا۔بلاشبہ میں ایک رجسٹرڈ ڈیموکریٹ ہوں، لیکن ہمیں اقتدار میں آنے والے ہر شخص کے ساتھ معاملات نبھانا سیکھنا ہوگا......"

اس نے وہیں مجھے نوکری کی پیش کش کر دی، جس میں منشیات، بے روزگاری، رہائشی سہولیات وغیرہ پر کانفرنسوں کا اہتمام کرنا اور بحث مباحثے کا انتظام کرنا شامل تھا۔میں نے اس کی فراخدلانہ پیش کش ٹھکرا دی اور فیصلہ کیا کہ مجھے گلیوں بازاروں کے زیادہ نزدیک رہنے والی نوکری چاہیے۔میں نے تین ماہ ہارلیم میں ایک Ralph Nader ذیلی فرم کے لیے کام کرتے ہوئے گزارے اور سٹی کالج میں اقلیتی طلبا کو ری سائیکلنگ کی اہمیت سمجھاتا رہا۔پھر میں نے ایک ہفتہ بروکلین میں اسمبلی کے اراکین کی ریس میں پمفلٹ بانٹتے ہوئے گزارا......امیدوار ہار گیا اور مجھے تنخواہ کبھی نہ مل سکی۔

چھ ماہ میں میرے کس بل نکل گئے۔بے روزگاری اور ناقص غذا نے ہمت توڑ دی۔کچھ حوصلہ حاصل کرنے کی تلاش میں میں کالوں کے حقوق کے حامی Kwame Toure کی تقریر سننے کولمبیا

گیا۔آڈیٹوریم کے دروازے پر دو عورتیں ......ایک سیاہ فام اور ایک ایشیائی ...... مارکسی لٹریچر فروخت کرتے ہوئے ایک دوسری کے ساتھ تاریخ میں ٹراٹسکی کے مقام پر بحث کر رہی تھیں۔آڈیٹوریم کے اندر تورے افریقہ اور ہارلیم کے مابین اقتصادی روابط قائم کرنے کے متعلق پروگرام پیش کر رہا تھا جس کی بدولت گوری سرمایہ دار سامراجیت سے بچا جا سکتا۔اس کی گفتگو کے اختتام پر چشموں والی ایک دبلی پتلی لڑکی نے سوال کیا کہ افریقی معیشتوں کی حالت اور سیاہ فام امریکیوں کی فوری ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے کیا اس قسم کا پروگرام عملی روپ اختیار کر سکتا ہے۔تورے نے اس کی بات کاٹی: "بہن، یہ برین واشنگ کا ہی نتیجہ ہے کہ آپ اسے ناقابل عمل سمجھ رہی ہیں۔" بولتے وقت اس کی آنکھوں میں کسی دیوانے جیسی چمک تھی۔لڑکی کئی منٹ تک کھڑی رہی اور اسے اس کے بورژوا رویوں کی بنا پر خوب لتاڑا گیا۔لوگ باہر آنے لگے۔آڈیٹوریم کے باہر دونوں مارکسسٹ عورتیں اب پوری قوت سے چلا رہی تھیں۔

"سٹالن نواز سور!!"

"اصلاح پسند کتیا!!"

یہ سب کچھ ایک ڈراؤنے خواب جیسا تھا۔میں براڈوے پر ادھر ادھر گھومتا اور لنکن میموریل کے کنارے پر کھڑا اپنے خیال میں گم رہا۔تحریک سالوں پہلے مردہ ہو گئی تھی۔تبدیلی کی طرف جانے والا ہر راستہ ناپا جا چکا تھا، ہر حکمت عملی نافذ کر کے دیکھی جا چکی تھی۔اور ہر شکست کے ساتھ بہترین تمنائیں رکھنے والے لوگ بھی ان لوگوں کی جدوجہد سے دور ہوتے جا رہے تھے جن کی خدمت کا وہ دعویٰ کرتے تھے۔

یا پھر یہ سب کچھ محض دیوانگی تھا۔اچانک میں نے محسوس کیا کہ میں سڑک کے عین درمیان میں کھڑا خود سے باتیں کر رہا ہوں۔کام سے گھر جاتے ہوئے لوگ ایک چھوٹی سی محراب بناتے ہوئے میرے پاس سے گزر رہے تھے۔

ابھی میں نے تنظیم سازی کے متعلق تمام امیدیں ترک نہیں کی تھیں جب مجھے مارٹی کوفمین کی جانب سے ایک کال موصول ہوئی۔اس نے بتایا کہ وہ شکاگو میں تنظیم سازی شروع کر رہا ہے اور

کسی زیر تربیت شخص کی خدمات لینا چاہتا ہے۔ اگلے ہفتے اسے نیویارک آنا تھا۔ مجھے کہا گیا کہ لیکسنگٹن کی ایک کافی شاپ میں اس سے ملنے آؤں۔

اس کا چہرہ مہرہ زیادہ متاثر کن نہیں تھا۔ درمیانہ قد، فربہ جسم، بوجھل چہرہ، موٹے فریم والے چشمے۔ جب وہ ہاتھ ملانے کے لیے اٹھا تو اس کی سفید شرٹ پر چائے گر گئی۔

مارٹی نے ٹشو پیپر سے اپنی شرٹ صاف کرتے ہوئے کہا،"سو، ہوائی سے تعلق رکھنے والا کوئی شخص تنظیم سازی کا کام کیوں کرنا چاہتا ہے؟"

میں بیٹھ گیا اور اپنے بارے میں مختصراً بتایا۔

"اوہ ف۔" اس نے سر ہلایا اور ایک کاغذ والا پیڈ نکالا۔ "تمہیں کسی چیز پر ضرور غصہ ہوگا۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟"

اس نے کندھے اچکائے،"مجھے ٹھیک ٹھیک تو نہیں پتا کہ کیا، لیکن ضرور کچھ ہے۔ میری بات کا غلط مطلب نہ لو...... غصہ اس قسم کے کام کے لیے ضروری ہے۔ صرف اسی وجہ سے کوئی شخص تنظیم سازی جیسا کام کرتا ہے۔ مطمئن لوگ زیادہ راحت بخش کام کا انتخاب کرتے ہیں۔"

اس نے مزید گرم پانی کا آرڈر دیا اور مجھے اپنے بارے میں بتایا۔ وہ پینتیس چالیس سال کا یہودی تھا۔ اس نے 60ء کی دہائی میں طلبا کے احتجاجی مظاہروں کے دوران تنظیم سازی شروع کی اور پندرہ برس تک یہی کرتا رہا۔ نیبراسکا کے کسان؛ فلاڈلفیا میں کالے؛ شکاگو میں میکسیکی۔ اب وہ میٹروپولیٹن شکاگو میں کچھ صنعتوں میں ملازمتیں بچانے کے منصوبے کے تحت شہری کالوں اور مضافاتی علاقوں کے گوروں کو متحد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ کوئی معاون چاہتا ہے۔ کوئی سیاہ فام معاون۔

اس نے کہا،"ہمارا زیادہ تر کام گرجا گھروں کے ساتھ ہے۔ اگر غریب اور مزدور طبقے کے لوگ حقیقی طاقت بنانا چاہتے ہیں تو انہیں کسی نہ کسی ادارے کو بنیاد بنانا ہوگا۔ یونینوں کی موجودہ صورت حال کو دیکھتے ہوئے گرجا گھر شہر کی واحد جگہ ہے جہاں لوگ آتے ہیں اور جہاں سے ان کی اقدار وابستہ ہیں، چاہے وہ کتنے ہی گند تلے دبی ہوئی ہوں۔ البتہ گرجا گھر محض جذبۂ نیکی کے تحت تمہارے ساتھ مل کر کام نہیں کریں گے۔ وہ بات کو کافی طول دیتے ہیں...... اتوار کے دن

ایک خطبہ، یا شاید بے گھروں کے لیے ایک خصوصی عبادت۔ لیکن اگر آپ کو کچھ کرنا ہے تو وہ صرف تبھی کچھ کریں گے جب آپ انہیں سمجھا سکیں کہ گرجا گھر کو گرم رکھنے کے اخراجات کی ادائیگی میں کیسے مدد ملے گی۔"

اس نے اپنے کپ میں مزید گرم پانی ڈالا۔"ویسے تم شکاگو کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"

میں نے لمحہ بھر کے لیے سوچا اور پھر کہا،"دنیا بھر کو سور کا گوشت سپلائی کرنے والا قصاب۔"

مارٹی نے نفی میں سر ہلایا،"قصاب خانے تو کچھ عرصہ ہوا بند ہو گئے۔"

"Cubs کبھی نہیں جیتتے۔"

"صحیح ہے۔"

میں نے مزید کہا،"وہ امریکہ کا سب سے زیادہ نسلی منافرت کا شکار شہر ہے۔ ایک سیاہ فام ہیرلڈ واشنگٹن کچھ عرصہ پہلے میئر منتخب ہوا اور گوروں کو یہ بات اچھی نہیں لگی۔"

"تو تم ہیرلڈ کے کیریئر کو دیکھتے رہے ہو۔ مجھے حیرت ہے کہ تم اس کے پاس کام کرنے کیوں نہیں گئے۔"

"میں نے کوشش کی تھی، مگر اس کے دفتر سے کوئی جواب نہ آیا۔"

مارٹی نے مسکرا کر اپنا چشمہ اتار دیا اور ٹائی کے کونے سے شیشے صاف کیے۔"اگر آپ سیاہ فام نوجوان ہیں اور سماجی مسائل میں دلچسپی رکھتے ہیں تو بس اتنا ہی کرنا کافی ہے؟ کام کرنے کے لیے کوئی سیاسی مہم تلاش کرو۔ کوئی بارسوخ سرپرست...... کوئی ایسا شخص جو تمہیں تمہارے کیریئر میں مدد دے سکے۔ اور ہیرلڈ بلاشبہ بارسوخ ہے۔ کافی مسحور کن شخصیت۔ تقریباً سیاہ فام برادری اس کے ساتھ ہے۔ تقریباً نصف ہسپانوی اور مٹھی بھر گورے لبرل بھی۔ البتہ تم نے ایک بات درست کہی۔ شہر کا سارا ماحول منافرت کا شکار ہے۔ ایک بہت بڑا میڈیا سرکس۔ زیادہ کام نہیں ہو رہا۔"

میں نے اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔"اور یہ کس کی غلطی ہے؟"

مارٹی نے چشمہ دوبارہ لگایا اور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا،"یہ مسئلہ غلطی کا نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ آیا کوئی سیاست دان، حتیٰ کہ ہیرلڈ جیسی صلاحیتوں کا مالک کوئی شخص اس چکر کو توڑنے کے لیے کچھ کر سکتا ہے یا نہیں۔ چاہے وہ گورا ہو یا کالا۔"

اس نے شروع میں دس ہزار ڈالر سالانہ تنخواہ کے ساتھ نوکری کی پیش کش کی۔ کار خریدنے کے لیے دو ہزار ڈالر ٹریول الاؤنس بھی ملنا تھا۔ اچھی کارکردگی کی صورت میں تنخواہ بڑھ جاتی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے واپس گھر کا رخ کیا اور سارے راستے سوچتا رہا کہ اس شخص کو کیا جواب دوں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ وہ ذہین سمجھدار تھا۔ وہ اپنے کام سے بھی مخلص لگتا تھا۔ اس کے باوجود کسی چیز نے مجھے روکا۔ شاید وہ اپنے بارے میں حد سے زیادہ پر یقین تھا۔ اور وہ گورا بھی تھا ...... اس نے خود کہا تھا کہ یہ چیز مسئلے کا باعث تھی۔

پارک سے پرانے لیمپ ٹمٹما کر جل اٹھے۔ میں ایک بنچ پہ بیٹھ کر دستیاب راہوں پر غور کرنے لگا اور ایک سیاہ فام عورت کو اپنے بیٹے کے ہمراہ قریب سے گزر کر آگے جاتے دیکھا۔

ایک ہفتے بعد میں نے اپنی کار میں سامان لادا اور شکاگو روانہ ہو گیا۔
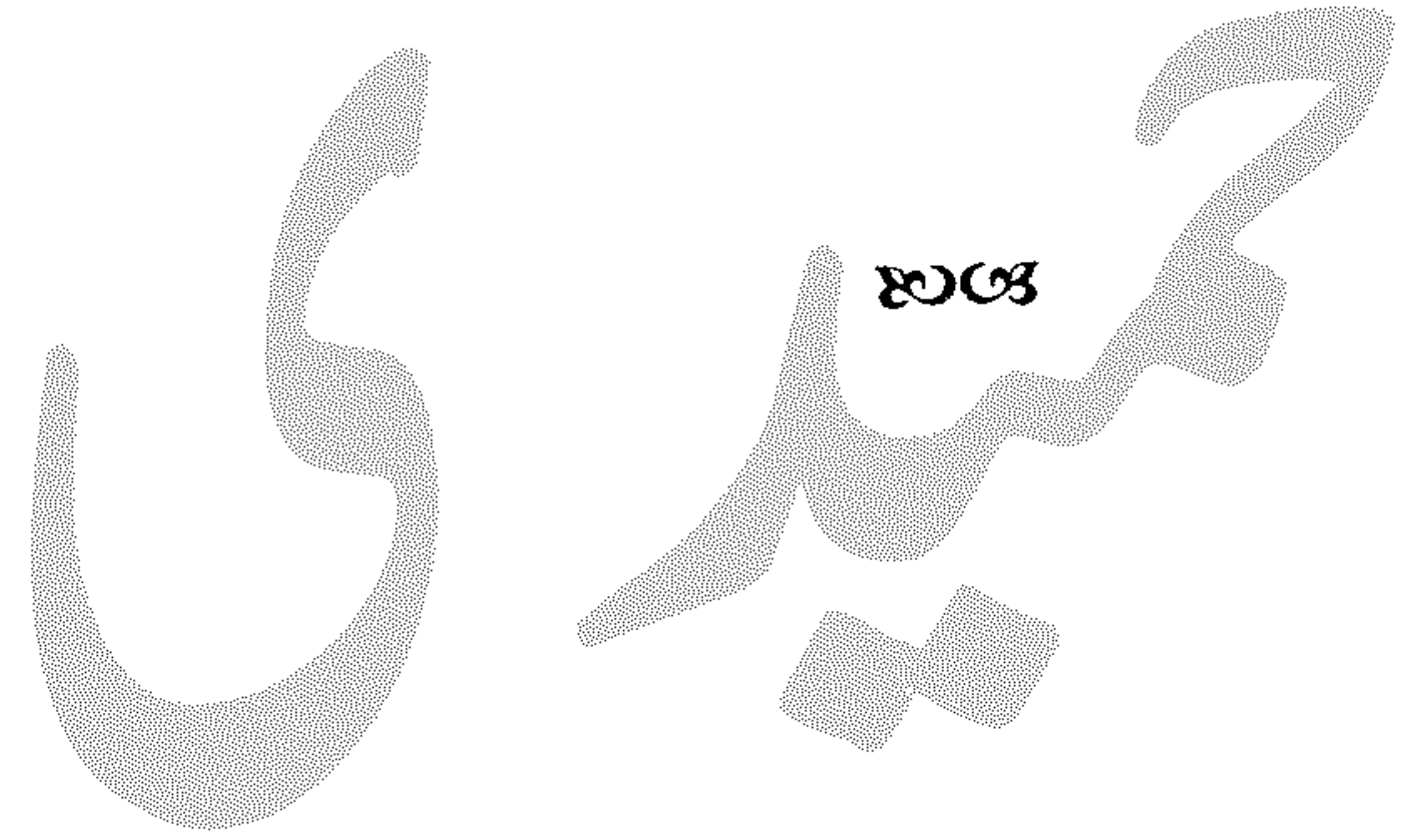
آٹھواں باب

پہلی ناکامی

میں ایک مرتبہ پہلے بھی شکاگو آ چکا تھا۔ میرے باپ کی ہوائی آمد کے بعد اگلے موسم گرما کے دوران ہی کیا۔ دس سال کا ہونے سے پہلے، جب توت نے فیصلہ کیا تھا کہ مجھے یو ایس مین لینڈ دیکھنے جانا چاہیے۔ شاید دونوں چیزیں آپس میں مربوط تھیں۔ اس کا فیصلہ اور میرے باپ کی آمد۔ اس کی موجودگی نے ایک مرتبہ پھر توت اور گرامپس کی بسائی ہوئی دنیا میں خلل ڈال دیا تھا۔

ہم نے کوئی ایک ماہ تک سفر کیا...... توت، میری ماں، مایا اور میں۔ اس وقت تک گرامپس کو سیر و سیاحت کا شوق نہیں رہا تھا اور اس نے گھر پر ہی رہنے کو ترجیح دی۔ ہم بذریعہ ہوائی جہاز سیاٹل گئے اور پھر ساحل کے راستے کیلی فورنیا، ڈزنی لینڈ، گرینڈ کینیون، کنساس سٹی کے میدانوں اور آخر میں ییلو سٹون پارک تک گئے۔ ہم نے زیادہ تر سفر گرے ہاؤنڈ بسوں پر کیا اور ہاورڈ جانسنز میں ٹھہرے۔ ہم ہر رات کو سونے سے قبل ٹیلی ویژن پر واٹر گیٹ مقدمے کی کارروائی سنتے۔

ہم تین دن سے شکاگو کے ایک ہوٹل میں تھے۔ وہ ضرور جولائی کے مہینے کا کوئی دن ہو گا، لیکن پتا نہیں میری یادداشت میں وہ سردی کے دن تھے۔

چودہ برس گزرنے کے بعد شہر مجھے زیادہ خوب صورت نظر آیا۔ یہ بھی جولائی کا مہینہ تھا اور سورج سرسبز درختوں پر پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ مارٹی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ پہلے چند دن کے دوران مصروف رہے گا، لہٰذا میں اپنی مرضی سے جہاں چاہے گھوم پھر سکتا تھا۔ میں نے ایک نقشہ خرید کر شہر کے مختلف مقامات پر گیا۔

تیسرے روز میں ہائیڈ پارک کے کونے پر واقع Smitty's باربر شاپ میں گیا۔ اس کی کرسی

خالی تھی اور میں وہاں جا بیٹھا۔ جلد ہی میں کھیلوں، عورتوں اور گزشتہ روز کی بڑی خبروں پر گفتگو میں شریک ہو گیا جو نائی کی دکانوں پر اکثر ہوتی رہتی ہے۔ کسی نے ابھی ابھی اپنے پڑوسی کے متعلق کہانی ختم کی تھی...... کہ وہ شخص اپنے بیڈروم میں اپنی بیوی کی کزن کے ساتھ پکڑا گیا اور اسے چھری سے دھمکا کر ننگا گلی میں نکال دیا گیا۔ تب گفتگو سیاسی رنگ اختیار کر گئی۔

اخبار پڑھتا ہوا آدمی بولا: ''Vrdolyak اور اس کے ساتھیوں کو پتا ہی نہیں کہ کب قدم اٹھانا ہے۔ جب بوڑھا Daley میئر تھا تو کسی نے بھی اعتراض نہ کیا کہ وہ سٹی ہال میں تمام آئرش لوگ بھرتی کر رہا تھا۔ لیکن جونہی ہیرلڈ کسی کالے کو ملازمت دیتا ہے تو وہ اسے جوابی نسل پرستی قرار دینے لگتے ہیں۔''

''یار بس ایسا ہی ہے۔ جب بھی کوئی سیاہ فام اقتدار میں آتا ہے تو وہ اس کے لیے قواعد و قوانین بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

''سب سے بری چیز اخبارات کا یہ تاثر دینا ہے کہ دراصل کالوں نے یہ سب شروع کیا۔''

''تم گوروں کے اخبار سے اور کیا توقع کر سکتے ہو؟''

''ٹھیک کہا تم نے۔ ہیرلڈ کو معلوم ہے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ وہ تو بس اگلے انتخابات تک کا وقت گزار رہا ہے۔''

تو سیاہ فام لوگ شکاگو کے میئر کے متعلق اس طرح بات کرتے تھے کہ جیسے وہ ان کا کوئی رشتہ دار ہو۔ جوتا مرمت کرنے والوں کی دکانوں سے لے کر بیوٹی پارلرز تک ہر جگہ اس کی تصاویر لگی تھیں۔ باربر نے مجھے اس کی تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے دیکھا اور پوچھا کہ کیا میں اس الیکشن کے دوران شکاگو میں تھا۔ میں نے نہیں میں جواب دیا۔ اس نے سر ہلایا اور بولا:

''اس شہر کی نظر میں اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے یہاں موجود ہونا ضروری ہے۔ ہیرلڈ سے پہلے ہم سب خود کو دوسرے درجے کے شہری سمجھا کرتے تھے۔''

''پلانٹیشن کی سیاست،'' اخبار پڑھتے ہوئے آدمی نے کہا۔

''ہاں، صحیح بات ہے۔ کالے لوگ بدترین ملازمتیں کرتے ہیں۔ سب سے بری جگہوں پر رہتے ہیں۔ پولیس خوفناک ظلم کرتی ہے۔ لیکن جب نام نہاد سیاہ فاموں کے کمیٹی نمائندے انتخابات کے قریب آتے ہیں تو ہم سب قطاریں بنا کر سیدھے ڈیموکریٹک امیدوار کو ووٹ ڈال

دیتے ہیں۔ کرمس کی ایک ٹرکی ہمارے ضمیر کی قیمت ہے۔ گورے ہمارے چہروں پر تھوکتے ہیں اور ہم انہیں اپنے ووٹ کے ذریعے انعام دیتے ہیں۔''

ہیرلڈ کے عروج کی گفتگو سنتے ہوئے بالوں کا ایک گچھا میری گود میں آ گرا۔ وہ ایک مرتبہ پہلے بھی میئر کا الیکشن لڑ چکا تھا، مگر ناکام رہا۔ ان آدمیوں نے سیاہ فام برادری کے عدم اتحاد اور بے یقینی کو الزام دیا۔ لیکن ہیرلڈ نے دوبارہ کوشش کی تھی اور اس مرتبہ اس کے لوگ تیار تھے۔ انہیں اپنے یقین کا انعام ملا۔

باربر نے آئینہ مجھے پکڑایا تاکہ میں چیک کر لوں، اور پھر کپڑا اتار کر برش سے میری گردن صاف کی۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا، ''تاریخ کا سبق پڑھانے کا شکریہ۔''

''اس کے کوئی پیسے نہیں۔ بال کٹوانے کے دس ڈالر۔ ویسے تمہارا نام کیا ہے؟''

''بارک۔''

''اممم۔ بارک۔ تم مسلمان ہو؟''

''میرا دادا تھا۔''

اس نے پیسے لیے اور ہاتھ ملایا۔ ''اچھا، بارک، اگلی مرتبہ کچھ جلدی آ جانا۔ جب تم اندر آئے تھے تو تمہارے بال بہت خراب حالت میں تھے۔''

اسی روز سہ پہر کو مارٹی نے مجھے میری نئی رہائش گاہ سے لیا اور ہم سکائی وے پر جنوب کی طرف بڑھے۔ کئی میل سفر کے بعد ہم لکڑی یا اینٹ سے بنے چھوٹے چھوٹے گھروں کی قطار کے قریب سے گزرے اور پھر ایک بہت بڑی پرانی فیکٹری میں پہنچے۔

''پرانا وسکونسن سٹیل پلانٹ۔''

ہم خاموشی سے وہاں بیٹھ گئے اور عمارت کا معائنہ کرنے لگے۔ وہ خالی اور زنگ آلود تھی۔ کسی کاٹھ کباڑ کے ڈھیر کی طرح۔

مارٹی نے کار موڑتے اور واپس سڑک کی جانب جاتے ہوئے کہا، ''اس پلانٹ میں ہر قسم کے لوگ کام کیا کرتے تھے۔ گورے، کالے، ہسپانوی۔ سب ایک جیسے کام۔ سب کی زندگیاں ایک جیسی تھیں۔ لیکن پلانٹ سے باہر ان میں سے زیادہ تر لوگ آپس میں کوئی تعلق واسطہ نہیں رکھتے

تھے۔ اور میں ان چرچ جانے والے لوگوں کی بات کر رہا ہوں جو مسیح کے بھائی اور بہنیں کہلواتے ہیں۔"

ہم ایک سپاٹ لائٹ پر پہنچے، اور میں نے ٹی شرٹس میں ملبوس نوجوان گوروں کی ایک ٹولی کو بیئر پیتے دیکھا۔ متعدد آدمی مجھے گھورنے لگے۔ میں مارٹی کی جانب مڑا۔

"تو آپ کے خیال میں یہ لوگ اب مل جل کر کام کیوں کریں گے بھلا؟"

"ان کے پاس اور کوئی راہ نہیں ہے۔ اگر وہ اپنی نوکریاں واپس چاہتے ہیں تو یہی کرنا پڑے گا نہیں۔"

جب ہم ہائی وے پر واپس پہنچے تو مارٹی مجھے اپنی قائم کردہ تنظیم کے متعلق مزید بتانے لگا۔ تب اس نے کہا، "یہاں پیداوار دوبارہ شروع کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔ کم از کم دس سال۔ لیکن ایک بار ہم یونینز کو شریک کر لیں تو سودے بازی کی ایک بنیاد میسر آ جائے گی۔ اس دوران ہمیں لوگوں کو چھوٹی چھوٹی فتوحات میں مصروف رکھنا ہوگا۔ کوئی ایسی چیز جو لوگوں کو دکھا سکے کہ اگر وہ آپس میں لڑنا بند کر دیں تو وہ کس قدر طاقتور ہوں گے؛ کہ انہیں اپنے حقیقی دشمن سے لڑنا چاہیے۔"

"اور وہ دشمن کون ہے؟"

مارٹی نے کندھے اچکائے، "سرمایہ کاری کرنے والے بینکر، سیاست دان، دھڑے باز۔"

مارٹی نے ایک آنکھ میچ کر آگے سڑک پر دیکھتے ہوئے سر ہلایا اور مجھے شک ہوا کہ وہ اتنا سنکی نہیں جتنا نظر آنا چاہتا ہے۔ وہ پلانٹ اس کے لیے کہیں زیادہ وسیع معنی رکھتا تھا۔ میں نے سوچا کہ ضرور اسے بھی زندگی میں کہیں نہ کہیں دھوکا ہوا ہے۔

شہر واپس پہنچنے تک شام ڈھل چکی تھی۔ ہم ایک بڑے سے نیم مضافاتی سکول کی پارکنگ میں رکے جہاں لوگوں کا ایک مجمع ہال کی جانب جا رہا تھا: سٹیل فیکٹری کے مزدور، سیکرٹری اور ٹرک ڈرائیورز، مرد و خواتین جو بہت زیادہ تمباکو نوشی کرتے اور اپنے وزن کا خیال نہیں رکھتے تھے۔ تنظیم کے شریک صدر ولبر ملٹن نے ہمارا استقبال کیا۔

"ویلکم۔ ہم سوچ رہے تھے کہ آپ لوگ پتا نہیں کب پہنچیں گے۔" اس نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

مارٹی نے آڈیٹوریم کے اندر نظر ڈالی۔ "حاضری کیسی لگ رہی ہے؟"

اوباما اپنے نانا کے ساتھ ہوائی میں

کم سن اوباما اپنے دوستوں کے ساتھ

ماں کے دوسرے انڈونیشیائی شوہر لولو اور نئی بہن کے ساتھ

نانا نانی بارک کی ماں این کے ساتھ

نانا سٹینلے اور نانی میڈلین کی جوانی کی تصویر
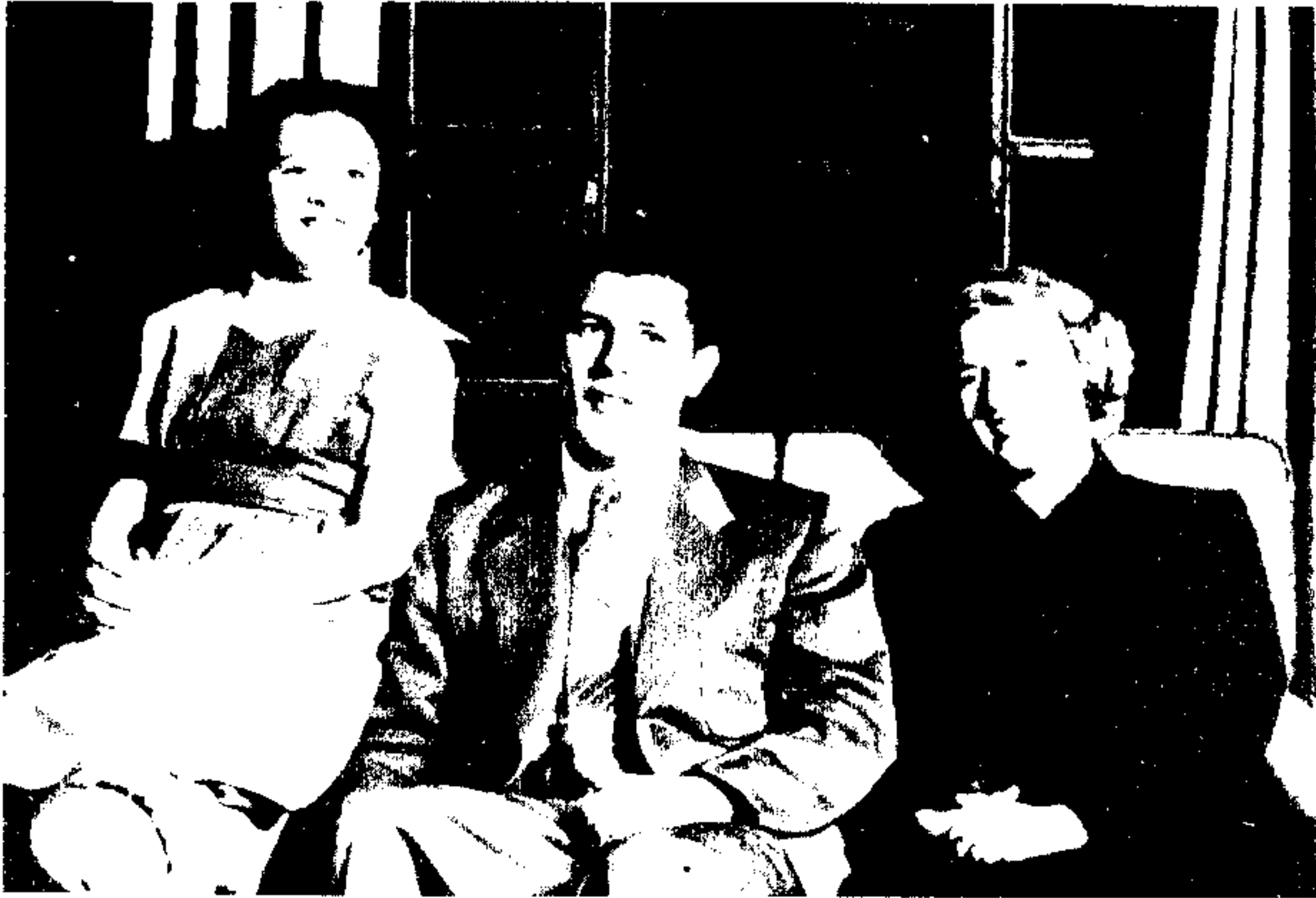
اوباما کی ماں لڑکپن میں اپنے والدین کے ساتھ

ڈاکٹر بارک حسین اوباما: اوباما کا باپ، جوانی کے دنوں میں

اوباما کا باپ مطالعہ کرتے ہوئے

باپ کے ساتھ پہلی ملاقات کے موقعہ پر تصویر

اوباما اور اس کی ماں

اوباما اپنی ماں کے ہمراہ

اوباما: جزیرہ ہوائی میں بچپن کے دن

لڑکپن میں ماں اور نانا ے ساتھ

اوباما نوجوانی میں باسکٹ بال ٹیم ے ساتھ

اوباما کولمبیا میں

جوانی کے زمانے کی ایک یادگار تصویر

کینیا میں اپنی دادی کے ساتھ

میشیل کے ساتھ شادی کے دنوں کی تصاویر

نانا اور نانی اوباما کا استقبال کرتے ہوئے

اوباما جوانی کے دنوں میں اپنی نانی اور نانا کے ہمراہ

44 سالہ میشیل، 46 سالہ اوباما، اپنی بیٹیوں مالیا اور ساشا کے ساتھ شکاگو والے گھر میں۔
19 جون 2008ء۔

اوباما شکاگو یونیورسٹی میں لیکچر دیتے ہوئے

اوباما اور بیوی مشیل

سینیٹر اوباما اپنی انتخابی مہم کے دوران

بارک اوباما اپنی بیٹیوں مالیا اور ساشا کے ساتھ

اوباما فیملی ایک ٹاک شو میں آتے ہوئے

بارک اوباما ایک انتخابی جلسے سے خطاب کے دوران

اہل خانہ کے ہمراہ دو یادگار تصاویر

سینیٹر اوباما ساحل سمندر پر

Crow Nation، مونٹانا میں، 19 مئی 2008ء

بارک اوباما کی تازہ ترین تصاویر

''ابھی تک تو ٹھیک ہے۔لگتا ہے کہ ہر کسی نے اپنا اپنا کوٹہ پورا کیا ہے۔گورنر کے آدمیوں نے ابھی ابھی کال کر کے بتایا ہے کہ وہ روانہ ہو گیا ہے۔''

مارٹی اور ولبر سٹیج کی جانب چل دیے۔وہ اس شام کے ایجنڈے پر غور کر رہے تھے۔میں بھی ان کے پیچھے چل پڑا،لیکن راستے میں درمیانی عمر کی تین سیاہ فام عورتیں آ گئیں۔ان میں سے ایک خوش شکل عورت نے اپنا تعارف بطور اینجلا کروایا اور پھر آگے جھک کر سرگوشی کی:''تم بارک ہو نا؟''

میں نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

''تمہیں اندازہ نہیں کہ ہم تمہیں یہاں دیکھ کر کتنی خوش ہیں۔''

اینجلا کے ساتھ کھڑی زیادہ عمر کی عورت بھی بولی:''تمہیں اندازہ نہیں ہو سکتا۔'' میں نے ہاتھ ملانے کے لیے آگے بڑھایا تو وہ مسکرا دی۔پھر اس نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا،''معافی چاہتی ہوں۔میں شرلی ہوں۔''اور پھر تیسری بھاری بھر کم عورت کی طرف اشارہ کر کے بولی،''اور یہ مونا ہے۔مونا، یہ کافی سمجھدار لگتا ہے نا؟''

''ہاں، بالکل۔'' مونا ہنس کر بولی۔

پیچھے سٹیج پر کھڑا مارٹی ہاتھ ہلا کر کہہ رہا تھا،''ہے، اینجلا! تم لوگ بارک سے بعد میں بات کر لینا۔اس وقت میں چاہتا ہوں کہ تم سب یہاں میرے پاس آ جاؤ۔''

عورتوں نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور پھر اینجلا واپس میری جانب مڑی۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں چلنا چاہیے۔لیکن جلد ہی تم سے بات ہو گی۔ضرور۔'' مونا نے بھی اس کی تائید کی اور پھر تینوں چلی گئیں۔

اس وقت تک آڈیٹوریم تقریباً بھر چکا تھا۔کوئی دو ہزار لوگ ہوں گے۔ان میں سے تقریباً ایک تہائی سیاہ فاموں کو بسوں میں بٹھا کر لایا گیا تھا۔سات بجے ایک بھجن منڈلی نے دو مذہبی گیت گائے۔تمام کلیسیاؤں کے نمائندوں کی حاضری لگی اور مضافاتی علاقے کے ایک گورے لوتھری نے CCRC کی تاریخ اور مشن کے متعلق بتایا۔اس کے بعد تقریر کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔

میرے خیال میں یہ سب کچھ بے کیف سا تھا،کسی سیاسی کنونشن یا ٹیلی ویژن پر ریسلنگ میچ کی طرح۔مجمع ابھی تک پر جوش لگتا تھا۔کچھ لوگوں نے اپنے اپنے چرچ کے نام والے بینرز اٹھا

سینیٹر بارک اوباما صدارتی مہم کے دوران

انتخابی مہم میں ایک کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے

اوباما کی نانی انتخابی ریلی میں

رکھے تھے۔ دیگر اپنے کسی دوست یا رشتے دار کو سٹیج پہ بیٹھے دیکھ کر تالیاں بجاتے۔ اتنے بہت سے کالے اور سفید چہروں کو ایک ہی جگہ پر دیکھ کر میں نے بھی کچھ فرحت محسوس کی۔

ریلی ختم ہونے پر مارٹی نے بتایا کہ اسے کچھ لوگوں کو گھر تک چھوڑنا ہے، لہٰذا میں واپس شہر جانے والی کسی بس میں بیٹھ جاؤں۔ ولبر کے ساتھ والی سیٹ خالی ملی اور فری وے کی لائٹس کی روشنی میں اس نے مجھے اپنے متعلق کچھ مزید بتانا شروع کیا۔ وہ شکاگو میں پلا بڑھا اور ویتنام کی جنگ میں شریک ہوا تھا۔ جنگ کے بعد اس نے ایک بینک میں ملازمت کی اور نکالے جانے پر مسیح کی خدمت میں آ گیا۔

بس ایک گرجا گھر کی پارکنگ میں رکی اور ولبر نے میرا شکریہ ادا کیا کہ میں آیا اور سارے جلسے میں حصہ لیا۔

ریلی سے اگلے دن مارٹی نے فیصلہ کیا کہ اب مجھے کچھ حقیقی کام کرنا چاہیے۔ اس نے مجھے لوگوں کی ایک طویل فہرست دی تا کہ ان سے جا کر ملوں اور ان کی دلچسپیاں معلوم کروں۔ لوگ اس لیے تنظیم سازی کا حصہ بنتے ہیں کیونکہ انہیں اس میں کچھ حاصل ہونے کی امید ہوتی ہے۔ اگر مجھے ایک مرتبہ کسی مسئلے میں لوگوں کی دلچسپی نظر آ جائے تو انہیں میدان عمل میں لا سکتا ہوں۔"

مسائل، عملی اقدام، قوت اور ذاتی مفاد۔ مجھے یہ تصورات پسند آئے۔ یہ ایک مخصوص کٹر پن کو بیان کرتے تھے، ایک غیر جذباتیت؛ سیاست، نہ کہ مذہب۔ آئندہ تین ہفتے تک میں دن رات کام کرتے ملاقاتیں کرتا رہا۔ یہ کام میری توقع سے زیادہ مشکل تھا۔ میں جب بھی انٹرویو کا وقت لینے کے لیے فون اٹھاتا تو کوئی چیز مجھے اندر سے روکتی۔ گرامپس کی انشورنس سیلز کے سلسلے میں کیے ہوئے فونز کی یاد آنے لگتی۔ میں نے زیادہ تر ملاقاتیں شام کے وقت گھروں میں کیں۔ لوگ دن بھر کی محنت کے بعد تھکے ہوئے ہوتے تھے۔ کبھی کبھی کسی دروازے پر پہنچ کر پتا لگتا کہ وہ شخص اپوائنٹمنٹ بھول گیا تھا۔ مجھے نیم کھلے دروازے کے پیچھے سے مشکوک نگاہوں سے دیکھا جاتا اور میں یاد دلاتا کہ میں کون ہوں اور کس مقصد کے لیے آیا ہوں۔

خیر یہ چھوٹی موٹی مشکلات تھیں۔ ایک مرتبہ ان پر قابو پا لیا تو میں نے لوگوں کو کھل کر اپنی آرا کا اظہار کرتے ہوئے پایا۔ جتنی زیادہ ملاقاتیں کیں، اتنی ہی مرتبہ مخصوص مسائل بار بار سنے۔ مثلاً

مجھے پتا چلا کہ علاقے کے زیادہ تر لوگوں کی پرورش شمال میں یا شکاگو کے مغربی حصے میں تھی۔ میرے ساتھ بات چیت کرنے والے لوگ ایک خود انحصار دنیا کی یادیں دل میں بسائے ہوئے تھے، لیکن انہیں حرارت اور روشنی اور سانس لینے کی کھلی جگہ نہ ہونے کے متعلق بھی یاد تھا۔

ان کی کہانیوں میں جب بھی کالے اور گورے کا آمنا سامنا ہوتا تو نتیجہ ہمیشہ غیض وغضب کی صورت میں ہی برآمد ہوتا۔ علاقہ اس نسلی اکھاڑ پچھاڑ سے پوری طرح باہر نہیں نکل سکا تھا۔ سٹورز اور بینکوں میں صرف گورے رہ گئے تھے۔ شہر کو سہولیات کی فراہمی سے انکار کر دیا گیا۔ پھر بھی جب سیاہ فام دس پندرہ سال پہلے کی صورت حال پر غور کرتے تو کچھ سکھ کی سانس لیتے۔ وہ دو آمدنیوں کی بدولت گھروں اور کاروں کے مالک بن گئے تھے۔ کچھ ایک نے اپنے بچوں کو پڑھا بھی لیا۔ بہت سے گھروں کے آتش دانوں پر ان کے گریجوایٹ بچوں کی تصاویر رکھی تھیں۔ وہ گھروں کو صاف ستھرا اور بچوں کو گلیوں بازاروں سے دور رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے اپنے بلاکس میں کلب بنا رکھے تھے۔

البتہ مستقبل کے متعلق بات کرتے ہوئے ان کی آوازوں میں ایک بے چینی سما جاتی۔ وہ کسی کزن یا عزیز کا ذکر کرتے جو اکثر پیسے مانگنے آتا؛ یا کوئی بالغ بچہ جو بے روزگاری کے باعث گھر پر ہی رہتا۔ کالج تک یا اچھی نوکریوں والی دنیا تک پہنچ جانے والے بچوں کی تقدیر بھی انہیں خوش آئند نہیں لگتی تھی۔

انفرادی بہتری اور اجتماعی انحطاط کا ایک دہرا احساس پایا جاتا تھا۔ محلوں، پھر بلاکس اور اس کے بعد بلاکس کے اندر گھروں کے درمیان امتیاز اس انحطاط کو روکنے کی کوشش تھی۔ البتہ میں نے ایک بات نوٹ کی۔ اپنے پڑوسیوں کی جاہلانہ عادات سے نالاں عورتوں کے کچن میں ہیرلڈ کی ایک تصویر موجود تھی۔

میں نے تیسرے ہفتے کی رپورٹ مارٹی کے ڈیسک پر پھینکی اور جب وہ پڑھنے لگا تو میں کرسی میں بیٹھ گیا۔

"بری نہیں،" اس نے رپورٹ مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"بری نہیں؟"

"ہاں، بری نہیں۔ تم اب غور سے سننے لگے ہو۔ لیکن یہ اب بھی کافی مجرد ہے۔ کہ جیسے تم کوئی

سروے وغیرہ کررہے ہو۔ اگر تم لوگوں کو منظم کرنا چاہتے ہو تو ادھر ادھر کی باتوں سے بچ کر عین دل تک پہنچنا ہوگا۔ کوئی ایسی بات جو ان کے دل کو چھو لے۔ بصورت دیگر تم کبھی بھی ان کے ساتھ کوئی گہرا تعلق نہیں بنا سکو گے۔''

وہ شخص میرے اعصاب پہ سوار ہونے لگا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ کبھی بہت زیادہ حساب کتاب کرنے کی وجہ سے پریشان نہیں ہوا؟ کیا صرف تنظیم سازی کی غرض سے لوگوں کی نفسیات میں گھسنا اور ان کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہنا اسے کبھی ایک سازشی عمل نہیں لگا؟ اس نے ایک گہری آہ بھری۔

''بارک، میں شاعری نہیں، تنظیم سازی کرتا ہوں۔''

اس بات کا کیا مطلب تھا؟ میں ناراضگی کے عالم میں دفتر سے چلا گیا۔ بعدازاں مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ مارٹی درست کہہ رہا تھا۔ مجھے ابھی تک کوئی اندازہ نہیں تھا کہ کانوں سے سنی ہوئی باتوں کو عمل میں کیسے لاؤں گا۔ درحقیقت ملاقاتیں مکمل ہونے والی تھیں کہ اس کا موقع آ گیا۔

گٹھے ہوئے جسم کی مالک ایک عورت روبی سٹائلز کے ساتھ ملاقات کے دوران ہم اس کے نوجوان بیٹے Kyle کے متعلق بات کررہے تھے۔ اس نے علاقے میں گینگ بننے کے رجحان کا ذکر کیا۔ Kyle کے ایک دوست کو عین اس کے گھر کے سامنے پچھلے ہفتے گولی ماردی گئی تھی۔ لڑکے کی جان تو بچ گئی، لیکن اب روبی کو اپنے بیٹے کی جان کی فکر تھی۔

میرے کان کھڑے ہو گئے؛ اس چیز میں ایک ذاتی مفاد محسوس ہوا۔ آئندہ چند روز کے دوران روبی نے مجھے دیگر والدین سے ملوایا جو اس قسم کے خدشات کا شکار تھے اور انہیں پولیس پر یقین نہیں تھا۔ جب میں نے تجویز دی کہ ہم محلے والوں کے مسائل پیش کرنے کے لیے ڈسٹرکٹ کمانڈر کو ایک میٹنگ میں بلائیں تو سب مان گئے۔ جب ہم تشہیر کے متعلق بات کررہے تھے تو ایک عورت نے کہا کہ جس بلاک میں لڑکے کو گولی ماری گئی وہاں ایک باپٹسٹ گرجا گھر تھا، اور وہاں کا پاستور ریورینڈ رینالڈز شاید دعائیہ اجتماع میں اس میٹنگ کا اعلان کرنے کو تیار ہو جائے۔

میں پورے ہفتے کے دوران فون کالز کرتا رہا، لیکن جب ریورینڈ رینالڈز تک رسائی ہوئی تو اس نے کافی امید دلائی۔ میں جوش سے بھر گیا اور اگلے روز صبح سویرے ریورینڈ رینالڈز کے گرجا گھر میں پہنچا۔ مجھے ایک بڑے سے کانفرنس روم میں بٹھایا گیا۔ جلد ہی ایک دراز قد اور خوبرو آدمی

اندر آیا اور ہاتھ ملاتے ہوئے بولا، ''تم برادر اوباما ہو نا۔ میں ریورینڈ رینالڈز۔ تم بروقت پہنچ گئے...... ہم ابتدا کرنے ہی والے تھے۔'' اس روز مختلف گرجا گھروں کے نمائندوں کا اجلاس تھا۔

ہم سب ایک لمبی میز کے گرد بیٹھ گئے اور رینالڈز نے ایک دعا کروانے کے بعد مجھے اپنی بات پیش کرنے کی دعوت دی۔ اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے میں نے منسٹرز کو کنگوں اور مجوزہ میٹنگ کے متعلق بتایا، ساتھ ہی میں نے انہیں پمفلٹ بھی دیے تاکہ وہ اپنے اپنے گرجا گھروں میں بانٹ سکیں۔ میں نے کہا، ''آپ کی زیر قیادت یہ کام ہر قسم کے مسائل پر تعاون کی جانب پہلا قدم ثابت ہو سکتا ہے۔ سکولوں کی مرمت، علاقے کے لوگوں کے لیے روزگار.....''

ابھی میں انہیں پمفلٹ پکڑا ہی رہا تھا کہ ایک دراز قد آدمی اندر آیا جس نے سنہری چشمہ لگا رکھا تھا۔ اس کے بال نفاست سے کنگھا کر کے پچھلی طرف باندھے ہوئے تھے۔

ریورینڈ رینالڈز نے کہا، ''برادر سالٹز۔ افسوس کہ تم ایک زبردست تجویز سے محروم رہ گئے۔ یہ نوجوان، برادر اوباما حالیہ گینگ شوٹنگ کے حوالے سے ایک میٹنگ کرنا چاہتا ہے۔''

ریورینڈ سالٹز نے اپنے لیے کافی ڈالی اور پمفلٹ پہ نظر ڈالتے ہوئے بولا: ''تمہاری تنظیم کا کیا نام ہے؟''

''ڈویلپنگ کمیونٹیز پروجیکٹ۔''

''ڈویلپنگ کمیونٹیز.....'' اس نے چبا چبا کر کہا۔ ''میرے خیال میں میں اس کے متعلق ایک گورے آدمی کو بات کرتے ہوئے سن چکا ہوں۔ وہ مزاحیہ قسم کا تھا۔ یہودی نام تھا۔ تمہارا تعلق کیتھولکس سے ہے نا؟''

میں نے اسے بتایا کہ علاقے کے کچھ کیتھولک گرجا گھر سے بھی تعلق رکھتے تھے۔

''ٹھیک ہے، مجھے یاد آ گیا۔'' ریورینڈ سالٹز نے کافی کا گھونٹ بھرا اور اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ ''میں نے اس گورے سے کہا تھا کہ وہ اپنا سامان باندھ کر چلتا بنے۔ ہمیں یہاں اس قسم کی کسی سرگرمی کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''میں......''

''سنو..... ذرا اپنا نام دوبارہ بتانا؟ اوباما؟ سنو، اوباما، تمہاری نیت ضرور صاف ہوگی اور مجھے اس بارے میں یقین ہے۔ لیکن ہم گوروں کی دولت اور کیتھولک گرجا گھروں اور یہودی تنظیموں

سے اپنے مسائل کے حل کی کوئی امید نہیں رکھتے۔ انہیں ہم میں کوئی دلچسپی نہیں۔ اس شہر میں کلیسیائی حلقوں پر کٹر نسل پرستوں کا راج ہے۔ ہمیشہ سے رہا ہے۔ گورے یہاں آتے اور ہمیں بتاتے ہیں کہ کونسی چیز ہمارے لیے بہتر ہے۔ وہ تم جیسے گفتگو کے ماہر پڑھے لکھے نوجوانوں کو نوکری پر رکھ لیتے ہیں جنہیں خود بھی کچھ زیادہ پتا نہیں ہوتا۔ وہ بس معاملات کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں۔ یہ سب ایک سیاسی کھیل ہے، اور اس گروپ کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔''

میں نے اصرار کیا کہ گرجا گھر ہمیشہ سے برادری کے مسائل اٹھانے میں پیش پیش رہا ہے۔

لیکن ریورینڈ سالٹز نے سر ہلاتے ہوئے کہا، ''تم نہیں سمجھو گے۔ نئے میئر کے آنے سے حالات بدل گئے ہیں۔ میں ڈسٹرکٹ پولیس کمانڈر کو بہت عرصے سے جانتا ہوں۔ اس علاقے کا منتخب نمائندہ سیاہ فاموں کو اقتدار میں لانا چاہتا ہے۔ ہمیں اپنے ہی لوگوں کے خلاف احتجاج کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

کمرے میں موجود باقی سب لوگ خاموش تھے۔ ریورینڈ سالٹز مسکرایا اور میرے کندھے پر تھپکی دی۔ ''میری بات کا غلط مطلب نہ لو۔ ہمیں اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ میں بس یہی کہہ رہا ہوں کہ اس وقت تم غلط طرف کھڑے ہو۔''

میں بیٹھ گیا اور جلنے بھننے لگا۔ پاستور دیگر معاملات پر گفتگو میں لگ گئے۔ میٹنگ ختم ہونے پر ریورینڈ رینالڈز اور چند دیگر نے میرا شکریہ ادا کیا۔

ایک نے مجھے کہا، ''چارلس کو زیادہ سنجیدگی سے نہ لو۔ وہ کبھی کبھی بہت سخت ہو جاتا ہے۔''

لیکن میں نے دیکھا کہ ان میں سے کوئی بھی میرے دیے ہوئے پوسٹرز ساتھ نہیں لے کر گیا تھا۔

میں ہفتہ بھر فون پر ان سے رابطے کی کوشش کرتا رہا، مگر سیکریٹریوں نے یہی کہا کہ وہ دفتر سے باہر ہیں۔

بہر حال ہم نے پولیس کے ساتھ میٹنگ کی جو چھوٹی سی تباہی ثابت ہوئی۔ صرف تیرہ لوگ آئے اور زیادہ تر کرسیاں خالی پڑی رہیں۔ ڈسٹرکٹ کمانڈر نے خود آنے کے بجائے کمیونٹی ریلیشنز آفیسر کو بھجوا دیا تھا۔ ہمیں والدین کے نظم و ضبط کے متعلق پولیس والے کا لیکچر سننا پڑ گیا۔

میٹنگ کے وسط میں مارٹی پہنچا۔

میٹنگ ختم ہونے پر وہ آیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''بہت برا لگ رہا ہے نا؟''

واقعی ایسا تھا۔ اس نے مجھے صفائی کرنے میں مدد دی اور پھر کافی پلانے لے گیا۔ اس نے چند غلطیوں کی نشاندہی کی۔ گینگز کا مسئلہ اس قدر عمومی تھا کہ لوگ اس سے متاثر نہیں ہو سکتے تھے...... مسائل کو ٹھوس، مخصوص اور قابل کر لینے والا ہونا چاہیے۔ مجھے چاہیے تھا کہ روبی کو زیادہ تیار کرتا اور کم تعداد میں کرسیاں رکھتا۔ نیز مجھے کمیونٹی کے راہنماؤں سے واقفیت پیدا کرنے میں مزید وقت لگانا چاہیے تھا۔ محض پمفلٹ لوگوں کو برسات بھری رات میں گھر سے باہر نہیں لا سکتے تھے۔

مارٹی نے میرا حوصلہ بڑھایا: ''تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ تم نے بہت جلد سبق سیکھ لیا۔''

ہاں، لیکن کیسا سبق؟ مارٹی کو جاتے ہوئے دیکھتے وقت میں نے سارے دن کی کارروائی کے متعلق سوچا۔ ہر منظر میں ایک اپنا سبق موجود تھا، ہر مرحلے کی مختلف تعبیریں کی جا سکتی تھیں۔ ہم لوگ آنکھیں بند کر کے ایک ہی الفاظ بولتے جاتے تھے، لیکن اپنے اپنے دل میں اپنے اپنے آقاؤں سے التجا کرتے؛ ہم سب اپنی یادوں کے اسیر تھے؛ ہم سب اپنے اپنے احمقانہ سحر میں کھوئے ہوئے تھے۔

مارٹی اور سالٹز دونوں جانتے تھے کہ مذہب کی طرح سیاست میں بھی قطعیت کا نام سیاست ہے......اور صرف ایک شخص کی مطلق حیثیت ہمیشہ دوسرے کے لیے خطرہ بنی رہتی ہے۔

میں نے وہیں کھڑے کھڑے خود کو ایک ملحد محسوس کیا۔ لیکن ملحد بھی کسی نہ کسی چیز پر یقین رکھتا تھا۔ کم از کم اسے اپنے شک کی صداقت پر تو یقین ہوتا تھا۔ میں اس سے بھی محروم تھا۔

نواں باب

میدانِ عمل

Altgeld گارڈنز پبلک ہاؤسنگ پروجیکٹ شکاگو کے انتہائی جنوبی کنارے پر تھا: دو منزلہ عمارتوں کے ایک سلسلے میں دو ہزار اپارٹمنٹس۔ وہاں رہنے والا ہر شخص پروجیکٹ کو مختصراً "دی گارڈنز" کہتا تھا۔ البتہ اس علاقے میں نام کے مطابق کچھ بھی نہیں تھا۔ اسے تازہ مٹی سے بھرا ہوا علاقہ کہنا زیادہ مناسب تھا۔

البتہ جنوب کی طرف کچھ ایک درخت لگے تھے، اور قریب ہی بہتے ہوئے Calumet دریا کے کنارے آپ کبھی کبھی کچھ آدمیوں کو گہرے رنگ کے پانی میں مچھلیاں پکڑتے دیکھ سکتے تھے۔ لیکن اس پانی میں تیرنے والی مچھلیوں کا رنگ بدنما ہو چکا تھا۔ لوگ نہایت مجبوری کی حالت میں ہی اپنی شکار کی ہوئی مچھلیاں کھاتے۔

شمال کی طرف میٹروپولیٹن سینیٹری ڈسٹرکٹ کا سیوریج ٹریٹمنٹ پلانٹ واقع تھا۔ مٹی کی ایک طویل دیوار پر پودے لگانے کی ناکام کوشش کی گئی تھی۔ لیکن حکام بدبو کا کوئی علاج نہ کر سکے۔ ہوا کے رخ اور درجۂ حرارت کے حساب سے بدبو کی شدت میں کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔ چاہے آپ کھڑکیاں کتنی ہی دبا کر بند کر لیں، مگر بدبو اندر آ ہی جاتی۔

بدبو، زہریلے مادے، خالی اور غیر آباد زمین۔ گزشتہ ایک سو سال کے دوران گارڈنز کے آس پاس چند مربع میل کے علاقے میں سینکڑوں فیکٹریاں قائم ہوئی تھیں۔ یہ لوگوں کی زیادہ اجرت والی تنخواہوں کی قیمت تھی۔ اب نوکریاں ختم ہونے اور ان لوگوں کے چلے جانے پر اس علاقے کو بطور ڈمپ (کوڑا پھینکنے کے لیے) استعمال کرنا فطری امر لگتا تھا۔

ڈمپ..... غریب کالوں کو بسانے کے لیے ایک موزوں جگہ۔ حکومت نے یکے بعد دیگرے کئی فلاحی اور تعمیراتی منصوبے شروع کیے، لیکن گارڈنز اب بھی بدحال لگتے تھے۔ خراب چھتیں، ٹوٹے ہوئے پائپ، ناکارہ ٹوائلٹس، گرد آلود سڑکیں، مرجھائے ہوئے پودے۔ شکاگو ہاؤسنگ اتھارٹی کے عملے نے کسی دیکھ بھال کا دکھاوا کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ گارڈنز میں جوان ہونے والے بہت سے بچوں نے کبھی باغ کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔

میں Our Lady of the Gardens Church کے سامنے رکا۔ میں سرکردہ افراد سے ملنے وہاں گیا تھا تاکہ اپنی تنظیم سازی کی کوششوں کے سلسلے میں ان کے مسائل پر بات کر سکوں۔ میں نے گھڑی دیکھی: دو بج کر دس منٹ۔ معاملات سے نمٹنے کی حقیقی کوشش کا وقت آ گیا تھا۔ میں کار سے اترا اور چرچ کے دروازے پر لگی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ اینجلا باہر آئی اور مجھے ایک کمرے میں لے گئی جہاں دیگر سرکردہ افراد انتظار کر رہے تھے: شرلی، مونا، ولبر، میری، کالے بالوں والی ایک گوری استانی جو سینٹ کیتھرائن میں پڑھاتی تھی۔

میں نے بیٹھتے ہوئے کہا، "سو۔ سب کے چہرے کیوں لٹکے ہوئے ہیں؟"

"ہم یہ سب چھوڑ رہے ہیں،" اینجلا نے کہا۔

"کون چھوڑ رہا ہے؟"

اینجلا نے کندھے اچکائے۔ "میں کم از کم اپنے بارے میں تو یہ کہہ سکتی ہوں، باقی سب کی نمائندگی نہیں کر سکتی۔"

میں نے کمرے میں نظر ڈالی۔ دیگر راہنماؤں نے نظریں پھیر لیں، جیسے کوئی جج ناپسندیدہ فیصلہ سناتے وقت کرتا ہے۔

اینجلا کی آواز بھر آئی، "آئی ایم سوری، بارک۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ مگر سچی بات ہے کہ ہم تھک گئے ہیں، بس۔ ہم سب دو سال سے اس کام میں لگے ہیں اور ہم کوئی کارکردگی نہیں دکھا سکے۔"

"میں جانتا ہوں کہ تم لوگ بے قرار ہو، اینجلا۔ ہم سب کچھ مایوس بھی ہیں۔ لیکن ہمیں مزید انتظار کر لینا چاہیے۔ ہم....."

شرلی نے میری بات کاٹ دی، "ہمارے پاس مزید وقت نہیں ہے۔ ہم اپنے لوگوں سے

کب تک جھوٹے وعدے کرتے رہیں گے، اور پھر کچھ بھی نہیں ہوگا؟ ہمیں فوراً کچھ چاہیے۔''

میں کافی کا کپ ہاتھ میں پکڑے کچھ کہنے کے لیے الفاظ سوچتا رہا۔ مجھے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ تب بوکھلاہٹ کی جگہ غصے نے لے لی۔ مارٹی پر غصہ کہ وہ مجھے شکاگو لایا اور اس سب میں دھکیل دیا۔ اپنے اوپر غصہ کہ میں نے ایک پل بنانے کا بے بنیاد خواب دیکھا۔ مجھے اچانک ہوائی میں ایک رات کو فرینک کی کہی ہوئی بات یاد آئی۔

اس نے کہا تھا: یہ سب بس ایسا ہی ہے۔ تم بھی عادی ہو جاؤ گے۔

میں نے کھڑکی سے باہر نظر ڈالی اور نوجوان لڑکوں کے ایک ٹولے کو دیکھا۔ وہ ایک خالی مکان کی کھڑکی پر پتھر مار رہے تھے۔ میں واپس اینجلا کی جانب متوجہ ہوا۔

''میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ تمہارے خیال میں وہاں باہر کھڑے ان بچوں کا کیا بنے گا؟''

''بارک.....''

''نہیں، میں نے تو بس تم سے ایک سوال پوچھا ہے۔ تم بھی یہاں رہنے والے بہت سے لوگوں کی طرح لہر رہی ہو کہ تم تھک گئی ہو۔ لہٰذا میں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ان لڑکوں کا کیا بنے گا۔ انہیں انصاف دلانے کی یقین دہانی کون کروائے گا؟ سماجی کارکن؟ گینگ؟''

مجھے اپنی آواز بلند ہوتی محسوس ہوئی۔ ''تم جانتی ہو کہ میں صرف نوکری کی خاطر یہاں نہیں آیا۔ میں اس لیے یہاں آیا کیونکہ مارٹی نے کہا تھا کہ لوگ اپنے گردونواح میں تبدیلی لانے کی خاطر کچھ کرنے کو تیار ہیں۔ مجھے کوئی پروا نہیں کہ ماضی میں کیا ہوتا رہا ہے۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ میں یہاں موجود ہوں اور تمہارے ساتھ مل کر کام کرنے کا عزم رکھتا ہوں۔ اگر کوئی مسئلہ ہے تو ہم اسے دور کر لیں گے۔ اگر تمہارے خیال میں میرے ساتھ کام کرنے کے [illegible] کچھ بھی نہیں ہوگا تو سب سے پہلے میں چھوڑ کر جاؤں گا۔ لیکن اگر تم سب اس وقت چھوڑنے کا منصوبہ بنا رہے ہو تو میں اس کی وجہ جاننا چاہتا ہوں۔''

میں اتنا کہہ کر رک گیا اور ان کے چہروں کو پڑھنے کی کوشش کی۔ وہ میرے اچانک ردعمل پر حیرت زدہ تھے۔ البتہ ان میں سے کوئی بھی مجھ سے زیادہ حیران نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میری حیثیت بہت نازک تھی؛ میں ان میں سے کسی کے بھی اتنا قریب نہیں تھا کہ کسی جوابی ردعمل

کے متعلق یقین سے کچھ کہہ سکتا۔ اس مخصوص موقعے پر میرے پاس اور کوئی داؤ نہیں تھا۔ باہر گلی میں کھڑے لڑکے آگے چلے گئے۔ شرلی نے اپنے لیے مزید کافی ڈالی۔ آخر کار کوئی دس منٹ بعد ولبر بولا:

''مجھے باقیوں کے بارے میں تو نہیں پتا، لیکن میرے خیال میں ہم اسی بکواس پر کافی طویل گفتگو کر چکے ہیں۔ مارٹی جانتا ہے کہ ہمیں مسائل درپیش ہیں۔ اسی لیے اس نے بارک کو ملازمت پر رکھا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا، بارک؟''

میں نے محتاط انداز میں سر ہلایا۔

وہ میری جانب مڑتے ہوئے بولا، ''حالات اب بھی بہت خراب ہیں۔ کچھ بھی نہیں بدلا۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ اب ہمیں آگے کیا کرنا ہوگا۔''

میں نے اسے سچ سچ بتایا۔ ''مجھے نہیں معلوم، ولبر۔ تم بتاؤ۔''

ولبر مسکرایا، اور میں نے محسوس کیا کہ سنگین بحران گزر گیا تھا۔ اینجلا مزید کچھ ماہ کوشش کرنے پر تیار ہو گئی۔ میں نے گارڈنز میں کچھ مزید وقت لگانے پر رضامندی ظاہر کی۔ ہم نے اگلا نصف گھنٹہ حکمت عملی اور طریقہ کار پر بات چیت کرتے ہوئے گزارا۔ باہر جاتے وقت مونا آئی اور مجھے بازو سے پکڑ لیا۔

''بارک، تم نے میٹنگ کو بڑے اچھے طریقے سے نمٹایا۔ لگتا ہے کہ تم کافی سوچ سمجھ کر عمل کر رہے ہو۔''

''نہیں، ایسا نہیں ہے۔ مجھے کچھ بھی معلوم نہیں۔'' وہ ہنسی۔ ''اچھا، میں وعدہ کرتی ہوں کہ کسی کو نہیں بتاؤں گی۔''

''میں تمہاری قدر کرتا ہوں، مونا۔ میں دل سے تمہاری قدر کرتا ہوں۔''

اس رات کو میں نے مارٹی کو کال کی اور ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ اسے کوئی حیرت نہ ہوئی: مضافات کے بہت سے گرجا گھر پہلے ہی الگ ہونا شروع ہو چکے تھے۔ اس نے مجھے گارڈنز میں روزگار کے مسئلے پر بات چیت کے لیے کچھ مشورے دیے۔ تب اس نے ہدایت کی کہ ملاقاتوں کی تعداد اور رفتار میں اضافہ کر دوں۔

''بارک، تمہیں کچھ نئے سرکردہ افراد تلاش کرنا ہوں گے۔ میرا مطلب ہے کہ ولبر ایک زبردست آدمی ہے، لیکن کیا تمہیں تنظیم کو قائم رکھنے کے لیے واقعی صرف اس پر انحصار کرنے کی ضرورت ہے؟''

''مجھے مارٹی کا نکتہ سمجھ آ گیا۔ اگرچہ میں ولبر کو پسند کرتا اور اس کی کاوشوں کی قدر کرتا تھا، لیکن اس کے کچھ ایک نظریات نہایت خود پرستانہ تھے۔ وہ دن کے کام کے اختتام پر تمباکونوشی کرتا (''اگر خدا کو ہماری تمباکونوشی پسند نہ ہوتی تو وہ کرۂ ارض پر اسے پیدا ہی نہ کرتا'')۔ وہ اگر کسی میٹنگ میں بوریت محسوس کرتا تو فوراً چپ چاپ کھسک جاتا۔ جب بھی میں اسے ساتھ لے کر لوگوں سے ملاقات کرنے گیا تو وہ ہمیشہ ان کے ساتھ صحیفے کی غلط تفہیم پر بحث کرنے لگتا، انہیں بتاتا کہ ان میں کوئی کھاد ڈالنا درست ہے، یا انکم ٹیکس کی آئینی حیثیت کیا ہے (اس کا خیال تھا کہ ٹیکس بل آف رائٹس کی خلاف ورزی تھا اور اس کی ادائیگی سے انکار کر دینا چاہیے)۔

ایک مرتبہ میں نے اس سے کہا تھا، ''ہوسکتا ہے کہ اگر تم دوسرے لوگوں کو بولنے کا زیادہ موقعہ دو تو وہ زیادہ عمل کر سکیں۔''

ولبر نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا، ''میں غور سے ہی سنتا ہوں۔ یہی تو مسئلہ ہے۔ وہ سب باتیں غلط کہتے ہیں۔''

اب گارڈنز والی میٹنگ کے بعد ولبر کے پاس ایک نیا خیال تھا۔ ''سینٹ کیتھرائن گرجا گھر کے اندر یہ ملے جلے نیگرو کچھ بھی نہیں کریں گے۔ اگر ہمیں کچھ کرنا ہے تو معاملہ سڑکوں پر لانا ہوگا!'' اس نے نشان دہی کی کہ سینٹ کیتھرائن کے آس پاس رہنے والے بہت سے لوگ بے روزگار تھے؛ ہمیں انہی لوگوں کو ہدف بنانا چاہیے تھے۔ اور چونکہ وہ کسی بیرونی گرجا گھر کے زیر اہتمام میٹنگ میں راحت محسوس نہیں کرتے، اس لیے ہمیں سلسلہ وار چھوٹی چھوٹی میٹنگز کرنی چاہیے تھیں۔

شروع میں میں متشکک تھا، لیکن کسی بھی اقدام کی حوصلہ شکنی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سو میں نے ولبر اور میری کو ایک پمفلٹ تیار کرنے میں مدد دی تاکہ وہ گرجا گھر سے قریب ترین بلاک میں بانٹا جا سکے۔ ایک ہفتے بعد ہم تینوں ایک گلی کی نکڑ پر کھڑے ہوئے تھے۔ شروع میں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ مرد اور عورتیں آنا شروع ہو گئے۔ جب بیس کے قریب لوگ جمع ہوئے تو ولبر نے بتایا کہ سینٹ کیتھرائن گرجا گھر بھی اس تنظیمی کاوش میں شریک ہے اور ''ہم آپ کے پڑوسیوں کو بھی

آپ کے درمیان زیر بحث تمام معاملات سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔''

ایک عورت بولی: ''ٹھیک ہے۔ میں تو بس اتنا ہی کہوں گی کہ سارا مسئلہ وقت کا ہے۔''

لوگ کوئی ایک گھنٹے تک گٹروں، سیوریج، سٹاپ کے سائن بورڈز اور متروکہ پارکنگز کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ سہ پہر گزری اور شام ہونے لگی تو ولبر نے اعلان کیا کہ اگلے ماہ کے آغاز سے یہ میٹنگ سینٹ کیتھرائن گرجا گھر کے تہ خانے میں ہوا کرے گی۔ واپس گرجا گھر کی طرف آتے ہوئے میں نے مجمعے کو آپس میں باتیں کرتے سنا۔ ولبر مجھے دیکھ کر مسکرایا۔

''میں نے کہا تھا نا۔''

ہم نے تین، چار اور پانچ بلاکس میں اسی قسم کی میٹنگز کیں۔ جب ہم کمرے کے اندر میٹنگ کرنے لگے تو کوئی تیس لوگوں کا گروپ بن چکا تھا جو محض کافی کا کپ پینے کے علاوہ بھی کچھ کام کرنا چاہتے تھے۔

اس قسم کی ایک میٹنگ سے قبل میں نے میری کو گرجا گھر کے ہال میں اکیلے بیٹھے پایا۔ شام کا ایجنڈا نفاست سے کاغذ پہ لکھ کر ٹیپ سے دیوار پر چپکایا گیا تھا۔ میری نے ہاتھ ہلایا اور الماری میں چینی ڈھونڈنے لگی۔ اس نے بتایا کہ ولبر کو کچھ دیر ہو جائے گی۔

''میری مدد چاہیے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''تمہارا ہاتھ وہاں تک جاتا ہے؟''

میں نے سب سے اوپر والے شیلف سے چینی اتاری۔ ''اور کچھ؟''

''نہیں، میرے خیال میں باقی سب سیٹ ہو چکا ہے۔''

میں کرسی پہ بیٹھ کر میری کو کپ ترتیب دیتے ہوئے دیکھنے لگا۔ میری کو سمجھنا مشکل تھا۔ وہ اپنی ذات یا اپنے ماضی کے متعلق زیادہ بات نہیں کرتی تھی۔ مجھے علم تھا کہ وہ ہمارے ساتھ مل کر کام کرنے والی شہر سے آئی ہوئی واحد سفید فام کارکن ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کی دو بیٹیاں ہیں: ایک دس سال اور دوسری بارہ سال کی۔ چھوٹی بیٹی کسی معذوری کے باعث ٹھیک طرح چل نہیں سکتی تھی اور اسے متواتر علاج کی ضرورت تھی۔

اور مجھے معلوم تھا کہ بچیوں کا باپ ساتھ نہیں رہتا، البتہ میری نے کبھی بھی اس بارے میں نہ بتایا۔ کئی ماہ کے دوران تھوڑا تھوڑا کر کے ہی مجھے پتا چلا کہ اس نے انڈیانا کے ایک چھوٹے سے

قصبے میں پرورش پائی تھی اور اس کا خاندان آئرش تھا۔ اسے کسی سیاہ فام آدمی سے محبت ہو گئی اور دونوں نے خفیہ طور پر شادی کر لی؛ میری کے گھر والوں نے اس سے قطع تعلق کر لیا، اور نو بیاہتا جوڑا اس علاقے میں رہنے آ گیا۔ انہوں نے ایک چھوٹا سا گھر خرید لیا تھا۔ تب وہ آدمی چھوڑ کر چلا گیا اور میری نے خود کو ایک انجان دنیا میں تنہا کھڑے پایا۔ اس کے پاس بس اپنا مکان اور دو بیٹیاں تھیں۔ وہ اپنی جانی پہچانی دنیا میں واپس جانے کے قابل نہیں رہی تھی۔

کبھی کبھی میں ہیلو ہائے کی غرض سے میری کے مکان پر رک جاتا؛ شاید وہاں کی تنہائی اور اپنی ماں کے حالات سے مشابہت مجھے اپنی جانب کھینچتی تھی۔ میری اور اس کی بیٹیاں بالکل بے سہارا بھی نہیں تھیں۔ شوہر کے جانے کے بعد پڑوسیوں نے بچوں پر کافی محبت نچھاور کی۔ وہ ٹپکتی ہوئی چھت مرمت کرنے میں ہاتھ بٹاتے، باربی کیو اور سالگرہ کی تقریبات میں بلاتے، میری کی خدمات کو سراہتے۔ مگر میری اور اڑوس پڑوس کے لوگوں کے درمیان کچھ ان کہی حدود موجود تھیں۔ اس کی واحد بہترین دوست اس کی اپنی بیٹیاں تھیں۔

میٹنگ کی تمام تیاری مکمل ہو جانے پر میری بیٹھ گئی اور مجھے کچھ نوٹس لکھتے ہوئے دیکھا۔

''بارک، اگر میں تم سے کچھ پوچھوں تو تم برا تو نہیں مانو گے؟''

''نہیں، پوچھو۔''

''تم یہاں کیوں آئے ہو؟ میرا مطلب ہے کہ یہ کام کیوں کر رہے ہو؟''

''شان و شوکت کے لیے۔''

''نہیں۔ میں سنجیدہ ہوں۔ تم نے خود کہا تھا کہ تمہیں اس نوکری کی ضرورت نہیں۔ اور تم زیادہ مذہبی بھی نہیں ہو۔ ہے نا؟''

''ہاں....''

''تو پھر تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟ اسی لیے تو ولبر اور میں بھی کر رہے ہیں۔ کیونکہ یہ ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔ لیکن تمہارے معاملے میں، میں نہیں سمجھتی کہ......''

اسی لمحے دروازہ کھلا اور ادھیڑ عمر مسٹر گرین اندر آیا۔

''کیسے ہو، مسٹر گرین۔''

''بالکل ٹھیک۔ بس ذرا سردی لگ رہی ہے....''

جلد ہی مسٹر البرٹ اور مسز ٹرنر بھی آ گئے، اور پھر باقی کا گروہ۔ سب لوگ قبل از وقت سرما کی آمد کے باعث گچھا مچھا ہو رہے تھے۔ انہوں نے اپنے کوٹوں کے بٹن کھولے، کافی بنائی اور چھوٹی موٹی بات چیت میں لگے گئے جس سے کمرے کا ماحول کچھ گرم ہوا۔ آخر کار ولبر بھی آیا اور مسز جیفری کو دعا کروانے کا کہا تاکہ میٹنگ کا آغاز کیا جا سکے۔ جب سب لوگ گفتگو کر رہے تھے تو میں نوٹس لیتا رہا۔ میں صرف تبھی کچھ بولتا جب گفتگو موضوع سے ہٹنے لگتی۔ درحقیقت میں میٹنگ کو ضرورت سے زیادہ طول پکڑتا محسوس کر رہا تھا۔ چند لوگ کوئی ایک گھنٹے بعد کھسک گئے تھے۔

آخر کار میٹنگ اختتام پذیر ہوئی۔ میں نے ولبر اور میری کو کرسیاں واپس رکھنے اور کافی کا برتن صاف کرنے وغیرہ میں مدد دی۔ باہر کافی سردی تھی۔ میں نے اپنا کالر سیدھا کر لیا اور فوراً میٹنگ کی قدر و قیمت پر غور کرنے لگا۔ ولبر اپنی بائیک پہ بیٹھ کر چلا گیا اور میں نے میری کو گھر چھوڑنے کے لیے اپنے ساتھ کار میں بٹھا لیا۔ اس کے گھر کے سامنے رکے تو وہ اتر کر چل دی۔ میں نے پیچھے سے آواز دی۔

''ہے، میری۔''

وہ واپس آئی اور جھک کر شیشے سے اندر دیکھا۔

''تم مجھ سے پوچھ رہی تھی نا کہ میں یہاں کام کرنے کیوں آیا ہوں۔ اس کا تعلق آج رات کی میٹنگ سے تھا۔ میرا مطلب ہے کہ..... میرے خیال میں ہمارے کام کرنے کی وجہ میں زیادہ فرق نہیں۔''

میری نے سر ہلایا اور گھر کی طرف چلی گئی۔

ایک ہفتے بعد میں واپس گارڈنز میں آیا اور اینجلا، مونا اور شرلی کو اپنی چھوٹی سی کار میں لادا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھی مونا نے جگہ تنگ ہونے کی شکایت کی۔

''ویسے یہ کس نسل کی کار ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ ان دبلی پتلی لڑکیوں کے لیے بنی ہے جن کے ساتھ بارک سیر کرنے جاتا ہے۔'' شرلی نے جواب دیا۔

''ہم دوبارہ کس سے ملنے جا رہے ہیں؟''

میں نے تین میٹنگز کا شیڈول بنا رکھا تھا تا کہ روزگار کے حوالے سے مقامی لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے حکمت عملی بنا سکوں۔ بڑے صنعت کار مضافاتی علاقوں میں چلے گئے تھے اور انہیں واپس گارڈنز کے نواح میں لانا ناممکن تھا۔ دوسری طرف معشت کا ایک ''مقامی'' حصہ بدستور موجود تھا...... دکانیں، ریسٹورنٹ، تھیئٹر اور خدمات۔

علاقے سے قریب ترین شاپنگ سنٹر روز لینڈ میں تھا، چنانچہ ہم بس ٹ پر چلتے ہوئے مشی گن ایونیو گئے اور ایک دومنزلہ سابق گودام کے سامنے رکے۔ ہم عمارت کے اندر داخل ہوئے اور تہ خانے میں پرانے فرنیچر سے بھرے ایک کمرے میں پہنچے۔ چھوٹے سے دفتر میں بڑے بڑے کانوں والا ایک دبلا پتلا آدمی بیٹھا تھا۔

''کیا میں آپ کی مدد کرسکتا ہوں؟''

میں نے بتایا کہ ہم کون ہیں اور اس سے فون پر بات کر چکے ہیں۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' اس نے اپنے ڈیسک کی دونوں جانب کھڑے دو دراز قد آدمیوں کو اشارہ کیا اور وہ ہمارے پاس سے گزر کر چلے گئے۔ ''سنو، ہم ذرا جلدی جلدی بات کرلیں کیونکہ مجھے کام کرنا ہے۔ رفیق الشہباز۔''

''میں آپ کو جانتی ہوں۔'' شرلی نے رفیق سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ''آپ مسز تھامسن کے بیٹے والی (Wally) ہیں۔ آپ کی ماما کا کیا حال ہے؟''

رفیق زبردستی مسکرایا اور ہمیں بیٹھنے کو کہا۔ اس نے وضاحت کی کہ وہ روز لینڈ یونٹی نامی ایک تنظیم کا صدر تھا جو سیاہ فاموں کے نصب العین کو فروغ دینے کے لیے مختلف سیاسی سرگرمیوں میں مشغول تھی۔ تنظیم کا دعویٰ تھا کہ اس نے میئر واشنگٹن کو جتوانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ جب ہم نے پوچھا کہ ہمارے گرجا گھر مقامی معاشی ترقی کو کس طرح بڑھاوا دے سکتے ہیں، تو اس نے ہمیں ایک پمفلٹ دیا جس میں عرب سٹورز پر خراب گوشت فروخت ہونے کا الزام عائد کیا گیا تھا۔

رفیق نے بتایا، ''یہاں یہ اصل معاملہ ہے۔ ہماری کمیونٹی سے باہر کے لوگ ہمارے درمیان دولت کما رہے ہیں اور ہمارے بہن بھائیوں کی بے عزتی کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر یہاں کوریائی اور عرب لوگ سٹور چلا رہے ہیں، یہودی زیادہ تر عمارتوں کے مالک ہیں۔ اب قلیل مدت میں ہم یقین دہانی کرنے آئے ہیں کہ سیاہ فاموں کے مفادات نظرانداز نہ ہوں۔ جب ہمیں خبر ملتی ہے کہ

کوئی کوریائی کسی گاہک سے غلط سلوک کر رہا ہے تو ہم پہنچ جاتے ہیں۔ ہم اصرار کرتے ہیں کہ وہ ہمارا احترام کریں اور کمیونٹی کا حصہ بنیں...... ہمارے پروگراموں کے لیے فنڈ دیں۔ یہ قلیل المدت پروگرام ہے۔ یہ''...... رفیق نے دیوار پر آویزاں روز لینڈ کے نقشے کی جانب اشارہ کیا جس پر سرخ رنگ سے کچھ نشانات لگے تھے...... اور یہ طویل المدت پروگرام ہے۔ اس سب کا تعلق ملکیت سے ہے۔ علاقے کے لیے ایک جامع منصوبہ۔ سیاہ فاموں کے کاروبار، کمیونٹی سنٹرز...... پورے نوگز۔ گوروں سے کچھ جائیدادیں خریدنے کے لیے ہم نے بات چیت شروع کر رکھی ہے۔ سو اگر آپ لوگ روزگار میں دلچسپی رکھتے ہیں تو اس منصوبے کی تشہیر میں مدد دیں۔ اس وقت ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ روز لینڈ میں لوگ زیادہ مدد نہیں کر رہے۔ وہ کوئی نکتۂ نظر اپنانے کے بجائے گوروں کے پیچھے مضافاتی علاقوں میں جا رہے ہیں۔ لیکن دیکھو! گورے لوگ بے وقوف نہیں۔ وہ تو اس انتظار میں ہیں کہ ہم کب شہر چھوڑ کر جاتے ہیں تا کہ وہ واپس آ جائیں، کیونکہ انہیں ہماری جائیداد کی قیمت کا علم ہے۔''

ایک آدمی دوبارہ رفیق کے دفتر میں آیا۔ رفیق اٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے بولا، ''مجھے جانا ہے۔ لیکن ہم دوبارہ بات کریں گے۔'' اس نے باری باری ہم سب سے ہاتھ ملایا اور اپنے اسسٹنٹ کے ہمراہ چلا گیا۔

عمارت سے باہر آ کر میں نے کہا، ''شرلی، لگتا ہے کہ تم اس کو جانتی ہو۔''

''ہاں۔ وہ یہ خوب صورت نام اختیار کرنے سے پہلے والی تھامسن ہوا کرتا تھا۔ اس نے اپنا نام بدل لیا لیکن اپنے کان نہیں چھپا سکا۔ اس کی پرورش گارڈنز میں ہوئی۔ درحقیقت وہ اور ولبر شاید سکول اکٹھے جایا کرتے تھے۔ والی تھامسن مسلمان ہونے سے قبل گینگوں کی سرگرمیوں میں کافی زیادہ حصہ لیتا تھا۔''

''بدمعاش ہمیشہ بدمعاش ہی رہتا ہے،'' انجلا بولی۔

اس کے بعد ہم مقامی چیمبر آف کامرس میں گئے جو ایک دکان کی بالائی منزل پر واقع تھا۔ اندر ایک فربہ سیاہ فام آدمی ملا جو ڈبے پیک کرنے میں مصروف تھا۔

''ہم مسٹر فارسٹر سے ملنے آئے ہیں،'' میں نے اس سے کہا۔

وہ اوپر دیکھے بغیر بولا، ''میں فارسٹر ہوں۔''

"ہمیں بتایا گیا ہے کہ آپ چیمبر کے صدر ہیں....."

"آپ نے ٹھیک سنا ہے۔ میں صدر تھا۔ پچھلے ہفتے میں نے استعفیٰ دیدیا۔"

اس نے ہمیں تین کرسیاں پیش کیں اور گفتگو کے دوران کام کرتا رہا۔ اس نے بتایا کہ وہ پندرہ سال سے ایک سٹیشنری سٹور کا مالک تھا اور پچھلے پانچ سال کے دوران چیمبر کا صدر رہا۔ اس نے مقامی تاجروں کو منظم کرنے کی بہترین کوشش کی، لیکن معاونت نہ ہونے کے باعث مایوس ہو کر سب چھوڑ دیا۔

اس نے پنھوڑے فرش پر رکھے اور بولا، "تم مجھے کوریاؤں کے متعلق شکایت کرتے نہیں سنو گے۔ چیمبر کو بس وہی لوگ واجبات ادا کرتے ہیں۔ انہیں کاروبار کی سمجھ ہے۔ وہ اپنی دولت کو ایک جگہ جمع کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو قرضے دیتے ہیں۔ اور ہم ایسا نہیں کرتے۔ پتا نہیں۔ شاید ہمارے اس طرح ہونے میں ہمارا قصور نہیں۔ شاید سالہا سال کوئی موقعہ نہ ملنے کے باعث ہم ایسے ہو گئے۔ اور اب حالات اتنے آسان نہیں رہے جتنے کہ تیس سال قبل اطالویوں اور یہودیوں کے لیے تھے۔ آج کل میرے جیسے چھوٹے چھوٹے سٹورز کو بڑے بڑے سٹورز سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اگر آپ کوریاؤں والا طریقہ نہ اپنائیں تو ہار یقینی ہے...... یعنی سارا ہفتہ روزانہ سولہ گھنٹے اپنے گھر والوں کے ساتھ مل کر کام کرنا۔ ہم لوگوں میں اب ایسا کرنے کی خواہش نہیں رہی۔ میرے خیال میں ہم نے اتنا طویل عرصہ بیکار ہی گزار دیا۔ ہم اپنے بچوں سے بھی یہی کہتے ہیں کہ محنت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں خود کو مختلف نہیں سمجھتا۔ میں بھی اپنے بیٹوں سے کہتا ہوں کہ میں ان سے کاروبار نہیں کروانا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ کسی بڑی کمپنی میں کام کریں....."

واپس روانہ ہونے سے قبل اینجلا نے گارڈنز کے نوجوانوں کے لیے جز وقتی ملازمت کے امکانات کے متعلق پوچھا۔ مسٹر فارسٹر نے اس پر یوں نظر ڈالی جیسے وہ پاگل ہو۔

"یہاں کے تاجر بھی روزانہ تیس درخواستیں مسترد کرتے ہیں۔ بالغ، بوڑھے اور تجربہ کار مزدور بھی ہر قسم کا کام کرنے کو تیار ہیں۔ مجھے افسوس ہے۔"

ہم آخری میٹنگ کے لیے جاتے ہوئے کار میں بڑی خاموشی سے بیٹھے رہے۔ ہم میئرز آفس آف ایمپلائمنٹ اینڈ ٹریننگ (MET) کی مقامی شاخ کی منتظم سے ملنے جا رہے تھے۔ یہ ادارہ شہر بھر میں تربیتی پروگرام کروا رہا تھا۔ 45 منٹ کا فاصلہ طے کر کے دفتر پہنچے تو پتا چلا کہ منتظم جا

چکی تھی۔ اس کی اسسٹنٹ کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کب آئے گی۔ البتہ اس نے ہمیں چمکدار کاغذ والے بروشرز پکڑا دیے۔

شرلی دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولی، "اس طرح تو کچھ بھی نہیں ہو گا۔ شاید ہمیں بھی گھر پر ہی رہنا چاہیے۔"

مونا نے مجھے دفتر میں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے دیکھا تو پوچھا، "تم کیا دیکھ رہے ہو؟"

میں نے انہیں ایک بروشر کی پچھلی طرف دکھائی۔ وہاں شہر کے لیے MET پروگراموں کی فہرست دی گئی تھی۔ کوئی بھی پروگرام 95th سے جنوب کے علاقے میں نہیں تھا۔

"یہ ہے بات،" میں نے کہا۔

"کیا؟"

"ہمیں ایک ایشو مل گیا ہے۔"

گارڈنز واپس پہنچتے ہی ہم نے MET کی سٹی ڈائریکٹر مس سنتھیا الواریز کے نام ایک خط تیار کیا۔ دو ہفتے بعد وہ گارڈنز میں ہمارے ساتھ ملاقات کرنے کو تیار ہو گئی۔ سابقہ غلطیوں سے نپٹنے کی خاطر میں نے مقامی راہنماؤں کے ساتھ مل کر بھرپور تیاری کی، دیگر گرجا گھروں سے بھی اپنے اپنے نمائندے بھجوانے کو کہا، ایک واضح مطالبہ تیار کیا...... ایک بھرتی و تربیتی مرکز کا قیام۔

دو ہفتے تک تیاری کے بعد بھی میں شدید پریشان تھا۔ چھ بج کر پینتالیس منٹ پر صرف تین افراد آئے: ایک نوجوان عورت بچے کے ہمراہ، ایک بوڑھی عورت اور ایک نشے میں دھت آدمی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں ایک مرتبہ پھر کرسیاں خالی رہنے کی توقع کرنے لگا۔ راہنماؤں کے چہروں پر مایوسی کے سائے منڈلا رہے تھے۔

سات بجنے میں دو منٹ رہتے تھے کہ لوگ آنے لگے۔ مس الواریز کے پہنچنے تک کمرے میں کوئی ایک سو افراد موجود تھے۔ اس کے ایک ساتھی نے دروازے سے اندر آتے ہوئے کہا، "مجھے تو اس جگہ کے بارے میں معلوم بھی نہیں تھا۔ اس رات قائدین پوری طرح تیار تھے۔ اینجلا نے ایشو مجمعے کے سامنے رکھا اور مس الواریز کو وضاحت کی کہ ہم اس سے کیا چاہتے ہیں۔ جب مس الواریز نے کوئی دوٹوک جواب دینے سے گریز کیا تو مونا نے مداخلت کی اور ہاں یا نہ میں جواب مانگا۔ آخر

کارمس الواریز نے چھ ماہ کے اندر اندر علاقے میں ایک بھرتی وتربیتی مرکز بنانے کا وعدہ کیا تو مجمعے نے دل کھول کر تالیاں بجائیں۔

میٹنگ ایک گھنٹے میں ختم ہوگئی...... الواریز اور اس کے ساتھی اپنی بڑی سی نیلی کار میں چلے گئے اور لوگ مونا اور اینجلا سے ہاتھ ملانے لگے۔

اینجلا نے مجھے سینے سے لگاتے ہوئے کہا، ''تم نے زبردست کام کیا ہے، بارک۔''

''میں نے وعدہ کیا تھا کہ ہم کچھ نہ کچھ کر کے رہیں گے؟''

میں نے انہیں بتایا کہ میں کم از کم دو دن کے لیے اکیلا جا رہا ہوں اور اپنی کار کی طرف چلا گیا۔ میں نے خود سے کہا کہ میں یہ کام کر سکتا ہوں۔ میں سوچنے لگا کہ جلد ہی ہیرلڈ کے ساتھ بیٹھ کر شہر کی تقدیر پر بات چیت کر رہا ہوں گا۔ کچھ دور ہی گیا تھا کہ میٹنگ میں آنے والا بدمست شرابی بڈھا دکھائی دیا۔ وہ ایک سٹریٹ لائٹ کے نیچے گولائی میں گھوم رہا تھا۔ میں نے کار سے نکل کر پوچھا کہ کیا اسے گھر پہنچنے کے لیے میری مدد چاہیے۔

''مجھے کوئی مدد نہیں چاہیے، کسی سے بھی نہیں۔ سمجھے تم! حرام زادے، تم مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے ہو، میں تمہاری......''

آہستہ آہستہ اس کی آواز دب گئی۔ میرے کچھ مزید بولنے سے قبل ہی وہ لڑکھڑاتا ہوا تاریکی میں غائب ہوگیا۔

دسواں باب

اپنائیت اور توقیرِ ذات

موسم سرما آیا اور سارے شہر نے ایک ہی رنگ دھار لیا...... سفید زمین کے اوپر کالے درخت اور پیچھے سرمئی آسمان۔ اب سہ پہر کے وقت ہی رات کا گمان ہونے لگتا، بالخصوص برفیلے طوفانوں کے وقت۔

اس قسم کے موسم میں کام کرنا دقت طلب تھا۔ ملاقاتوں کے دوران میں کبھی جگہ اتنی کافی دیر نہ رک پاتا کہ خود کو گرم کر سکوں۔ شام کی میٹنگز میں حاضری کافی گھٹ گئی؛ لوگ آخری لمحے کال کر کے فلو یا کار سٹارٹ نہ ہونے کا بہانہ کر دیتے؛ جو لوگ آ جاتے وہ بھی افسردہ اور مایوس سے لگتے۔ کبھی کبھی میٹنگز کے لیے جاتے ہوئے میں یہ تک بھول جاتا کہ میں کہاں ہوں، میری سوچیں خاموشی کا ایک عکس تھیں۔

مارٹی نے تجویز دی کہ میں کچھ فرصت کا وقت نکالوں، نوکری سے ہٹ کر اپنی زندگی بنانے کی کوشش کروں۔ اس نے بتایا کہ یہ تشویش پروفیشنل نوعیت کی تھی: کام کے علاوہ کچھ ذاتی امداد و معاونت کے بغیر آپ کا تناظر کھو جاتا ہے اور آپ بجھ کر رہ جاتے ہیں۔ ہفتے کے اختتام پر جب مجھے کوئی کام نہ ہوتا تو اپنے خالی اپارٹمنٹ میں اکیلا بیٹھا کتابیں پڑھتا رہتا۔

البتہ میں نے مارٹی کی نصیحت پر کان نہ دھرا۔ شاید اس لیے کہ میرے اور مقامی قائدین کے درمیان روابط مضبوط ہو گئے تھے۔ میں ان کے ساتھ محض دوستی سے زیادہ گہرے رشتے میں بندھ گیا تھا۔ اتوار کے دن میں مختلف گرجا گھروں کی عبادت میں شرکت کرتا اور عورتوں کے ساتھ ہنسی مذاق بھی کرتا۔ گارڈنز میں ایک کرسمس پارٹی کے موقعہ پر میں نے اینجلا، مونا اور شرلی کے ساتھ

ڈانس کیا۔ وہ سب لوگ ایک طرح سے میرا وسیع خاندان بن گئے تھے۔

ایسے ہی موقعوں پر شناسائی یا تھکاوٹ منتظم اور راہنما کے درمیان امتیازات محو کر دیتی ہے۔ روز بروز میں ایک سبق سیکھ رہا تھا: کہ ذاتی مفاد مسائل کی فوری نوعیت سے بہت بعد میں آتا تھا، کہ ہلکی پھلکی گفتگو کی تہہ میں لوگوں کی اپنی اپنی آرا موجود تھیں۔ خوف یا حیرت سے لبریز کہانیاں ایسے واقعات پر مبنی ہوتیں جو ان کو مسلسل تنگ کر رہے ہوتے۔

شاید اسی احساس کے تحت میں نے انجام کاران لوگوں کے ساتھ اپنا آپ شیئر کرنا شروع کیا تاکہ شکاگو میں اپنی وسیع تر تنہائی میں سے باہر نکل سکوں۔ شروع میں مجھے کچھ ہچکچاہٹ ہوئی۔ میں ڈرتا تھا کہ میری سابقہ زندگی یہاں کے لوگوں کے لیے اجنبی ہوگی، کہ کہیں میرے بارے میں لوگوں کی توقعات بھوئی نہ پڑ جائیں۔ مگر لوگوں نے توت یا لولو یا میری ماں اور باپ کی کہانیاں سنیں۔ وہ سر ہلاتے، یا کندھے اچکاتے، یا ہنستے اور سوچتے کہ میرے جیسا پس منظر رکھنے والا کوئی شخص شکاگو میں موسم سرما گزارنے پر کیسے آمادہ ہوسکتا ہے۔ تب وہ کوئی جوابی کہانی سناتے اور یوں تجربات کا ندھن بندھ جاتا...... باپ کا کھو جانا، بچپن میں تجربہ کردہ کوئی جرم، دل کی آوارگی، کوئی بابرکت لمحہ۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں نے جانا کہ ان کہانیوں نے مل کر میری دنیا کو منظم کر دیا تھا۔ ان کی بدولت مجھے اپنائیت اور مقصدیت کا احساس ملا۔ مارٹی نے درست کہا تھا: اگر آپ گہرائی تک اترنے کی کوشش کریں تو برادری بن ہی جاتی ہے۔ تاہم، کام کی نوعیت بیان کرنے میں اس نے غلطی کی تھی۔ وہاں شاعری بھی موجود تھی...... سطح کے نیچے ہمیشہ ایک روشن دنیا پائی جاتی تھی، ایسی دنیا جو لوگوں نے مجھے بطور تحفہ پیش کی۔

کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مقامی راہنماؤں سے سیکھی ہوئی ہر بات نے میرے دل کو خوشی دی۔ اگر انہوں نے مجھے جذبے کی قوت دی تو ان انجانی قوتوں کو تسلیم کرنے پر بھی مجبور کیا جو ہماری کوششوں کو ناکام بناتیں۔

ایک روز کرسمس سے پہلے میں نے روبی سے کہا کہ وہ میرے دفتر سے ہوتی جائے کیونکہ میں اسے کائلی (Kyle) کے لیے ایک تحفہ دینا چاہتا ہوں۔ جب وہ اندر آئی تو میں فون پر بات کر رہا تھا۔ کن اکھیوں سے دیکھنے پر مجھے روبی میں کوئی مختلف چیز نظر آئی۔ فون ختم ہونے پر وہ میری طرف

مڑی تو اس کی آنکھیں نیلی لگیں، جیسے کسی نے پتلیوں میں نیلے بٹن جڑ دیے ہوں۔ اس نے پوچھا کہ کیا کوئی مسئلہ ہے۔

''تم نے اپنی آنکھوں کے ساتھ کیا کیا ہے؟''

''اوہ، یہ۔'' روبی نے اپنا سر ہلایا اور ہنسی۔ ''یہ کانٹیکٹ لینز ہیں، بارک۔ جس کمپنی میں میں کام کرتی ہوں وہ کاسمیٹک لینز بناتی ہے، اور مجھے سستی قیمت پر یہ مل گئے تھے۔ پسند آئے؟''

''تمہاری آنکھیں جیسی ہیں ویسی ہی اچھی لگتی ہیں۔''

یہ تو بس تفریح کے لیے ہے۔ ذرا مختلف،'' وہ نیچے دیکھتے ہوئے بولی۔

میں کھڑا سوچتا رہا کہ کیا کہوں اسے۔ آخرکار مجھے کائلی کا تحفہ یاد آیا اور اسے دیتے ہوئے کہا، ''کائلی کے لیے۔ ہوائی جہازوں کے متعلق ایک کتاب..... میں نے سوچا کہ اسے پسند آئے گی۔''

روبی نے کتاب اپنے پرس میں رکھ لی۔ ''شکریہ بارک۔ یقیناً اسے بہت پسند آئے گی۔'' پھر وہ یکدم کھڑی ہوئی اور سکرٹ سیدھی کرتی ہوئی بولی، ''اچھا تو میں چلتی ہوں'' اور تیزی سے دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

میں دو دن تک روبی کی آنکھوں کے متعلق سوچتا رہا۔ میں نے بہت خراب ردعمل دیا تھا اور اسے زندگی میں چھوٹے سے مصنوعی پن پر شرمندہ کر دیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری ذات کا ایک حصہ روبی اور دیگر قائدین سے ان امیجز کی یلغار کے خلاف مدافعت کی توقع رکھتا تھا جو ہر امریکی میں عدم تحفظ کو فروغ دے رہے تھے فیشن میگزینوں میں دبلی پتلی اور لمبی ماڈلز، تیز رفتار کاروں میں چوڑے جبڑے والے مرد۔ میں خود بھی ان امیجز کی زد میں تھا اور خود کو ان سے بچانے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ جب میں نے ایک سیاہ فام دوست عورت سے اس واقعے کا ذکر کیا تو اس نے زیادہ سخت الفاظ میں کہا:

''تمہیں حیرت کس بات پر ہوئی تھی؟ کہ کالے لوگ اب بھی خود سے نفرت کرتے ہیں؟''

میں نے اسے بتایا کہ ایسی بات نہیں۔ میں لائف میگزین میں بلیچنگ کریموں کی دریافت کے بعد حیرت زدہ نہیں ہوتا تھا۔ میں سیاہ فام برادری میں رنگ سے متعلق پائے جانے والے نکتۂ نظر کا عادی ہو گیا تھا...... اچھے بال، برے بال؛ موٹے یا پتلے ہونٹ؛ وزن زیادہ ہے یا موزوں ہے۔ کالج میں کالوں کے فیشن کی سیاست اکثر موضوع بحث بنتی۔ بالخصوص سیاہ فام لڑکیاں اس

بارے میں بات کرتی تھیں جو اپنے تشدد پسند بھائی کو کسی گوری لڑکی کے ساتھ ڈیٹ پر جانے کے لیے تڑپتے دیکھ کر حقارت سے مسکراتیں اور کالی عورتوں کے ہیئر سٹائلز پر جملہ کسنے والے کسی بھی احمق سیاہ فام مرد کو گالیاں دیتیں۔

اکثر میں ان موضوعات پر گفتگو میں حصہ نہ لیتا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ اس قسم کی گفتگو بڑے گروپس میں یا گوروں کے سامنے نہیں ہوتی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ گورے طلبا کی اکثریت والے کالجوں میں زیادہ تر سیاہ فام طلبا کی شناخت مسخ ہو چکی تھی اور ہم اپنے آپ میں تسلیم کرتے تھے کہ ہمارا سیاہ فام ہونا خرنا عمل ہے۔ لہٰذا گوروں کے سامنے کھلے عام اس کا اعتراف کرنا ہی اپنے آپ سے نفرت کا اظہار تھا۔ ظاہر ہے گوروں کو ہمارے ان نجی مسائل اور کشمکش سے کوئی سروکار نہیں ہو سکتا تھا۔

اسی تفریق کا مشاہدہ کرنے کے ذریعے میں نے سیکھا کہ سیاہ فام ہونے پر فخر کرنا تمام مسائل کا حل نہیں۔ جب میں شکاگو پہنچا تو توقیر ذات (self esteem) کے الفاظ ہر کسی کے منہ سے سننے کو ملے: کارکن، ٹاک شو کے میزبان، ماہرین تعلیم اور سوشیالوجسٹ۔ یہ اپنے دل میں پلتی ہوئی نفرتوں کا گند باہر نکالنے کا ایک سیدھا سادا طریقہ تھا۔ لیکن جب بھی میں نے توقیر ذات کے اس تصور کو دوٹوک انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی تو گفتگو دوسری طرف مڑ جاتی۔ کیا تم اپنی رنگت یا بے روزگاری کی وجہ سے اپنے آپ کو ناپسند کرتے تھے؟ یا شاید اس لیے کہ آپ کو بچپن میں پیار نہ ملا ..... کیا آپ کو صرف اپنی گہری رنگت کی وجہ سے پیار نہ ملا؟ یا اس لیے کہ آپ کی ماں ہیروئن کا نشہ کرتی تھی..... اور وہ ایسا کرتی ہی کیوں تھی؟ کیا خالی پن کا احساس گھچا گھچا بالوں کا نتیجہ تھا یا اس کا کہ آپ کے اپارٹمنٹ میں گرمائش کا مناسب انتظام نہیں تھا؟ یا کیا اپنے کائنات کو بے خدا تصور کرنے کے باعث اس خالی پن کا شکار تھے؟

ذاتی نجات کی راہ پر سفر کرتے ہوئے شاید آپ ان سوالات سے گریز نہ کر سکیں۔ مجھے تو بس اس بارے میں شک تھا کہ توقیر ذات کے بارے میں تمام گفتگو ایک مؤثر سیاہ فام سیاست کا ڈھرا بن سکتی تھی؛ اس قسم کی ایمان داری کے بغیر یہ بہ آسانی محض ایک مبہم تلقین بن کر رہ جاتی۔ میں نے دل میں سوچا کہ شاید توقیر ذات میں اضافہ ہونے پر سیاہ فام غریبوں کی تعداد کم ہو جائے، لیکن اس بارے میں کوئی شک نہیں تھا کہ غربت کا توقیر ذات سے کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ بہتر ہے کہ ایسی

چیزوں پر توجہ مرکوز کی جائے جو ہمارے درمیان اتفاق رائے پیدا کر سکیں۔ اس کالے کو کوئی مہارت یا نوکری دیں۔ اس کالے بچے کو ایک اچھے سکول میں پڑھنا سکھائیں۔ بنیادی چیزوں کا خیال رکھا جاتا تو ہم میں سے ہر شخص اپنی اپنی قدر و قیمت تلاش کر سکتا تھا۔

روبی نے میرے اس مفروضے کو ہلا کر رکھ دیا۔ نفسیات اور سیاست کے درمیان میری تعمیر کردہ دیوار منہدم ہو گئی۔ درحقیقت روبی کے ساتھ ہونے والا واقعہ روزانہ پیش آنے والے واقعات کی ایک ڈرامائی مثال ہی تھا۔ مثلاً ایک سیاہ فام راہنما نے کہا کہ وہ سیاہ فام ٹھیکے داروں کے ساتھ کام نہیں کرتا ''کیونکہ وہ سارا کام خراب کر دیتے ہیں'' یا ایک اور راہنما خاتون نے بتایا کہ وہ اپنے گرجا گھر کے دیگر لوگوں کو میٹنگ میں آنے پر اصرار نہیں کر سکتی کیونکہ ''کالے بہت کاہل ہیں، وہ کچھ کرنا ہی نہیں چاہتے۔'' اس قسم کے جملوں میں عموماً نیگرو کی جگہ کالے کا لفظ لیتا۔ ہم یہ لفظ بھی ممکنہ ذلت کے خلاف دیگر دفاعی حربوں کی طرح استعمال کرتے تھے۔

مقامی قائدین سے سنی ہوئی جدوجہد کی کہانیاں نفرت کے ایک نہایت مخصوص تجربے کی پیداوار تھیں۔ وہ نفرت ختم نہیں ہوئی تھی؛ اس نے ہر شخص کے اندر گھر کر لیا تھا اور اس کے مرکز میں گورے کھڑے تھے..... کچھ ظالم، کچھ لاعلم، کچھ ہماری زندگیوں پر حکمرانی کرنے والے نظام کے نمائندہ۔ مجھے اپنے آپ سے سوال کرنا تھا کہ سیاہ فاموں کے خوابوں کو خوفناک بنانے والے بھوت کو اجتماعی کوشش کے ذریعے نکالے بغیر کمیونٹی کے بندھنوں کو بحال کیا جا سکتا تھا یا نہیں۔ کیا روبی نیلی آنکھوں سے نفرت کیے بغیر اپنے آپ سے محبت کر سکتی تھی؟

رفیق الشہباز اپنے لیے ان سوالوں کے جواب تلاش کر چکا تھا۔ میں اس سے اکثر ملاقات کرنے لگا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا: ''بارک، ہمیں آپس میں بات کرنے کی ضرورت ہے۔ تم لوگ روزگار کی تربیت کے حوالے سے جو کوششیں کر رہے ہو انہیں مجموعی ترقیاتی منصوبے کے لحاظ سے موزوں ہونا چاہیے۔ ہم اس مسئلے کو باقی چیزوں سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھ سکتے۔ وسیع تر تناظر میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔ تم سرگرم عمل قوتوں کو نہیں سمجھتے۔ یار، یہ بہت بڑا معاملہ ہے۔ ہر قسم کے لوگ آپ کی پشت میں چھرا گھونپنے کو تیار رہتے ہیں۔''

ایک روز اس کی کال آئی۔

''کون؟''

''رفیق۔کیا معاملہ ہے، کیا میں نے بہت صبح فون کر دیا ہے۔''

ایسا ہی تھی۔ میں نے اسے ہولڈ کروایا اور اپنے لیے کافی بنائی اور پھر کہا ساری بات سمجھائے۔

اس نے بتایا کہ وہ MET کے بھرتی مرکز کے متعلق ہماری تجویز میں دلچسپی رکھتا تھا۔

لیکن جب بھی کبھی ہم رفیق کے ساتھ مشترکہ حکمت عملی پر بات کرنے بیٹھتے تو وہ خفیہ قوتوں کے بارے میں طویل لیکچر شروع کر دیتا۔ جوں جوں اس کی آواز بلند ہوتی، ویسے ویسے انجلا اور ولبر اور باقی لوگ خاموشی اختیار کرتے جاتے۔ ایک سے زائد مرتبہ میں نے بات کاٹی اور چلا کر اسے جواب دیا۔

البتہ اکیلے میں شہباز کے ساتھ میری گفتگو نسبتاً نارمل رہتی۔ آہستہ آہستہ میں اس کی مستحکم مزاجی کا مداح بن گیا۔ اس نے توثیق کی کہ وہ نوجوانی کے دوران گارڈنز میں ایک گینگ کا سرغنہ تھا؛ اسے ایک مقامی مسلم راہنما (جس کا منسٹر لوئس فرخان کی نیشن آف اسلام سے کوئی تعلق نہ تھا) کی زیرنگرانی مذہب مل گیا۔ ایک روز اس نے مجھے بتایا،''یار اگر اسلام نہ ہوتا تو میں اب تک مر چکا ہوتا۔ جانتے ہو، میرا رویہ منفی تھا۔ گارڈنز میں پرورش پاتے ہوئے میں نے گوروں کا دیا ہوا زہر پیا۔ دیکھو! جن لوگوں کے ساتھ تم کام کر رہے ہو ان کا بھی یہی مسئلہ ہے، چاہے وہ اس بارے میں نہ جانتے ہوں۔ وہ اپنی آدھی زندگیاں اسی پریشانی میں گزار دیتے ہیں کہ گورے ان کے متعلق کیا سوچتے ہیں۔ وہ ہر روز نظر آنے والی بیہودگی کے لیے خود کو ہی موردالزام ٹھہراتے اور سوچتے ہیں کہ وہ کچھ بھی اچھا نہیں کر سکتے۔ آخر کار کوئی گورا ہی انہیں تسلی دیتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اس ملک نے ان کی ماں، باپ اور بہن کے ساتھ کیا کیا۔ چنانچہ یہ سچ ہے کہ وہ گوروں سے نفرت کرتے ہیں، لیکن اپنے آپ میں اس کا اعتراف نہیں کر سکتے۔ وہ اندر ہی اندر لڑتے ہیں۔ اس طرح ان کی بہت سی توانائی ضائع ہو جاتی ہے۔

''میں تمہیں بتاتا ہوں کہ مجھے گوروں کی کیا بات پسند ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ وہ کون ہیں۔ اطالویوں کو دیکھو۔ انہیں امریکی جھنڈے یا اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ وہ کب یہاں آئے۔ انہوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے مفادات کو تحفظ دینے کی خاطر مافیا بنایا۔ آئرش لوگوں نے سٹی ہال پر قبضہ کیا اور اپنے بچوں کو ملازمتیں دلوائیں۔ یہی حال یہودیوں کا ہے۔ کیا تم مجھے بتا رہے ہو

کہ وہ اسرائیل میں اپنے رشتہ داروں کے بجائے ساؤتھ سائیڈ کے کسی سیاہ فام بچے کی زیادہ فکر کرتے ہیں؟ لعنت ہے۔ بارک، یہ سارا معاملہ خون کا ہے، اپنوں کا خیال رکھنے کا۔ بس کالے لوگ ہی اتنے احمق ہیں کہ ہر وقت اپنے دشمنوں کے لیے پریشان رہتے ہیں۔''

رفیق کے نکتۂ نظر کے مطابق یہ تھا سچ، اور اس نے اس سچائی کا تجزیہ کرنے میں کوئی توانائی صرف نہ کی۔ اس کی دنیا ہوبز کے فلسفے جیسی تھی جہاں بداعتمادی کو لازمی جز و مان لیا گیا اور وفاداریاں خاندان سے مسجد اور مسجد سے کالی نسل تک جاتی تھیں۔ اس تنگ نظری نے اسے ایک واضح النظری عطا کر دی تھی اور وہ اپنی توجہ مرکوز کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ وہ دلیل دے سکتا تھا کہ سیاہ فام توقیر ذات نے میٹرکو سیٹ جتوائی تھی، کہ اگر ہم خود سے بے وفائی نہ کریں تو ترقی ہماری پہنچ میں تھی۔

لیکن یہ بے وفائی اصل میں تھی کیا؟ میلکم ایکس کی آپ بیتی پہلی مرتبہ پڑھنے کے بعد سے میں نے سیاہ فام قوم پرستی کے دہرے دھاگوں کو الگ الگ کرنے کی کوشش کی تھی، اور دلیل دی تھی کہ قوم پرستی کے مثبت پیغام یگانگت، خود انحصاری، نظم و ضبط اور برادری کی ذمہ داری..... کو گوروں سے نفرت پر مبنی نہیں ہونا چاہیے۔ میں اپنے آپ سے اور کسی بھی سیاہ فام دوست سے کہتا کہ ہم تبدیلی کی صلاحیت پر یقین ترک کیے بغیر اس قوم کو بتا سکتے تھے کہ غلطی کہاں ہے۔

البتہ رفیق جیسے خود ساختہ قوم پرستوں سے بات چیت کرنے پر میں دیکھنے لگا کہ کیسے ہر گوری چیز کو معتوب ٹھہرانا ان کے بہتری لانے کے پیغام میں مرکز و محور کی حیثیت رکھتا تھا؛ کیسے وہ کم از کم نفسیاتی طور پر ایک دوسرے کے مرہون منت تھے۔ کیونکہ جب کوئی قوم پرست اقدار کو دوبارہ زندہ کرنا ہی سیاہ فاموں کی غربت کا واحد حل قرار دیتا تو دراصل وہ استعاراتی طور پر سیاہ فام سامعین پر تنقید کر رہا ہوتا: کہ ہم جو زندگی گزار رہے ہیں ویسے ہی نہیں گزارنی۔

ایک لحاظ سے رفیق کا یہ اصرار درست تھا کہ بہت گہرائی میں تمام سیاہ فام ممکنہ قوم پرست تھے۔ غصہ موجود تھا، بوتل میں بند اور اکثر اندر کی طرف۔ اور جب میں روبی اور اس کی نیلی آنکھوں، ایک دوسرے کو نیگرو کہہ کر بلاتے ہوئے نوجوانوں کے متعلق سوچتا تو خیال آتا کہ آیا کم از کم فی الحال رفیق اس غصے کو نئی سمت دینے میں درست تھا؛ آیا سیاہ فام سیاست، جو بالعموم گوروں کے خلاف غیض و غضب کو دبائے ہوئے تھی، ناکافی تھی۔

یہ سوچنا برسوں پہلے کی طرح اب بھی کرب انگیز ہے۔ یہ میری ماں کی سکھائی ہوئی اخلاقیات

کے منافی تھا۔ اس اخلاقی دائرۂ کار کے اندر میری ذات کا ایک حصہ ملوث تھا؛ میں نے دریافت کیا کہ فرار کی کوشش کرنے پر بھی میں اس سے فرار نہیں پا سکا۔ اور شاید اب اس ملک کے کالے اِس دائرۂ کار (فریم ورک) کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے؛ شاید اس نے کالوں کے ارادے کو متزلزل کر دیا تھا، ان کی صفوں میں بے چینی پھیلا دی تھی۔ شدید مایوسی کے لمحات شدید اقدامات کا تقاضا کرتے تھے، اور بہت سے کالوں کے لیے یہ دور نہایت شدید تھا۔ اگر قوم پرستی ایک طاقت ور اور مؤثر تحفظ فراہم کر سکتی، تو قیر ذات کے وعدے کو پورا کر سکتی تو نیک نیت گوروں کو پہنچنے والی زک یا میرے جیسے لوگوں کی داخلی گڑ بڑ بہت کم اہمیت کی حامل ہوتی۔

شاید قوم پرستی کوئی راہ نجات پیش کر سکتی تھی۔ پتا چلا کہ مؤثر پن کے سوالات رفیق کے ساتھ زیادہ تر تنازعات کا باعث بنے تھے۔ MET کے ساتھ ایک سنگین نوعیت کی میٹنگ کے بعد میں نے اس سے پوچھا کہ اگر شہر میں ایک عوامی مظاہرہ لازمی ہو جائے تو کیا وہ اپنے پیروکاروں کو سڑکوں پر لا سکتا ہے۔

اس نے کہا، ''میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ لوگوں کو سمجھانے کی خاطر پمفلٹ بانٹتا پھروں۔ زیادہ تر لوگوں کو کوئی پرواہی نہیں۔ پروا کرنے والے لوگ دہری چال چلتے ہیں۔ نیگرو معاملات کو خراب کر دیا کرتے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ اپنے منصوبے کو سخت رکھیں اور شہر کو اس کا قائل بنائیں۔ اس طرح ہوتا ہے کام...... مجمع اکٹھا کر کے شور ڈالنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ایک بار معاہدہ طے پا جائے تو آپ جیسے چاہے اس کا اعلان کرتے پھریں۔''

میں نے رفیق کے طریقہ کار سے اختلاف کیا۔ سیاہ فاموں سے اس کی محبت کے تمام قول اقرار کے باوجود وہ ان پر بھروسا کرتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ لیکن مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ صلاحیت کا فقدان اس طریقہ کار کی وجہ ہے: اس کی تنظیم اور نہ ہی اس کی مسجد کے ارکان کی تعداد پچاس سے زیادہ تھی۔ اس کا اثر و رسوخ کسی مضبوط تنظیمی معاونت کی دین نہیں بلکہ ہر میٹنگ میں مخالفین کو مطیع بنانے پر منحصر تھا۔

کبھی کبھی میں نیشن آف اسلام کے اخبار ''The Final Call'' کی ورق گردانی کرتا۔ نیشن نے سیاہ فاموں کو اپنی دولت برادری کے اندر ہی رکھنے پر آمادہ کرنے کی خاطر POWER نامی

حکمت عملی وضع کی تھی جس کی تشہیر اخبار کے ذریعے کی جاتی۔

کچھ عرصہ بعد POWER پروڈکٹس کے اشتہارات کم نمایاں ہونے لگے۔ لگتا تھا کہ منسٹر فرخان کی تقریروں سے لطف اندوز ہونے والے لوگ بھی Crest ٹوتھ پیسٹ سے دانت صاف کرتے رہے۔ POWER مہم کی ناکامی سیاہ فاموں کے کسی بھی کاروبار کو درپیش مشکلات کے متعلق بتاتی تھی۔

شاید پاور کے پروڈکٹ مینیجر نے سوچا ہو کہ اپنے برانڈ کو قومی سپر مارکیٹ کے ان سٹورز میں تقسیم کرے جہاں سیاہ فام لوگ اکثر شاپنگ کرنے آتے تھے۔ اگر اس نے یہ خیال مسترد کر دیا تھا تو شاید غور کیا ہے کہ آیا کسی سیاہ فام کی زیر ملکیت سپر مارکیٹ قومی سپر سٹورز کے ساتھ مقابلہ بازی میں بھی گورے گاہکوں کو مخصوص مصنوعات فروخت کرنے سے انکار کر سکتی تھی یا نہیں۔ کیا کالے گاہک بذریعہ ڈاک ٹوتھ پیسٹ خریدتے؟ اور اس بات کا امکان کتنا تھا کہ ٹوتھ پیسٹ کی تیاری کا سامان سستے ترین نرخوں پر فراہم کرنے والا شخص کوئی گورا ہی ہوتا؟

مقابلہ بازی کے سوالات، منڈی کی معیشت اور اکثریتی حکومت کے جبری فیصلے: طاقت کے معاملات۔ جب تک قوم پرستی گوری نسل کے خلاف کیتھارسس کا ذریعہ رہتی، تب تک ریڈیو سننے والے بے روزگار کالے نوجوان یا ٹی وی دیکھتے ہوئے بزنس مین اسے سراہتے۔ لیکن اس جذبۂ اتحاد اور روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے فیصلے کے مراحل تک کی ڈھلوان بہت تیکھی تھی۔ سیاہ فام اکاؤنٹنٹ پوچھتا: اگر سیاہ فاموں کی زیر ملکیت کوئی بینک ہر چیک کیش کرنے کی فالتو رقم چارج کرتا ہے تو میں اس میں اکاؤنٹ کیوں کھولوں؟ سیاہ فام نرس نے کہا: جن گوروں کے ساتھ میں کام کرتی ہوں وہ زیادہ برے نہیں، اور اگر برے ہوتے تو تب بھی میں ہرگز نوکری نہ چھوڑتی...... کل کو میرا کرایہ کون دے گا، یا آج میرے بچوں کو کھانا کون فراہم کرے گا؟

رفیق کے پاس ان سوالوں کے کوئی گھڑے گھڑائے جواب موجود نہیں تھے؛ اسے اقتدار کے اصول تبدیل کرنے میں نہیں بلکہ ان اصولوں کو بنانے والوں کا رنگ بدلنے میں دلچسپی تھی۔ البتہ ہرم کی چوٹی پر بہت زیادہ جگہ نہیں ہوتی؛ ان حالات میں جاری مقابلے میں سیاہ فاموں کی نجات کا انتظار واقعی کافی طویل تھا۔ اس انتظار کے دوران مضحکہ خیز واقعات پیش آئے۔ صلاحیت سے عاری سیاہ فام سیاست دانوں نے طرح طرح کی افواہیں پھیلائیں...... کہ کوریائی لوگ Klan کو

فنڈز فراہم کر رہے تھے، کہ یہودی ڈاکٹر سیاہ فام بچوں کو ایڈز کے انجکشن لگاتے تھے۔ یہ مشہور ہونے کا ایک فوری طریقہ تھا۔ ٹیلی ویژن پر سیکس یا تشدد کی طرح سیاہ فام غیض وغضب کو بھی ہمیشہ تیار مارکیٹ ملی۔

مجھے تشویش یہ نہیں تھی کہ اس قسم کی باتیں اتحاد قائم کرنے کی کوششوں کو نقصان پہنچاتی تھیں۔ اصل قابل تشویش بات ہمارے قول وفعل کا تضاد تھا؛ بطور افراد اور برادری ہم پر اس کا پڑنے والا اثر۔ اس تضاد نے زبان اور سوچ دونوں کو بگاڑ دیا۔

قول اور فعل میں مطابقت لانے کی اور پسندیدہ خواہش کو قابل عمل منصوبے کی صورت دینے کے لیے جہد مسلسل کیا توقیر ذات اصل میں یہی نہیں تھی؟ اسی یقین نے مجھے تنظیم سازی کی جانب مائل کیا تھا، اور اسی یقین نے مجھے اس نتیجے پر پہنچایا کہ نسلی یا ثقافتی خالص پن کے تصورات اب سیاہ فام امریکی کی توقیر ذات کی بنیاد نہیں بن سکتے تھے۔ ہمارا احساس اجتماعیت محض وراثت میں ملنے والے سلسلۂ خون پر قائم نہیں کیا جا سکتا تھا۔
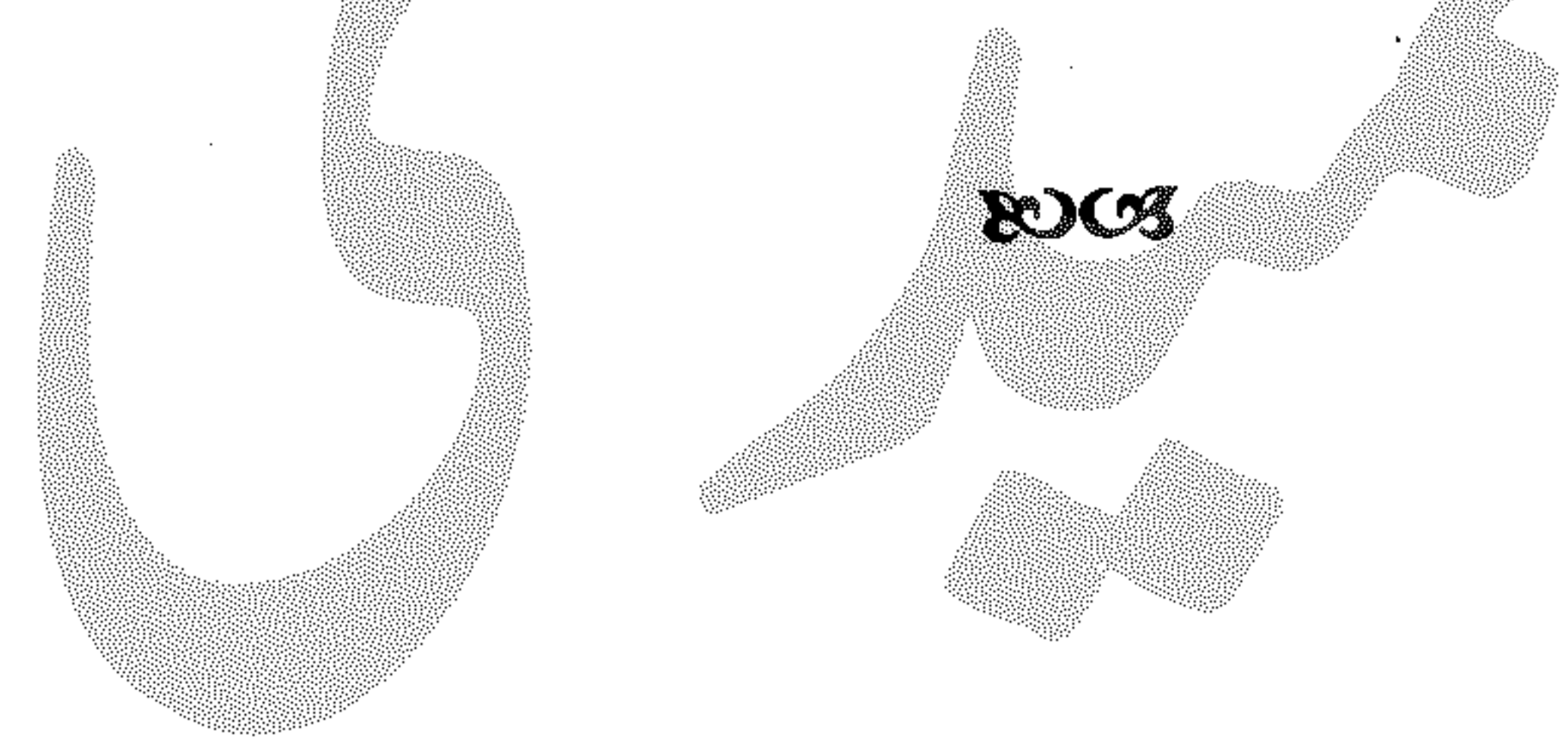
گیارھواں باب

کینیا سے بہن کی آمد

سوا تین بجے ایئرپورٹ کی پارکنگ میں گاڑی کھڑی کرنے کے بعد میں ٹرمینل کی طرف اندھا دھند بھاگا۔ میں نے ہانپتے ہوئے کئی چکر لگائے۔ میری آنکھیں سامان سنبھالتے ہوئے ہندوستانی، جرمن، پولش، تھائی اور چیک لوگوں کی سکیننگ کر رہی تھیں۔

لعنت ہے! مجھے جلدی روانہ ہو جانا چاہیے تھا۔ شاید اس نے پریشان ہو کر کال کرنے کی کوشش کی ہو۔ کیا میں نے اسے اپنے دفتر کا نمبر دیا تھا؟ کہیں اس سے فلائٹ تو مس نہیں ہو گئی تھی؟ کہیں وہ میرے قریب سے ہی گزر کر آگے تو نہیں چلی گئی؟

میں نے ہاتھ میں پکڑی تصویر پر نظر ڈالی جو اس نے مجھے دو ماہ قبل بھیجی تھی۔ دوبارہ اوپر دیکھا تو تصویر میں جیسے جان پڑ گئی: ایک افریقی عورت کسٹمز گیٹ میں سے باہر آئی۔ اس کی چمکدار تلاش کرتی ہوئی نگاہیں میری نگاہوں میں پیوست ہو گئیں۔ اس کا گول تراشا ہوا چہرہ کھل اُٹھا۔

"بارک؟"

"اوما؟"

"اوہ، مائی....."

میں نے بہن کو سینے سے چمٹا کر ہوا میں اٹھا لیا اور ہم ہنستے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ میں نے اس کا بیگ اٹھایا اور ہم پارکنگ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس نے میرے بازو میں اپنا بازو حمائل کر دیا۔ اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ میں اس سے محبت کرتا تھا۔ وہ محبت سچی تھی، اور آج بھی ہے۔

''تو بھائی، تم مجھے ایک ایک بات بتاؤ گے،'' اوما نے کار چلنے پر کہا۔

''کس بارے میں؟''

''ظاہر ہے اپنی زندگی کے بارے میں۔''

''شروع سے؟''

''جہاں سے مرضی شروع کر دو۔''

میں نے اسے شکاگو اور نیو یارک، بطور تنظیم ساز اپنے کام، اپنی ماں، نانا نانی اور مایا کے متعلق بتایا۔ اس نے کہا کہ وہ ان کے بارے میں باپ سے بہت کچھ سن چکی تھی اور انہیں اچھی طرح سے جانتی تھی۔ اس نے ہائیڈلبرگ کے متعلق بتایا جہاں وہ لسانیات میں ماسٹر ڈگری مکمل کرنے کی کوشش میں تھی، اور جرمنی میں رہنے کی آزمائشوں اور مسائل کا بھی تذکرہ کیا۔

''میرے خیال میں مجھے شکایت کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ مجھے وظیفہ ملتا ہے، میرے پاس اپنا فلیٹ ہے۔ پتا نہیں، ابھی تک کینیا میں ہی ہوتی تو میرا کیا بنتا۔ پھر بھی مجھے جرمنی کی کوئی زیادہ پروا نہیں۔ پتا ہے، جب افریقیوں کا معاملہ آئے تو جرمن خود کو بہت لبرل خیال کرتے ہیں، لیکن تہ کو کھرچ کر دیکھیں تو ان کے رویے ابھی تک بچگانہ ہیں۔ جرمن پری کہانیوں میں سیاہ فام لوگ ہمیشہ گوبلنز ہیں۔ اس قسم کی باتوں کو آپ آسانی سے بھول نہیں سکتے۔ کبھی کبھی میں تصور کرنے کی کوشش کرتی ہوں کہ اگر بوڑھے کو کبھی گھر چھوڑنا پڑ ہی جاتا تو گھر سے پہلی مرتبہ باہر نکلنے پر کیا اسے بدستور وہی تنہائی محسوس ہوتی.....''

بوڑھا۔ اوما ہمارے باپ کو یہی کہتی تھی۔ یہ لفظ مجھے کچھ مناسب اور جانا پہچانا بھی لگا، ایک عنصری قوت جس کی پوری طرح تفہیم نہیں ہوئی۔ میرے اپارٹمنٹ میں پہنچ کر اوما نے بک شیلف پر رکھی باپ کی تصویر اٹھالی۔

''وہ بہت معصوم لگتا ہے نا؟ بہت جوان۔'' وہ تصویر میرے چہرے کے قریب لائی اور بولی، ''تمہارا منہ بالکل ویسا ہے۔''

میں نے اسے لیٹنے اور آرام کرنے کو کہا تاکہ میں کچھ گھنٹے کے لیے دفتر میں کام کر آؤں۔

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ ''میں تھکی ہوئی نہیں ہوں۔ مجھے بھی ساتھ لے چلونا۔''

''تھوڑا آرام کر لو گی تو اچھا محسوس کرو گی۔''

''اف بارک! میں دیکھ رہی ہوں کہ تم بھی بوڑھے کی طرح اپنی منواتے ہو۔ اور تم اس سے صرف ایک بار ملے ہو۔ یہ چیز ضرور خون میں شامل ہو گی۔''

میں ہنس دیا، لیکن وہ نہیں؛ اس کے بجائے اس کی آنکھیں میرے چہرے پر یوں بھٹکنے لگیں جیسے کسی پزل کو حل کرنے کی کوشش میں ہوں۔

اس دوپہر کو میں اسے ساؤتھ سائیڈ میں گھمانے لے گیا...... وہی جگہ جہاں میں شکاگو آمد کے ابتدائی دنوں میں آیا کرتا تھا۔ بس اس مرتبہ اپنی کچھ یادیں بھی ساتھ تھیں۔ میرے دفتر میں پہنچے تو اینجلا، مونا اور شرلی بھی اتفاقاً وہاں موجود تھیں۔ انہوں نے اوما سے کینیا کے متعلق کافی کچھ پوچھا، کہ وہ اپنے بال کیسے گوندھتی ہے، کہ وہ اتنی اچھی باتیں کیسے کر لیتی ہے، انگلینڈ کی ملکہ کی طرح۔ چاروں نے میرے اور میری عادات کے بارے میں باتیں شروع کر دیں۔

بعد میں اوما کہنے لگی، ''وہ تمہاری پرستار لگتی ہیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے کینیا میں اپنی خالائیں یاد آ گئیں۔'' اس نے شیشہ نیچے کر کے باہر جھانکا اور پھر مجھ سے پوچھنے لگی، ''کیا تم ان کے لیے کام کر رہے ہو، بارک؟ میرا مطلب ہے یہ تنظیم سازی والا کام؟''

میں نے کندھے اچکائے، ''ان کے لیے، اور اپنے لیے۔''

اوما کے چہرے پر گڑبڑاہٹ اور خوف بھرا وہی الجھن کا تاثر لوٹ آیا۔ ''مجھے سیاست زیادہ پسند نہیں،'' اس نے کہا۔

''ایسا کیوں ہے؟''

''پتا نہیں۔ لوگوں کو ہمیشہ مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔''

جب ہم گھر پہنچے تو میل باکس میں ایک لیٹر اس کا منتظر تھا۔ یہ خط ایک جرمن لا سٹوڈنٹ کی طرف سے تھا جس کے ساتھ اس کا ملنا جلنا تھا۔ خط کافی ضخیم تھا، کوئی سات بڑے صفحات ہوں گے۔ میرے ڈنر بنانے کے دوران وہ خط پڑھتے ہوئے مسکراتی اور آہیں بھرتی رہی۔ اچانک اس کا چہرہ پرسکون ہو گیا۔

''میرا خیال تھا کہ تم جرمنوں کو پسند نہیں کرتی،'' میں نے کہا۔

اوما نے آنکھوں کو پونچھا اور ہنس پڑی۔ ''ہاں...... اوٹو مختلف ہے۔ وہ بہت سویٹ ہے! اور کبھی کبھی میں اس کے ساتھ بہت خراب سلوک کرتی ہوں! بارک، پتا نہیں، کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ

میں کسی پر پوری طرح بھروسا نہیں کر سکتی۔ میں سوچتی ہوں کے بوڑھے نے اپنی زندگی کا کیا کیا، اور شادی کا خیال ہی میرے جسم میں کپکپی دوڑا دیتا ہے۔ اوٹو اور اس کے کیریئر کی وجہ سے ہمیں جرمنی میں ہی رہنا ہوگا۔ میں تصور کرنے لگی ہوں کہ یہ زندگی میرے لیے کیسے ہوگی، ساری عمر بطور غیر ملکی گزارنا، اور مجھے نہیں لگتا کہ میں ایسا کر پاؤں گی۔''

اس نے خط تہ کیا اور جیب میں رکھتے ہوئے پوچھا ''تمہارا کیا معاملہ ہے، بارک۔ کیا تمہیں بھی اس قسم کے مسائل کا سامنا ہے، یا کیا صرف تمہاری بہن ہی اس قدر بوکھلائی ہوئی ہے؟''

''میرے خیال میں میں تمہارے احساسات سے آگاہ ہوں۔''

''بتاؤ مجھے۔''

میں ریفریجریٹر کے پاس گیا اور دو سبز مرچیں نکالیں، انہیں کٹنگ بورڈ پر رکھا۔ ''ٹھیک ہے وہاں نیویارک میں ایک گوری لڑکی تھی جسے میں پیار کرتا تھا۔ ہم تقریباً ایک سال تک ملتے رہے۔ عموماً ہفتہ وار چھٹی کے دن۔ کبھی اس کے اور کبھی میرے اپارٹمنٹ میں۔ جانتی ہو نا کہ آپ کیسے ایک اپنی دنیا بسا لیتے ہیں؟ صرف دو لوگ، خفیہ اور گرمائش سے بھرپور۔ آپ کی اپنی زبان، اپنی روایات اور اپنے طور طریقے ہوتے ہیں۔

''خیر ایک اتوار کو اس نے مجھے اپنے خاندانی مکان میں آنے کی دعوت دی۔ اس کے والدین وہاں موجود تھے اور وہ بہت اچھے تھے۔ خزاں کا موسم تھا۔ ہم سنہری پتوں سے بھری برفیلی جھیل میں کشتی چلاتے رہے۔ خاندان کو وہاں کے چپے چپے کا علم تھا۔ گھر بہت پرانا تھا، اس کے دادا کا، جو اسے اپنے دادا سے ورثے میں ملا تھا۔ لائبریری پرانی کتابوں اور یادگار تصاویر سے بھری ہوئی تھی۔ اس بوجھل ماحول والے کمرے میں کھڑے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ میری اور میری دوست کی دنیائیں آپس میں اتنی ہی فرق ہیں جتنا کینیا اور جرمنی۔ اور مجھے معلوم تھا کہ اگر ہم اکٹھے رہے تو انجام کار میں ہی اس کی دنیا میں رہوں گا۔ آخر میں نے زیادہ تر زندگی میں یہی کیا تھا۔ ہم دونوں میں سے میں ہی ایسا تھا جو بطور اجنبی زندگی گزارنا جانتا تھا۔''

''پھر کیا ہوا۔''

''میں نے اسے پرے دھکیل دیا۔ ہم آپس میں لڑنے اور مستقبل کے متعلق سوچنے لگے۔ ہماری چھوٹی سی دنیا کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ ایک رات کو میں اسے ایک سیاہ فام ڈرامہ نگار کا لکھا ہوا

نیا ڈرامہ دکھانے لے گیا۔ زیادہ تر سامعین سیاہ فام تھے۔ ڈرامہ ختم ہونے پر وہ مجھ سے پوچھنے لگی کہ کالے لوگ کس چیز پر ہر وقت اتنے غصے میں رہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ شاید حافظے کی کارفرمائی ہے...... کوئی نہیں پوچھتا کہ یہودی لوگ ہالوکاسٹ کو کیوں یاد کرتے ہیں۔ اس نے کہا کہ وہ بات اور ہے، میں نے کہا کہ نہیں ایک ہی بات ہے۔ میری دوست نے کہا کہ غصہ ایک بند گلی کے سوا کچھ نہیں۔ تھیٹر کے عین سامنے ہماری زبردست لڑائی ہونے لگی۔ واپس کار میں پہنچے تو وہ رونے لگی۔ اس نے کہا کہ وہ کالی نہیں بن سکتی، اگر بن سکتی تو ضرور بن جاتی، مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔ وہ جیسی تھی ویسی ہی ہو سکتی تھی، اور کیا یہ کافی نہیں تھا۔''

''یہ تو بڑی اداس کہانی ہے، بارک۔''

''میرے خیال میں اگر وہ کالی ہوتی تو تب بھی معاملہ نہ چل پاتا۔ میرا مطلب ہے کہ کئی سیاہ فام عورتوں نے بھی میرا دل اسی طرح توڑا ہے۔'' میں مسکرایا اور کاٹی ہوئی سبز مرچیں برتن میں ڈالنے لگا۔ پھر میں اوما کی طرف مڑا۔ ''بات یہ ہے کہ جب بھی میں اپنی دوست کی بات پر غور کرتا ہوں جو اس نے تھیٹر کے باہر کہی تھی، تو مجھے شرم آنے لگتی ہے۔''

''کیا اس کی کبھی کوئی خیر خبر آئی ہے؟''

''کرسمس پر ایک پوسٹ کارڈ آیا تھا۔ اب وہ خوش ہے۔ اسے کوئی مل گیا ہے اور مجھے اپنا کام کرنا ہے۔''

''کیا اتنا کافی ہے؟''

''کبھی کبھی۔''

اگلے روز میں نے دفتر سے چھٹی کی اور سارا دن اوما کے ساتھ آرٹ انسٹی ٹیوٹ میں گھومتے، الماری میں سے پرانی تصویریں نکال کر دیکھتے، سپر مارکیٹ سے خریداری کرتے ہوئے گزارا۔ اوما نے فیصلہ دیا کہ امریکی لوگ دوستانہ اور فربہ تھے۔

البتہ باپ کے بارے میں ہماری زیادہ گفتگو نہیں ہوئی تھی؛ لگتا تھا کہ یہ موضوع قریب آنے پر ہماری گفتگو ایک دم رک جاتی تھی مگر اس رات ہمارے لیے مزید گریز ناممکن ہو گیا۔ میں نے چائے بنائی اور اوما بوڑھے کے متعلق بتانے لگی۔

"میں یہ دعویٰ تو نہیں کرتی کہ اسے حقیقی طور پر جانتی ہوں۔ شاید کوئی بھی نہیں جانتا۔ اس کی زندگی نہایت بکھری ہوئی تھی۔ لوگ صرف ٹکڑوں اور شذروں کو ہی جانتے تھے، حتیٰ کہ اس کے اپنے بچوں کو بھی زیادہ کچھ معلوم نہیں تھا۔

"میں ہمیشہ اس سے خوف زدہ رہی۔ میرے پیدا ہونے سے پہلے ہی وہ جا چکا تھا۔ ہوائی میں تمہاری ماں کے ساتھ اور پھر ہارورڈ میں۔ جب وہ واپس کینیا آیا تو ہمارا بڑا بھائی رائے اور میں بچے تھے۔ تب تک ہم نے ماں کے ساتھ گاؤں، ایلیگو میں زندگی گزاری تھی۔ میں چار سال کی اور رائے چھ سال کا تھا۔ شاید وہ تمہیں زیادہ کچھ بتا سکتا۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ وہ ایک امریکی عورت روتھ کے ہمراہ آیا، ہمیں ہماری ماں سے چھینا اور نیروبی لے گیا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ عورت روتھ پہلی گوری فرد تھی جسے میں نے اتنے قریب سے دیکھا۔"

"تم اپنی ماں کے پاس ہی کیوں نہ رہی؟"

اوما نے انکار میں سر ہلایا۔ "مجھے بالکل ٹھیک تو معلوم نہیں۔ کینیا میں طلاق ہونے پر مرد اگر چاہیں تو بچے اپنے پاس رکھتے ہیں۔ میں نے ماں سے اس بارے میں پوچھا، لیکن اس میں کچھ بتانے کی ہمت نہیں۔ وہ بس یہی کہتی ہے کہ بوڑھے کی نئی بیوی نے دوسری بیوی کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا تھا اور وہ، یعنی میری ماں چاہتی تھی کہ ہم بوڑھے کے ساتھ بہتر زندگی گزاریں کیونکہ وہ مال دار تھا۔

"ان برسوں میں بوڑھے کی حالت واقعی کافی اچھی تھی۔ وہ ایک امریکی آئل کمپنی، غالباً شیل کے لیے کام کرتا تھا۔ ملک کو آزاد ہوئے چند برس ہی ہوئے تھے، اور بوڑھے کے اعلیٰ سرکاری افسروں تک خاصے قریبی تعلقات تھے۔ نائب صدر، وزرا وغیرہ ہمارے گھر آتے اور اس کے ساتھ شراب نوشی کرتے۔ سب لوگ ان باتوں کو حیرت اور ستائش بھری نظروں سے دیکھتے۔ البتہ روتھ کے ساتھ ازدواجی رشتہ ابھی قائم ہی تھا کہ وہ میری ماں کے ساتھ کبھی کبھار ملنے لگا۔ جیسے وہ لوگوں کو دکھانا چاہتا تھا کہ جب چاہے اس حسین افریقی عورت کو حاصل کر سکتا ہے۔ اسی دوران ہمارے مزید چار بھائی پیدا ہوئے۔ روتھ کے بچے مارک اور ڈیوڈ ویسٹ لینڈز میں واقع ہمارے وسیع وعریض گھر میں پیدا ہوئے۔ ایبو اور برنارڈ کو میری ماں نے جنم دیا اور اس کے ساتھ ہی گاؤں میں رہتے تھے۔ رائے اور میں ایبو اور برنارڈ سے نہیں ملے تھے۔ بوڑھا ہمیشہ روتھ کو بتائے بغیر اکیلا

ہی ملنے جاتا تھا۔

"جب روتھ نے مارک اور ڈیوڈ کو جنم دیا تو اس کی توجہ ان کی طرف ہو گئی۔ بوڑھا امریکی کمپنی کی ملازمت چھوڑ کر سرکاری نوکری کرنے لگا، وزارت سیاحت میں۔ وہ کوئی سیاسی عزائم رکھتا ہو گا، اور حکومت میں اس کے معاملات اچھے بھی رہے۔ لیکن 1966ء یا 1967ء میں کینیا زیادہ سنگین دھڑے بازی کا شکار ہونے لگا۔ قبیلے ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہونا شروع ہو گئے۔

"بوڑھے کے زیادہ تر دوستوں نے خاموش رہنا اور صورت حال کے مطابق زندگی گزارنا سیکھ لیا۔ لیکن بوڑھا بولنے لگا۔ وہ لوگوں کو بتاتا کہ قبیلہ پرستی ملک کو تباہ کر دے گی، اور بہترین عہدوں پر نااہل لوگ فائز تھے۔ دوستوں نے اسے خبردار کرنا چاہا، مگر اس نے کسی کی نہ سنی۔ وہ ہمیشہ اپنی رائے کو بہترین سمجھتا تھا۔ صدر کینیاٹا نے شکایات موصول ہونے پر اسے بلوایا اور کہا کہ وہ اپنا منہ بند نہیں رکھ سکتا اس لیے تب تک کام نہیں کرے گا جب تک ننگے پاؤں نہیں ہو جاتا۔

"بوڑھے کو حکومت سے نکال دیا گیا۔ کسی بھی وزارت نے اسے کام نہ دیا۔ جب وہ غیر ملکی کمپنیوں کے پاس ملازمت ڈھونڈنے گیا تو انہیں پہلے سے خبردار کیا جا چکا تھا۔ اس نے بیرون ملک جانے کی کوشش کی اور ادیس ابابا میں افریقن نیشنل بینک میں نوکری ڈھونڈ لی۔ لیکن حکومت نے اس کا پاسپورٹ منسوخ کر دیا اور وہ کینیا سے باہر ہی نہ جا سکا۔

"آخر کار اسے محکمۂ پانی میں ایک چھوٹی سی ملازمت پر اکتفا کرنا پڑی۔ یہ بھی ایک دوست کی مہربانی سے ممکن ہو سکا تھا۔ بس باورچی خانے کا خرچ چلتا رہا۔ یہ اس کے لیے بہت بڑی شکست تھی۔ وہ بہت زیادہ شراب پینے لگا اور بہت سے جان پہچان والے لوگ آنا بند ہو گئے۔ انہوں نے اسے بتایا کہ اگر وہ معافی مانگ لے، اپنا رویہ بدل لے تو شاید سب ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن وہ انکار کرتا اور جو بھی منہ آیا کہتا رہا۔

"گھر میں حالات کشیدہ ہونے لگے۔ وہ رائے اور مجھ سے کبھی کوئی بات نہ کرتا، بس جھڑکتا۔ تب روتھ چھوڑ کر چلی گئی۔ اس وقت میری عمر بارہ یا تیرہ برس تھی۔ اس کے بعد بوڑھے کا ایک کار ایکسیڈنٹ ہوا اور ایک گورا کسان کچل کر مارا گیا۔ بوڑھا کافی عرصے تک ہسپتال میں رہا اور جب فارغ ہوا تو تمہیں اور تمہاری ماں سے ملنے ہوائی گیا۔ اس نے ہمیں بتایا تھا کہ تم دونوں بھی ہمارے پاس آ کر رہو گے اور ہمارا باقاعدہ گھر بن جائے گا۔ لیکن جب وہ واپس آیا تو تم ساتھ نہیں تھے۔

رائے کو اور مجھے اپنے بل بوتے پر زندہ رہنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔
''ایکسیڈنٹ کے باعث بوڑھے کی نوکری چلی گئی تھی اور ہمارے پاس رہنے کو کوئی جگہ نہ
رہی۔ کچھ عرصہ ہم ایک سے دوسرے رشتے دار کے پاس جاتے رہے، لیکن انجام کار وہ اپنے ذاتی
مسائل کی وجہ سے ہمیں نکال دیتے۔ پھر ہمیں شہر کے ایک دور دراز علاقے میں خستہ سا مکان مل گیا
اور ہم نے کئی سال وہیں گزارے۔ وہ بڑا خوفناک وقت تھا۔ بوڑھے کو کھانے پینے کے لیے بھی
رشتہ داروں سے ادھار مانگنا پڑتا تھا۔ میرے خیال میں وہ بہت شرمسار ہوا اور اس کا مزاج بگڑنے
لگا۔ ان سب مشکلات کے باوجود اس نے رائے کو یا مجھے کبھی نہ بتایا کہ واقعی کوئی گڑبڑ تھی۔ کبھی کبھی
میں اس کے ساتھ بحث کرتی، لیکن وہ مجھے بے وقوف لڑکی کہہ کر چپ کروا دیتا۔
''رائے بھی گھر سے بھاگ گیا اور مختلف لوگوں کے ساتھ رہتا رہا۔ اب بوڑھے کے ساتھ
صرف میں تھی۔ کبھی کبھی میں اس کے انتظار میں آدھی رات تک جاگتی رہتی۔ وہ نشے میں چور واپس
آتا اور میرے کمرے میں داخل ہوتا۔ وہ اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا شکوہ کرنے لگتا۔
نیند کے مارے مجھے کچھ بھی سمجھ نہ آتا۔ میں دل ہی دل میں دعا کرتی کہ وہ کسی رات کو بس دفعہ ہو
جائے اور کبھی واپس نہ آئے۔
''کینیا ہائی سکول کی وجہ سے بس میری بچت ہوگئی۔ ایک دور میں یہ سکول صرف انگریز بچوں
کے لیے تھا۔ یہ بورڈنگ سکول تھا، اس لیے میں چھٹیوں میں بھی وہیں رہتی۔ سکول نے مجھے ترتیب
کا احساس دیا۔ ایک سال گزرا تو بوڑھا میری فیس بھی ادا کرنے کے قابل نہ رہا۔ مجھے گھر بھیج دیا
گیا۔ میں شرم کے مارے ساری رات روتی رہی۔ لیکن خوش قسمتی سے ایک ہیڈ مسٹریس کو معاملے کا
پتا چلا اور اس نے مجھے سکالرشپ پر واپس بلوا لیا۔ میں بوڑھے کو وہیں چھوڑ کر چلی گئی اور کبھی واپس
مڑ کر نہ دیکھا۔

''ہائی سکول کے آخری دو برس کے دوران بوڑھے کے حالات کچھ بہتر ہوگئے۔ صدر کینیاتا
مر گیا اور بوڑھے کو حکومت میں دوبارہ کام کرنے کی اجازت مل گئی۔ اس نے وزارت مالیات میں
نوکری کر لی اور دوبارہ پیسے کمانے لگا، اثر و رسوخ بھی بحال ہوا۔ لیکن میرے خیال میں وہ کبھی بھی
گزرے برسوں کی درشتگی کو بھول نہ سکا۔ وہ کافی عرصہ تک ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لے کر رہتا
رہا۔ خاندان کو دوبارہ جوڑنے کا موقعہ ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے کچھ یورپی

اور افریقی عورتوں سے اس کا تعلق بنا، لیکن کوئی بھی پائیدار ثابت نہ ہوا۔ آخر کار جب اس سے
میری ملاقات ہوئی تو ہم مکمل اجنبی ہو چکے تھے، مگر وہ اب بھی خود کو میرا مثالی باپ ثابت کرنا چاہتا
تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب جرمنی میں پڑھنے کے لیے سکالرشپ ملا تو میں اسے بتاتے ہوئے ڈر رہی
تھی۔ میں اسے خدا حافظ کہے بغیر چلی گئی.....''
اوما کی آواز سسکیوں میں ڈوب گئی۔ میں نے اس کے لیے صوفہ سیدھا کر کے بستر بچھایا۔ وہ
کمبل لپیٹ کر لیٹی اور جلد ہی سو گئی۔ میں کرسی پہ بیٹھ کر مختلف سوچیں سوچنے لگا۔

دس روز بعد اوما اور میں ایئرپورٹ ٹرمینل کی پلاسٹک سیٹوں پر بیٹھے جہازوں کو آتا جاتا دیکھ
رہے تھے۔ میں نے اوما سے پوچھا کہ وہ کیا سوچ رہی تھی۔ وہ مسکرا دی اور بولی:
''میں ایلیگو کے متعلق سوچ رہی تھی۔ ہمارے گھر کا احاطہ، ہمارے دادا کی زمین جہاں اب
بھی ہماری دادی رہتی ہے۔ بارک، وہ خوبصورت ترین جگہ ہے۔ جب میں جرمنی میں آئی تو
بہت سردی لگتی اور تنہائی محسوس ہوتی۔ کبھی کبھی میں آنکھیں بند کر کے خود کو ایلیگو میں تصور کرتی ہوں
......دادا کے لگائے ہوئے بڑے بڑے درختوں کے درمیان۔ دادی باتیں کر رہی ہے، وہ مجھے کوئی
مزیدار بات سنا رہی ہے اور میں اپنی مرغیوں کو کھیتوں میں دانہ چگتے ہوئے سن رہی ہوں، چولہے
میں جلتی ہوئی آگ کی مہک آ رہی ہے۔ اور گندم کے کھیتوں کے قریب، آم کے پیڑ تلے وہ جگہ ہے
جہاں بوڑھے کو دفنایا گیا......''
اس کی فلائٹ کے لیے بورڈنگ شروع ہوگئی تھی۔ وہ بیٹھی رہی اور آنکھیں موند کر میرا ہاتھ
زور سے دبایا۔
اس نے کہا، ''ہمیں گھر جانا چاہیے۔ ہمیں گھر جانے اور اس سے ملنے کی ضرورت ہے،
بارک۔''

❧

بارھواں باب

سیاسی پختگی

رفیق نے جگہ کو ٹھیک ٹھاک بنانے کی اپنی سی کوشش کر لی تھی۔ داخلی دروازے پر ایک نیا سائن بورڈ لگا دیا گیا تھا۔ وہ تمام انتظامات کو حتمی شکل دے رہا تھا۔

"کیا خیال ہے، کیسا لگ رہا ہے؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"بہت ٹھیک ہے، رفیق۔"

روز لینڈ میں MET کے نئے بھرتی مرکز کا افتتاح کرنے کے لیے میئر آ رہا تھا۔ ہر سیاسی کارکن نمائندہ اور اہل کار چاہتا تھا کہ اسے میئر کے ساتھ تھوڑی سی ملاقات کا موقعہ مل جائے۔ سٹیٹ سینیٹر نے وعدہ کیا تھا کہ اگر ہم اسے اپنے پروگرام میں شامل کر لیں تو وہ ہمارے خواہش کردہ کسی بھی پروجیکٹ کے لیے فنڈز دے گا۔ حتیٰ کہ ریورینڈ سالز نے بھی فون کر کے تجویز دی کہ اسے ہیرلڈ سے ملوانا ہمارے لیے کتنا مفید ہوگا۔ جب بھی میں ڈی سی پی آفس کے اندر جاتا تو انجیلا نئے موصول شدہ پیغامات میرے ہاتھ میں پکڑا دیتی۔

فون کی گھنٹی دوبارہ بجنا شروع ہونے سے پہلے وہ کہتی، "یارک، تم یقیناً بہت معروف ہو گئے ہو۔"

میں نے رفیق کے گودام میں جمع لوگوں پر نظر دوڑائی۔ زیادہ تر سیاسی نمائندے تھوڑی تھوڑی دیر بعد اٹھ کر دروازے سے باہر جھانکتے، جبکہ سادہ کپڑوں والے پولیس اہل کار واکی ٹاکیز پر اطلاعات کا تبادلہ کر رہے تھے۔ میں نے کمرے میں ولبر اور انجیلا کو ڈھونڈ نکالا اور انہیں ایک طرف لے گیا۔

"تم لوگ تیار ہو نا؟"

انہوں نے ہاں میں سر ہلایا۔

میں نے کہا، "یاد رکھو، ہیرلڈ سے یہ وعدہ لینے کی کوشش کرنی ہے کہ وہ موسم خزاں میں ہماری ریلی میں حصہ لینے آئے گا۔ یہ کام اس وقت کرنا ہے جب اس کا شیڈولر بھی قریب ہو۔ اسے یہاں کیے جا رہے سارے کام کے بارے میں بتانا ہے، اور اس کی وجہ بھی....."

جلد ہی ہجوم میں کھلبلاہٹ نے میئر کی آمد کا پتا دیا۔ لیموزین کا دروازہ کھلا اور پولیس کے ایک دستے کے پیچھے میں نے ہیرلڈ کو دیکھا۔ اس نے نیلے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا اور قد میرے تصور کردہ ہیرلڈ کی نسبت کچھ چھوٹا تھا۔ فوراً ہی ہجوم "ہے۔ رلڈ، ہے۔ رلڈ" کے نعرے لگانے لگا۔ وہ سینیٹر، ریورینڈ سالز، میرے اور رفیق کے قریب سے گزر کر آگے گیا۔ آخر کار وہ عین انجیلا کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔

"مس رائیڈر،" اس نے انجیلا کا ہاتھ تھاما اور ہاکا سا جھکا۔ "مجھے خوشی ہوئی۔ میں نے آپ لوگوں کے زبردست کام کے متعلق سنا ہے۔"

انجیلا کو تو جیسے غش پڑنے والا تھا۔ میئر نے پوچھا کہ کیا وہ اسے اپنے ساتھیوں سے ملوائے گی۔ وہ اسے لے کر راہنماؤں کی قطار کی طرف بڑھی۔ وہ سب سکاؤٹوں کی طرح مستعد کھڑے تھے، سب اپنے چہروں پر ایک مسکراہٹ چپکائے ہوئے۔ تعارف مکمل ہونے پر میئر نے انجیلا کو اپنی بازو پیش کی اور وہ دونوں چلتے ہوئے دروازے کی جانب بڑھے، ہجوم بھی پیچھے پیچھے چل دیا۔

'مِنی، کیا تمہیں اس سب پر یقین آ رہا ہے؟" شرلی نے مونا سے سرگوشی کی۔

تقریب کوئی پندرہ منٹ تک جاری رہی۔ ولبر نے ڈی سی پی کے متعلق مختصر تقریر کی۔ میئر نے ہمیں یہ کوششیں کرنے پر سراہا۔ سینیٹر، ریورینڈ سالز اور علاقائی نمائندہ اس کے پیچھے جگہ حاصل کرنے کی تگ و دو میں مصروف رہے تاکہ فوٹو بنوا سکیں۔ فیتہ کاٹا گیا اور کام ختم ہوا۔ لیموزین کے روانہ ہوتے ہی لوگ جانے لگے۔ ہم چند لوگ ہی باقی رہ گئے۔

میں انجیلا کے پاس گیا جو شرلی کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی۔ "جب میں نے اس کے منہ سے 'مس رائیڈر' سنا تو جیسے جان ہی نکل چلی تھی۔"

شرلی نے جواب دیا، "یار، کیا مجھے نہیں معلوم۔"

"ہم نے ثبوت کے طور پر تصویریں لے لی ہیں،" مونا اپنا کیمرا دکھاتے ہوئے بولی۔

میں نے مداخلت کی،''کیا ہم نے ریلی کے لیے تاریخ لی ہے؟''

''پھر اس نے مجھے بتایا کہ میں دیکھنے میں چودہ سالہ بیٹی کی ماں نہیں لگتی۔ کیا تمہیں اس بات پر یقین آئے گا؟''

''کیا وہ ہماری ریلی میں آنے پر راضی ہوا ہے؟'' میں نے سوال دہرایا۔

''تینوں نے بے چینی سے میری طرف دیکھا۔'' کونسی ریلی؟''

میں نے غصے میں اپنے ہاتھ جھٹکے اور گلی کی طرف چل دیا۔ کار کے پاس پہنچا تو وِلبر پیچھے سے میرے پاس آیا۔

''تم اس طرح جلدی میں کہاں جا رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''پتا نہیں کہاں جا رہا ہوں۔'' میں نے سگریٹ سلگانے کی کوشش کی، لیکن ہوا کے باعث شعلہ بجھ گیا۔ میں نے لعنت بھیج کر ماچس زمین پر پھینک دی اور ولبر کی طرف مڑا۔ ''تم کو ایک بات معلوم ہے وِل؟''

''کیا؟''

''ہم فضول لوگ ہیں، بالکل فضول۔ بے کار۔ ہمیں میئر کو یہ دکھانے کا ایک موقع ملا تھا کہ شہر میں ہماری بات چلتی ہے، کہ ہم ایک ایسا گروپ ہیں جس کے بارے میں اسے سنجیدگی سے سوچنا چاہیے۔ سو ہمیں کیا کرنا چاہیے تھا؟ ہم نے پرستار بچوں کے ٹولے جیسا رویہ اپنایا، اور بس۔ ہم ارد گرد کھڑے ہو کر واہ واہ کرتے اور اس کے ساتھ تصویر کھنچوانے کی تدبیریں سوچتے رہے.....''

''تمہارا مطلب ہے کہ تمہاری تصویر نہیں بنی؟'' وِل نے مسکرا کر ایک پولرائیڈ شاٹ لی اور پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''بارک اگر میں ایک بات کہوں تو برا تو نہیں مانو گے؟ تمہیں چاہیے کہ چیزوں کو تھوڑا ہلکے انداز میں لو۔ جو تمہاری نظر میں واہیات ہے وہ انجیلا کے لیے سب سے مزے کی تھی۔ وہ دس سال بعد بھی اس بارے میں شیخیاں بگھارتی رہیں گی۔ اور اس کا سہرا تمہارے سر ہے۔ چنانچہ اگر وہ ہیرلڈ کو ریلی پر آنے کی دعوت دینا بھول گئیں تو کیا ہوا؟ ہم پھر کبھی اسے بلا لیں گے۔''

میں اپنی کار میں بیٹھا اور شیشہ نیچے کیا۔ ''دفعہ کرو اسے، ولبر۔ میرا تو بس دماغ ہی خراب ہے۔''

''وہ تو نظر آ رہا ہے۔ لیکن تمہیں خود سے پوچھنا چاہیے کہ دماغ خراب کیوں ہو رہا ہے۔''

''تمہارے خیال میں کیوں ہو رہا ہے؟''

وِلبر نے کندھے اچکائے۔ ''میرے خیال میں تم ایک اچھی ملازمت کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ لیکن میرا یہ بھی خیال ہے کہ تم کبھی مطمئن نہیں ہوتے۔ تم چاہتے ہو کہ سب کچھ جلدی جلدی ہو جائے۔ جیسے کچھ ثابت کرنا چاہتے ہو۔''

''وِل! میں کچھ بھی ثابت کرنے کی کوشش نہیں کر رہا۔'' میں نے کار سٹارٹ کی اور روانہ ہو گیا، لیکن وِلبر کے آخری الفاظ سنائی دے ہی گئے۔

''بارک، تمہیں ہم پر کچھ بھی ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ یار ہم تم سے محبت کرتے ہیں، یسوع کو تم سے محبت ہے۔''

مجھے شکاگو آئے ایک سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا تھا اور ہماری محنت انجام کار پھل لانے لگی تھی۔ وِلبر اور میری کی گلی کے کارز گروپ میں پچاس لوگ ہو گئے تھے؛ انہوں نے آس پاس صفائی کا منصوبہ بنایا، علاقے کے نوجوانوں کو مختصر روزگار دلوانے میں مدد کی، سیوریج کی حالت بہتر بنانے کے لیے نمائندے سے وعدے لیے۔ اسی طرح دیگر محلوں میں بھی پیش رفت ہوئی۔

تنظیم کے ساتھ ساتھ میرے وقار میں بھی اضافہ ہوا۔ مجھے ورکشاپس کروانے کے دعوت نامے ملنے لگے؛ مقامی سیاست دان مجھے ذاتی طور پر جانتے تھے۔ جہاں تک ہماری مقامی قیادت کا تعلق تھا تو اس میں میں بمشکل ہی کوئی غلطی کر سکتا تھا۔ میں ایک طرح سے شرلی وغیرہ کا لے پالک بیٹا بن گیا تھا۔

شاید اس سب کا تعلق اوما کے دورے اور اس کے ساتھ بوڑھے کے متعلق آنے والی خبروں سے ہوگا۔ پہلے میں اس کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کیا کرتا تھا، لیکن اب محسوس کیا کہ مجھے اپنی خطاؤں کا ازالہ کرنا ہوگا۔ بس ان غلطیوں کی نوعیت ابھی تک میرے ذہن میں واضح نہیں ہوئی تھی؛ میں ابھی تک خطرے کی علامات جانچنے کے قابل نہیں ہوا تھا۔ مارٹی کے ساتھ بھی کچھ مسائل موجود تھے۔ ہم نے باضابطہ طور پر اس موسم بہار میں اپنی اپنی کاوشوں کو جدا کر لیا تھا؛ تب کے بعد وہ اپنا زیادہ تر وقت مضافاتی گرجا گھروں میں صرف کر رہا تھا جہاں کالے اور گورے لوگوں کو نوکریوں کی فکر نسبتاً کم تھی۔

ہم نے آپس میں ایک معاہدہ کرلیا: وہ مجھے راہنمائی فراہم کیا کرے گا؛ میں اسے دوسری جگہوں پر کام کی صورت میں فیس ادا کرتا۔ ایک مرتبہ اس نے کہا، ''بارک، زندگی بہت مختصر ہے۔ اگر تم وہاں کے حالات میں حقیقی تبدیلی لانے کی کوشش نہیں کررہے تو اسے بھول جاؤ۔''

اوہاں، حقیقی تبدیلی۔ کالج کے زمانے میں یہ نہایت قابل حصول مقصد لگتا تھا، اپنے ارادے کی ہی تکمیل، جیسے کلاس میں اپنی کارکردگی کا گریڈ بڑھانا ہو یا شراب نوشی چھوڑنی ہو۔ تنظیم سازی میں کچھ سال گزارنے کے بعد کچھ بھی سادہ نہیں لگتا تھا۔ گارڈنز جیسے علاقے کا ذمہ دار کون تھا؟ میں خود سے پوچھتا۔

آخرکار ڈاکٹر مارتھا کولیئر نے مجھے اس ساری الجھن سے نکالا۔ وہ گارڈنز میں Carver ایلیمنٹری سکول کی پرنسپل تھی۔ جب میں نے پہلی مرتبہ ملاقات کا ٹائم لینے کے لیے کال کی تو اس نے زیادہ سوال نہ پوچھے۔ میں طے شدہ وقت پر اس کے دفتر میں پہنچ گیا۔ وہ ابتدائی تعارف کے بعد بولی، ''خدا کوئی بھی چیز فالتو نہیں بناتا۔ سیکرٹری ہمارے سکول کے ایک بچے کی ماں ہے۔ کل رات اس کا بوائے فرینڈ گرفتار ہوگیا اور اس کی ضمانت بھی نہیں ہوسکی۔ تو تم مجھے بتاؤ...... تمہاری تنظیم اس جیسی عورتوں کے لیے کیا کرسکتی ہے؟''

سیکرٹری میرے لیے کافی لے کر اندر آئی۔ میں نے کہا، ''مجھے امید تھی کہ آپ کچھ مشورے دیں گی۔''

وہ بیس سال سے پڑھا رہی تھی اور دس سال سے پرنسپل کے عہدے پر تھی۔ اس نے قواعد وضوابط کے معاملے میں خود کو افسران بالا کے ساتھ چھوٹی موٹی جھڑپوں کا عادی بنالیا تھا۔ Carver میں آمد کے بعد اس نے ایک چائلڈ پیرنٹ سنٹر قائم کیا تھا تاکہ نوجوان والدین کو کلاس روم میں لایا اور اپنے بچوں کے ساتھ مل کر سیکھنے کا موقعہ دیا جائے۔ ''زیادہ تر والدین اپنے بچے کو بہترین چیزیں دینا چاہتے ہیں، مگر انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کام کیسے ہوگا۔ چنانچہ ہم انہیں غذا، صحت اور ذہنی پریشانی جیسے مسائل سے نمٹنے کا طریقہ بتاتے ہیں۔ بس ہم اس ماحول کو تبدیل نہیں کرسکتے جہاں یہ لڑکے اور لڑکیاں روزانہ اپنے بچوں کو واپس لے کر جاتے ہیں۔ جلد یا بدیر بچہ ہمیں چھوڑ جاتا ہے اور والدین بھی آنا بند کردیتے ہیں......''

اس کے فون کی گھنٹی بجی؛ پینٹر کا فون آیا تھا۔

ڈاکٹر کولیئر اٹھتے ہوئے بولی، ''مسٹر اوباما۔ تم اگلے ہفتے آکر ہمارے پیرنٹ گروپ کے ساتھ بات چیت کرو اور دیکھو کہ ان کے دماغ میں کیا ہے۔ میں فی الحال تمہیں کوئی امید نہیں دلا رہی، لیکن اگر والدین نے فیصلہ کیا کہ وہ تمہارے ساتھ مل کر کوئی قیامت بپا کرنا چاہتے ہیں تو میں انہیں نہیں روک سکتی۔ ہے نا؟''

وہ ہنسی اور چلی گئی۔

میں ڈاکٹر کولیئر کے سنٹر میں والدین اور بچوں کے ساتھ ہر ہفتے کئی کئی گھنٹے گزارنے لگا۔ زیادہ تر مائیں سترہ تا اکیس بائیس سال کی ہوں گی۔ ان کی پرورش گارڈنز میں ہی ہوئی اور ان کی اپنی مائیں بھی کمسنی میں حاملہ ہوئی تھیں۔ وہ چودہ یا پندرہ سال کی عمر میں حمل، سکول چھوڑنے، بوائے فرینڈز کی اچانک بے رخی کے متعلق کسی ذاتی شعور کے بغیر بات کرتیں۔ انہوں نے نظام کی کارکردگی کے بارے میں بتایا جس میں زیادہ تر انتظار ہی ملوث تھا: سوشل ورکر سے ملاقات کا انتظار، ویلفیئر چیک کیش کروانے کے لیے کرنسی ایکسچینج میں انتظار، بس کا انتظار جو انہیں قریب ترین سپر مارکیٹ تک لے جاتی (محض ڈائپرز خریدنے کی خاطر)۔

انہوں نے اپنی نہایت محدود دنیاؤں میں زندہ رہنے کے ذرائع پر عبور حاصل کرلیا تھا۔ البتہ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ سنکی نہیں تھیں۔ وہ اب بھی بلند عزائم کی مالک تھیں۔ کبھی کبھی ان کے معصوم خوابوں کے متعلق سنتے ہوئے مجھے شدید خواہش ہوتی کہ ان لڑکیوں اور ان کے بچوں کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر سینے سے لگاؤں اور کبھی علیحدہ نہ کروں۔ میرا خیال ہے کہ لڑکیوں نے بھی اس داخلی تحریک کو محسوس کرلیا۔ مثلاً ایک نہایت حسین لڑکی لنڈا نے اپنی سہیلی کو مسکرا کر دیکھا اور مجھ سے پوچھا کہ میں نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی۔

''شاید مجھے ابھی تک اپنی مرضی کی عورت نہیں ملی،'' میں نے جواب دیا۔

لنڈا کی سہیلی نے اسے ایک چپت لگائی اور کہا، ''چپ کرو! تم نے مسٹر اوباما کو شرمندہ کردیا ہے۔''

اور وہ دونوں ہنسنے لگیں اور مجھے محسوس ہوا کہ ایک اعتبار سے میں بھی ان کی نظر میں معصوم لگتا ہوں گا۔

والدین کے لیے میرا منصوبہ سادہ تھا۔ ہم ابھی تک ریاست کی ویلفیئر پالیسی کو بدلنے یا مقامی سطح پر روزگار پیدا کرنے یا سکولوں کو زیادہ فنڈز دلوانے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ لیکن ہم گارڈنز میں بنیادی سہولیات بہتر بنانے پر کام شروع کرسکتے تھے...... ٹوائلٹس کی دیکھ بھال، ہیٹرز

اور کھڑکیوں کی مرمت۔ میں نے تصور کیا کہ اگر چند ایک فتوحات مل جائیں تو میں حقیقی معنوں میں خودمختار تنظیم کا نیوکلیئس تشکیل دے لوں گا۔ اس حکمت عملی کے پیش نظر میں نے والدین کی میٹنگ میں شکایاتی فارمز کا ایک سیٹ مہیا کیا اور سب سے کہا کہ وہ اپنے اپنے بلاک کی تفصیل بتائیں۔

آئندہ چند ماہ کے دوران ڈاکٹر کولیئر نے ہمیں یوتھ کونسلنگ نیٹ ورک کے لیے ایک تجویز تیار کرنے میں مدد دی تا کہ خطرے کے شکار نوجوانوں کو راہنمائی اور تربیت دے کر طویل المیعاد اصلاحی منصوبے میں ملوث کیا جا سکے۔ لیکن میرا ذہن کسی اور چیز میں لگا ہوا تھا۔

انھی دنوں میں واشنگٹن ڈی سی گیا جہاں میرا بھائی رائے مقیم ہوا تھا۔ ہم نے اوما کی شکاگو آمد کے وقت پہلی مرتبہ آپس میں فون پر بات کی تھی۔ اوما نے بتایا تھا کہ رائے نے ایک امریکی امن کارکن سے شادی کر لی تھی اور سٹیٹس آ گیا تھا۔ تصویروں میں وہ دبلا پتلا آدمی نظر آتا تھا۔

جب میں واشنگٹن ڈی سی کے نیشنل ایئرپورٹ پر اترا تو رائے دکھائی نہ دیا۔ میں نے اس کے گھر کال کی تو اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا،

''بھائی۔ سنو، میرے خیال میں کیا تم آج رات ہوٹل میں گزار سکتے ہو؟''

''کیوں؟ کیا کوئی مسئلہ ہے؟''

''کوئی زیادہ سنگین بات نہیں۔ بس ذرا بیوی کے ساتھ گڑبڑ ہوئی ہے۔ اس لیے آج کی رات تمہارا یہاں ہونا ٹھیک نہیں۔ تم سمجھ گئے ہو نا؟''

''ہاں، سمجھ گیا ہوں.....''

''جب کوئی ہوٹل مل جائے تو مجھے کال کرنا، او کے؟ ہم رات کو ملیں گے اور اکٹھے کھانا کھائیں گے۔ میں تمہیں آٹھ بجے ساتھ لے لوں گا۔''

میں نے سستا ترین کمرہ ڈھونڈا اور انتظار کرنے لگا۔ نو بجے دستک سنائی دی۔ جب دروازہ کھولا تو ایک اونچے لمبے آدمی کو جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہاں کھڑے دیکھا۔

اس نے کہا، ''ہیلو، بھائی۔ کیسا چل رہا ہے سب؟''

اوما کی رائے درست تھی۔ وہ واقعی میرے باپ سے بہت مشابہت رکھتا تھا۔ اسے دیکھ کر میں نے ایک مرتبہ پھر خود کو دس سالہ بچہ محسوس کیا۔

''تم کچھ موٹے ہو گئے ہو۔'' میں اسے ساتھ لے کر کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

رائے نے اپنی بڑھی ہوئی توند پر نظر ڈالی اور اسے تھپتھپایا۔ ''اوہ، یار یہ ساری فاسٹ فوڈ کی خرابی ہے۔ جدھر دیکھو وہ موجود ہے۔ مکڈونلڈ، برگر کنگ۔ یہ چیزیں لینے کے لیے کار سے بھی نہیں اترنا پڑتا۔

تھوڑی دیر بعد ہم اس کی گاڑی میں بیٹھ کر ایک میکسیکی ریسٹورنٹ میں پہنچے۔ میں نے بیئر کا آرڈر دیا اور رائے نے مارگریٹا کا۔ ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد کھانا بھی آ گیا اور انجام کار میں نے پوچھ ہی لیا کہ اس کی بیوی ساتھ کیوں نہیں آئی۔ رائے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

''آہ، میرے خیال میں ہماری طلاق ہونے والی ہے۔''

''اوہو، مجھے افسوس ہوا یہ جان کر۔''

''اس کا کہنا ہے کہ میں رات کو دیر سے گھر آتا ہوں۔ وہ کہتی ہے کہ میں بہت زیادہ پیتا ہوں۔ وہ کہتی ہے کہ میں بالکل بوڑھے جیسا بنتا جا رہا ہوں۔''

''اور تم کیا کہتے ہو؟''

''میں نے کیا کہنا ہے؟'' اس نے سر جھکا لیا اور پھر فکرمندانہ انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا، ''سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے حقیقت میں اپنا آپ بھی اچھا نہیں لگتا۔ اور میں بوڑھے کو اس کا ذمہ دار سمجھتا ہوں۔''

اگلے ایک گھنٹے کے دوران اس نے اوما کی بتائی ہوئی مشکلات کو پھر سے بیان کیا۔ اس نے اپنی زندگی کے متعلق بتایا: باپ کا گھر چھوڑنا، ایک کے بعد دوسرے رشتے دار کے گھر میں پناہ لینا، نیروبی یونیورسٹی میں داخلہ، گریجوایشن کے بعد مقامی اکاؤنٹنگ فرم میں نوکری حاصل کرنا، نہایت منظم انداز میں کام۔

کھانا ختم ہونے پر اس نے مجھ سے کہا، ''میرے لیے کبھی بھی کچھ اچھا نہیں رہا۔ بوڑھا ہوشیار تھا، اور وہ آپ کو کبھی بھولنے نہیں دیتا تھا۔ اگر آپ کلاس میں سیکنڈ گریڈ لے کر آتے تو وہ پوچھتا کہ فرسٹ گریڈ کیوں نہیں لیا۔ وہ واقعی یقین رکھتا تھا کہ ہم اوباما ہیں اور اوباما کو ہمیشہ بہترین کارکردگی دکھانی چاہیے۔ پھر میں نے اسے نشے میں مست اور فقیر کی طرح زندگی گزارتے دیکھا۔ میں نے خود سے پوچھا کہ اس جیسا کوئی ہوشیار آدمی اس قدر ذلت کا شکار کیسے ہو سکتا ہے؟ مجھے یہ چیز بالکل

بے تک لگتی تھی۔

''الگ ہو جانے اور حتیٰ کہ اس کی موت کے بعد بھی میں اس الجھن کو سلجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ یوں سمجھ لو کہ میں اس سے نجات نہیں پا سکتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ تدفین کے لیے ہم اسے ایلیگو لے کر گئے اور بڑا بیٹا ہونے کے ناتے مجھے تجہیز و تکفین کا انتظام کرنا تھا۔ حکومت چاہتی تھی کہ بطور عیسائی دفنایا جائے اور اہل خانہ مسلم دستور کے مطابق تدفین چاہتے تھے۔ ہر جگہ سے لوگ ہمارے صحن میں آ کر بیٹھ گئے۔ اور ہمیں Luo روایت کے مطابق سوگ منانا تھا، یعنی تین دن تک درخت کا ایک تنا جلائے رکھنا، لوگوں کا گریہ سننا، وغیرہ۔ ان میں سے آدھے لوگوں کو تو میں جانتا تک نہیں تھا۔ وہ کھانا اور بیئر چاہتے تھے۔ کچھ ایک نے سرگوشیاں کیں کہ بوڑھے کو زہر دیا گیا تھا، کہ مجھے انتقام لینا چاہیے۔ کچھ لوگ ہمارے گھر سے چیزیں چرا کر لے گئے۔ پھر ہمارے رشتے دار بوڑھے کی جائیداد پر آپس میں جھگڑنے لگے۔ بوڑھے کی آخری گرل فرینڈ...... ہمارے ننھے بھائی جارج کی ماں...... سب کچھ لینا چاہتی تھی۔ آنٹی سارہ جیسے کچھ افراد نے اس کا ساتھ دیا۔ دیگر ماں کے طرف دار بن گئے۔ یہ سب کچھ ایک پاگل پن تھا! ہر چیز غلط لگ رہی تھی۔

''تدفین کے بعد میں ان میں سے کسی کا بھی ساتھ نہیں دینا چاہتا تھا۔ ہمارا چھوٹا بھائی ڈیوڈ واحد بھروسے کا آدمی تھا۔ وہ دیکھنے میں تمہارے جیسا تھا اور اس کی عمر کوئی پندرہ سولہ سال ہو گی۔ اس کی ماں روتھ نے اسے ایک امریکی لڑکے کے طور پر پالنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ڈیوڈ نے بغاوت کر دی۔ وہ سب سے محبت کرتا تھا۔ وہ گھر چھوڑ کر میرے پاس آ گیا۔ میں نے کہا کہ اسے واپس چلے جانا چاہیے، مگر وہ نہ مانا۔ ڈیوڈ امریکی نہیں بننا چاہتا تھا۔ وہ خود کو ایک افریقی اور اوباما سمجھتا تھا۔

''ڈیوڈ کی موت کے بعد میرا سب کچھ ختم ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ سارے خاندان کو بددعا لگی ہے۔ میں شراب نوشی کرنے اور لڑنے جھگڑنے لگا۔ میں نے سوچا کہ اگر بوڑھا مر سکتا ہے اور ڈیوڈ کو موت آ سکتی ہے تو مجھے بھی مرنا ہو گا۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر میں کینیا میں ہی رہ جاتا تو میرا کیا بنتا۔ وہاں اس امریکی لڑکی نینسی سے میری ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ وہ سٹیٹس واپس آ گئی۔ ایک روز میں نے اسے یونہی کال کی اور کہا کہ میں بھی آنا چاہتا ہوں۔ اس نے ہاں کی تو میں نے ایک ٹکٹ خریدا اور اگلے جہاز پر روانہ ہو گیا۔ نہ سامان باندھا، نہ اپنے دفتر میں اطلاع کی، نہ کسی کو

خدا حافظ کہا۔

''میں نے سوچا کہ سب کچھ نئے سرے سے شروع کر سکتا ہوں۔ لیکن اب میں جانتا ہوں کہ کچھ بھی نئے سرے سے نہیں ہو سکتا۔ آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کو کنٹرول حاصل ہے، لیکن آپ کسی اور کے جالے میں پھنسی ہوئی مکھی ہیں۔ کبھی کبھی لگتا ہے کہ مجھے اکاؤنٹنگ اسی وجہ سے پسند ہے۔ آپ سارا دن اعداد کا کھیل کھیلتے رہتے ہیں۔ آپ انہیں جمع کرتے، ضرب دیتے ہیں اور اگر آپ توجہ دیں تو ہمیشہ حل مل جاتا ہے۔ ایک ترتیب اور نظم موجود ہے۔ اعداد کے معاملے میں آپ کنٹرول حاصل کر سکتے ہیں.....''

رائے نے ڈرنک سے ایک اور گھونٹ بھرا۔ پھر اس کی آواز ایک دم نیچی ہو گئی، کہ جیسے کسی اور جگہ پر جا گرا ہو۔ ''میں سب سے بڑا ہوں اور Luo روایت کے مطابق اب میں خاندان کا سربراہ ہوں۔ تمہاری، اوما اور تمام چھوٹے بھائیوں کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ حالات کو درست کرنا میرا فرض ہے۔ ایک موزوں گھر بنانا اور سارے خاندان کو اکٹھا رکھنا۔''

میں نے بازو آگے بڑھا کر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا اور کہا، ''تمہیں اکیلے یہ کام کرنے کی ضرورت نہیں، بھائی۔ ہم مل کر بوجھ اٹھا سکتے ہیں۔''

لیکن اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ اس نے گھڑی کی جانب نظر ڈالی اور پھر ایک دم ویٹرس کو اشارے سے بلایا۔

''ایک اور ڈرنک لو گے؟''

''ہم یہاں سے چلیں؟ کیا خیال ہے؟''

رائے نے میری جانب دیکھا اور مسکرایا۔ ''میں دیکھ رہا ہوں کہ تم بہت فکر کرتے ہو۔ میرا بھی یہی مسئلہ ہے۔ میرے خیال میں ہمیں بہاؤ کے ساتھ بہنا سیکھنا چاہیے۔'' اس نے اتنا اونچا قہقہہ لگایا کہ ساتھ والی میز پر بیٹھے لوگوں نے مڑ کر دیکھا۔ مگر یہ قہقہہ کھوکھلا لگا، کہ جیسے وحشت اور تنہائی سے آ رہا ہو۔

اگلے روز میں فلائٹ پکڑ کر واپس آ گیا۔ رائے کو اپنی بیوی سے جھگڑا نمٹانے کے لیے مزید وقت چاہیے تھا اور میرے پاس مزید ایک رات ہوٹل میں رہنے کے پیسے نہیں تھے۔ ایئرپورٹ کے گیٹ پر ہم نے ہاتھ ملایا اور اس نے گلے ملتے ہوئے وعدہ کیا کہ معاملات بہتر ہو جائیں تو وہ مجھے

ملنے شکاگو آئے گا۔ سارے راستے اور پورے اگلے ہفتے کے دوران میں اس خیال سے چھٹکارا نہ پا سکا کہ رائے کسی خطرے سے دوچار ہے، کہ پرانی بد روحیں اسے ایک کھائی کی جانب دھکیل رہی تھیں، کہ اگر میں اچھا بھائی ہوں تو میری معاونت اسے گرنے سے بچا لے گی۔

دفتر پہنچنے پر جانی نے اطلاع دی کہ سٹیٹ سینیٹر ایک پائلٹ پروجیکٹ کے لیے فنڈ دینے کی تجویز پیش کرنے کو تیار ہو گیا تھا۔ ''شاید پورے نصف ملین تو نہ ملیں، لیکن کافی مل جائیں گے۔''

مہینے برق رفتاری سے گزرنے لگے۔ ہمیں متواتر ادھورے پڑے کاموں کے متعلق یاد دہانی کروائی جاتی رہی۔ ہم نے پورے شہر کی سطح پر سکولوں کی اصلاح میں مدد کے لیے ایک اتحاد تشکیل دیا تھا۔ ہم نے نیا یاؤں کے ساتھ مل کر اجلاس کیے اور خطے کے لیے ایک مشترکہ ماحولیاتی حکمت عملی بنائی۔ اس دوران ہیرلڈ بھی مر چکا تھا۔

تیسرا حصہ

کینیا

تیرھواں باب

وطن؟

میری فلائٹ ہیتھرو ایئر پورٹ کے بادلوں بھرے آسمان پر روانہ ہوئی۔ میرے ساتھ بیٹھے نوجوان نے ایمرجنسی کے لیے ہدایت کا کتابچہ دو مرتبہ غور سے پڑھا اور پھر پوچھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اپنے خاندان والوں سے ملنے نیروبی جا رہا تھا۔

''نیروبی ایک خوب صورت جگہ ہے۔ میں نے سن رکھا ہے۔ شاید میں بھی ایک دن کے لیے وہاں رکوں۔ میں جوہانسبرگ جا رہا ہوں۔'' اس نے بتایا کہ جیالوجی میں ڈگری پروگرام کے تحت برطانوی حکومت نے اسے اور اس کے ہم جماعتوں کو ایک سال کے لیے جنوبی افریقہ کی کانکنی والی کمپنیوں میں بھیجنے کا انتظام کیا ہے۔'' لگتا ہے کہ ان کے پاس تربیت یافتہ لوگوں کی کمی ہے، اس لیے اگر ہمیں مستقل جگہ مل جائے تو ہماری خوش قسمتی ہوگی۔''

میں نے کہا کہ اگر موقعہ دیا جائے تو بہت سے سیاہ فام جنوبی افریقی اس قسم کی تربیت لینے کو تیار ہوں گے۔

اس نے جواب دیا، ''ہاں، میرے خیال میں تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں وہاں کی نسل پرستی کی پالیسی سے اتفاق نہیں کرتا۔ شرمناک ہے یہ۔''

مزید ایک دو باتوں کے بعد وہ سو گیا اور میں مختلف افریقی ممالک کے متعلق ایک مغربی صحافی کی لکھی ہوئی کتاب پڑھنے لگا۔ کتاب کا تیسرا باب پڑھ کر میں ماضی کے متعلق سوچنے لگا۔ قحط، وبا، سازشیں اور جوابی سازشیں...... اگر افریقہ کی کوئی تاریخ تھی تو مصنف کے مطابق موجودہ گڑبڑ اور ہلچل نے اس تاریخ کو بے معنی بنا دیا تھا۔
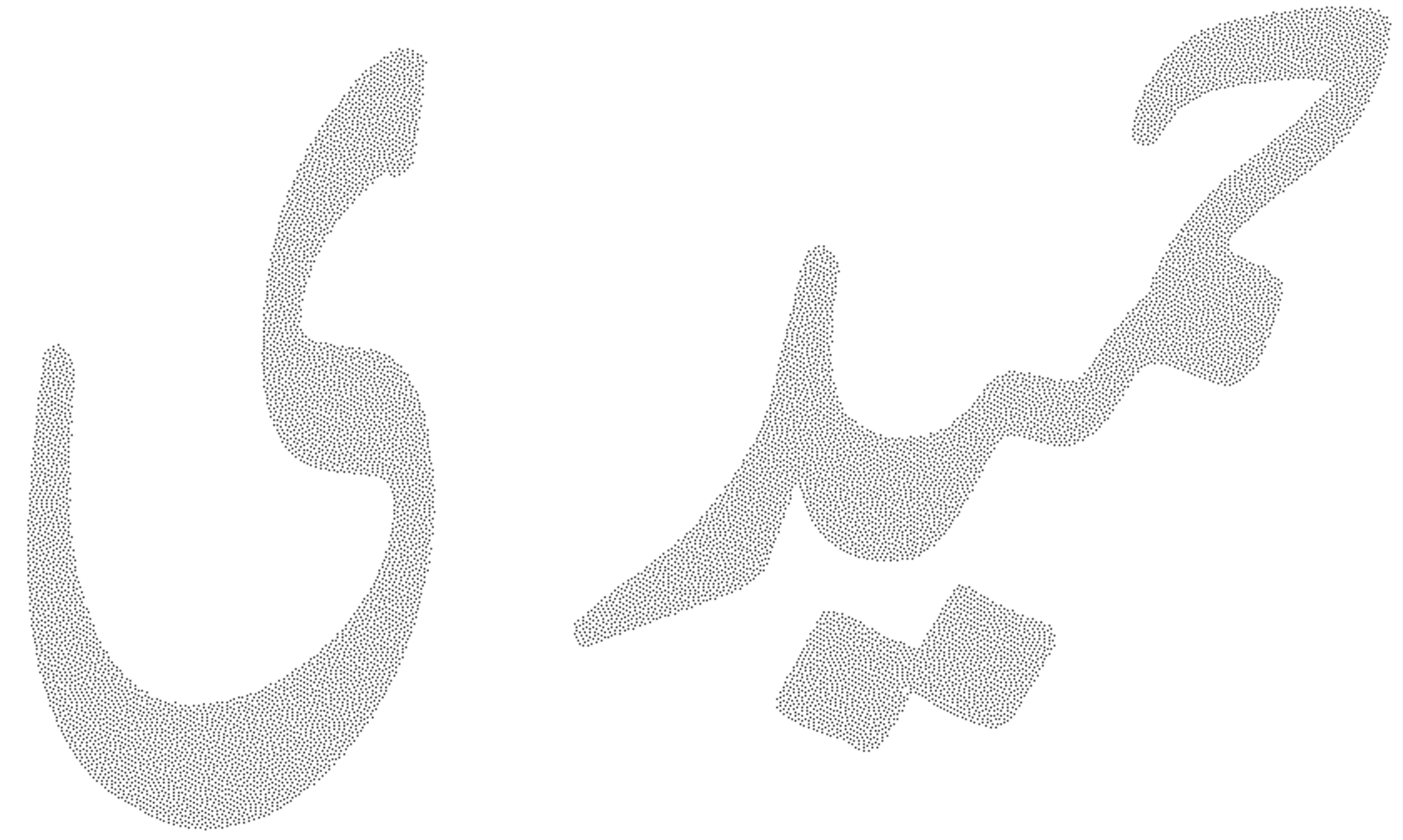
میں نے کتاب نیچے رکھی۔ میں نے اپنی رگوں میں ایک غیض وغضب دوڑتا محسوس کیا۔ میرے ساتھ والی سیٹ پر نوجوان گورا ہلکے ہلکے خراٹے لے رہا تھا۔ اس کا چشمہ ایک طرف کو کھسکا ہوا تھا۔ کیا مجھے اس پر غصہ تھا؟ میں نے سوچا۔ کیا یہ اس کی غلطی تھی کہ اپنی تمام تعلیم، اپنی تمام تھیوریز کے باوجود میرے پاس اس کے اٹھائے ہوئے سوالات کے کوئی تیار جواب نہ تھے؟ میں اسے مورد الزام کیسے ٹھہرا سکتا تھا کہ وہ اپنے جیسوں کی بہتری چاہتا تھا؟

میں یورپ میں اپنے تمام قیام کے دوران ایسا ہی محسوس کرتا رہا تھا...... جلا بھنا، دفاعی، اجنبیوں سے گریزاں۔ میں نے ایسا کرنے کا نہیں سوچا تھا۔ میں نے محض ان دیکھی جگہوں کو دیکھنے کا موقعہ ملنے سے فائدہ اٹھانے کا سوچا تھا۔ میں نے تین ہفتے تک بس پر تنہا پورے یورپ کا سفر کیا۔ میں نے ٹیمز کے کنارے چائے پی، لکسمبورگ گارڈن میں بچوں کو ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے دیکھا۔ اور پہلے ہفتے کے اختتام پر محسوس ہوا کہ میں نے غلطی کی تھی۔ بات یہ نہیں تھی کہ یورپ خوب صورت نہیں تھا۔ ہر چیز میرے تصور کے عین مطابق تھی۔ میرا اپنا نامکمل پن میرے اور ان خوب صورت مقامات کے درمیان شیشے کی دیوار کی طرح کھڑا رہا۔ مجھے شک ہونے لگا کہ یورپ میں رکنا بھی بوڑھے سے گریز کی محض ایک اور کوشش ہی تھا۔ زبان، کام، روٹین اور حتیٰ کہ نسلی تعصبات کے مشاہدے کی مصروفیت ختم ہو جانے پر میں اپنے اندر جھانکنے پر مجبور ہوا اور وہاں بس ایک وسیع وعریض تنہائی ہی ملی۔

کیا کینیا کا یہ دورہ اس خالی پن کو بھر دے گا؟ پیچھے شکاگو میں رہ گئے ساتھیوں کا یہی خیال تھا۔ دوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے افریقہ کے منتخب پہلوؤں کو ہی گلے لگایا تھا۔ وہ ہمارے لیے کسی حقیقی مقام کی بجائے محض ایک تصور، ایک نئی ارض موعودہ بن گیا تھا۔ یہ فاصلہ ختم ہو گیا تو کیا ہوگا؟ یہ یقین باعث راحت تھا کہ سچائی کسی نہ کسی طرح مجھے آزاد کر دے گی۔ لیکن اگر یہ غلط ہوا تو کیا ہوگا؟ اس صورت میں کیا ہوگا اگر مجھے مایوسی ہوئی؟

کینیاتا انٹرنیشنل ایئر پورٹ تقریباً خالی تھا۔ حکام صبح کی چائے پیتے ہوئے پاسپورٹس پر نظر ڈال رہے تھے۔ اوما کہیں نظر نہیں آ رہی تھی، لہٰذا میں اپنے بیگ پر بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگایا۔ چند منٹ بعد ایک سکیورٹی گارڈ ہاتھ میں لکڑی کا ڈنڈا لیے آیا۔ میں نے سوچا کہ شاید وہاں سگریٹ پینے

کی اجازت نہیں ہوگی، لہٰذا ایش ٹرے تلاش کرنے لگا۔ لیکن اس نے مجھے ڈانٹنے کے بجائے پوچھا کہ کیا میرے پاس ایک اور سگریٹ ہوگا۔

"تم پہلی بار کینیا آئے ہو نا؟" جب میں اس کا سگریٹ سلگا رہا تھا تو اس نے پوچھا۔

"ہاں، ایسا ہی ہے۔"

"اچھا۔" وہ میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ "تم امریکہ سے ہو۔ میرے بھائی کا بیٹا سیمسن اونیانو ٹیکساس میں انجینئرنگ پڑھ رہا ہے۔"

میں نے اسے بتایا کہ میں کبھی ٹیکساس نہیں گیا اور اس کے بھتیجے سے ملاقات کا کوئی امکان نہیں۔ یہ جان کر وہ کچھ ناامید سا ہو گیا اور جلدی جلدی سگریٹ کے کچھ کش لگائے۔ میرے ساتھ فلائٹ میں آنے والے دیگر مسافر بھی ٹرمینل سے جا چکے تھے۔ میں نے گارڈ سے پوچھا کہ کیا کوئی مزید سامان ابھی آنا ہے۔ اس نے شک ظاہر کرنے کے انداز میں سر ہلا دیا اور بولا:

"لگتا تو نہیں۔ لیکن اگر تم یہاں انتظار کرو تو میں تمہاری مدد کے لیے کسی کو کہتا ہوں۔"

وہ ایک تنگ سے برآمدے میں غائب ہو گیا اور میں ٹیلی فون کی تلاش میں ادھر ادھر نظر دوڑانے لگا۔ اتنے میں ایک نہایت حسین، چھ فٹ لمبی، دبلی پتلی، گہری رنگت والی عورت برٹش ایئرویز کا یونیفارم پہنے ہوئے آئی۔ اس نے اپنا تعارف بطور مس اومورو کروایا اور بتانے لگی کہ میرا بیگ غالباً غلطی سے جوہانسبرگ والی فلائٹ پر بھیجا گیا تھا۔

"مجھے نہایت افسوس ہے۔ اگر آپ یہ فارم پر کر دیں تو ہم جوہانسبرگ اطلاع کریں گے اور بیگ جلد از جلد واپس منگوا لیں گے۔"

میں نے فارم پر کیا اور مس اومورو نے ایک نظر ڈال کر واپس مجھے پکڑا دیا۔ "کیا تم ڈاکٹر اوباما کے کوئی رشتے دار تو نہیں ہو؟" اس نے کہا۔

"ہاں۔ وہ میرا باپ تھا۔"

مس اومورو ہمدردانہ انداز میں مسکرائی۔ "مجھے اس کی موت کا بہت دکھ ہے۔ تمہارا باپ ہمارے خاندان کا قریبی دوست تھا۔ جب میں بچی تھی تو وہ اکثر ہمارے گھر آیا کرتا تھا۔"

اتنے میں پیچھے سے اوما کی آواز سنائی دی، "بارک!" وہ ایک اور گارڈ کے پیچھے اچھل رہی تھی جو اسے پیکیج والے ایریا میں نہیں آنے دے رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگایا۔ اس کے

ساتھ کھڑی نسواری رنگت والی ایک بلند قامت عورت مسکرا رہی تھی۔ اوما نے مڑ کر کہا، ''بارک، یہ ہماری پھپھو زیتونی ہے۔''

''وطن میں خوش آمدید'' کہہ کر زیتونی نے مجھے دونوں گالوں پر چوما۔

اوما نے ہمیں پرانی ہلکے نیلے رنگ کی واکس ویگن میں بٹھایا۔ بدقسمتی سے انجن بند ہو گیا اور اوما کو دونوں ہاتھوں سے سٹیئرنگ پکڑ کر جھلاتے دیکھ کر میں ہنسی ضبط نہ کر سکا۔

''کیا میں باہر نکل کر دھکا لگاؤں؟''

زیتونی نے تیوری چڑھائی۔ ''باری۔ اس کار کے متعلق کچھ نہ کہو۔ یہ بہت خوب صورت کار ہے۔ بس تھوڑا اپینٹ ہونے کی ضرورت ہے۔ درحقیقت اوما نے وعدہ کیا ہے کہ واپس جاتے وقت یہ کار مجھے دے جائے گی۔''

اوما نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تمہاری پھپھو مجھے دھوکا دینے کی کوشش کر رہی ہے، بارک۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ ہم اس بارے میں بات کریں گے۔ بس۔''

''بات کیا کرنی ہے؟ اوما، میں نے کہا تو ہے کہ میں تمہیں بہترین قیمت ادا کروں گی۔'' زیتونی پلکیں جھپکاتی ہوئی بولی۔

دونوں ایک ساتھ بولنے لگیں۔ انہوں نے پوچھا کہ میرا سفر کیسا رہا۔ پھر انہوں نے بتایا کہ مجھے کہاں کہاں جانا ہے اور کس کس سے ملنا ہے۔ سڑک کے دونوں طرف وسیع وعریض میدان پھیلے ہوئے تھے۔ آہستہ آہستہ ٹریفک گنجان ہوتی گئی اور لوگ بھی زیادہ نظر آنے لگے۔ ہم نے زیتونی کو کینیا بریویز میں ڈراپ کیا جہاں وہ بطور کمپیوٹر پروگرامر کام کرتی تھی۔ کار سے باہر نکلتے ہوئے اس نے ایک مرتبہ پھر جھک کر مجھے چوما اور اوما سے بولی، ''تم باری کا خیال رکھنا۔ اسے دوبارہ گم ہونے سے بچانا۔''

اوما کا اپارٹمنٹ چھوٹا مگر آرام دہ تھا۔ ہر طرف کتابوں کے ڈھیر لگے تھے۔ ایک دیوار پر تصویروں کا کولاج آویزاں تھا۔ اوما کے بستر کے اوپر میں نے ایک سیاہ فام عورت کا بڑا سا پوسٹر دیکھا جس کا چہرا تھوڑا سا اوپر کو جھکا ہوا تھا اور نچلے حصے میں ''I Have Dream'' کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔

''تو تمہارے کیا خواب ہیں، اوما؟'' میں نے اپنے بیگ رکھتے ہوئے پوچھا۔

اوما ہنس دی۔ ''او بارک، یہ بہت بڑا مسئلہ ہے۔ بہت سے خواب۔ خواب دیکھنے والی عورت کو ہمیشہ مسائل پیش آتے ہیں۔''

سفر کی تھکن میرے حلیے سے عیاں ہو رہی ہو گی، کیونکہ اوما نے مجھے کچھ دیر ستانے کو کہا اور بتایا کہ وہ اتنی دیر میں اپنی کلاس لینے یونیورسٹی جا رہی ہے۔ میں اپنے لیے بچھائی گئی چارپائی پہ لیٹا اور سو گیا۔ آنکھ کھلی تو شام ہو رہی تھی اور اوما ابھی تک نہیں آئی تھی۔

اس رات ہم نے گھر پر ہی رہنے اور کچھ پکانے کا فیصلہ کیا۔ اگلی صبح ہم پیدل قصبے میں گئے اور ادھر اُدھر گھومتے پھرتے رہے۔ ہم ایک پرانے بازار میں جا نکلے جہاں تازہ پھل اور گوشت کی دکانیں تھیں۔ ایک ٹھیلے والا بولا! ''ادھر آؤ مسٹر۔ یہ خوب صورت نیکلس تمہاری بیوی کے لیے۔''

''یہ میری بہن ہے۔''

''یہ بہت پیاری بہن ہے۔ ادھر آؤ۔ یہ تمہارے لیے بہت اچھا ہے۔''

''کتنے کا؟''

''صرف پانچ سو شلنگ، بہت خوب صورت ہے۔''

اوما نے تیوری چڑھائی اور سواحلی زبان میں اس آدمی کو کچھ کہا۔ پھر مجھ سے بولی، ''وہ تمہیں گورے آدمیوں والا ریٹ بتا رہا ہے۔''

نوجوان مسکرایا اور کہنے لگا، ''معافی چاہتا ہوں۔ کینیائی کے لیے قیمت صرف تین سو شلنگ ہو گی۔''

ٹھیلے کے پیچھے سے ایک بوڑھی عورت آئی جو موتی پرو رہی تھی۔ اس نے میری طرف اشارہ کر کے کچھ کہا اور اوما مسکرا دی۔

''وہ کیا کہہ رہی ہے؟''

''وہ کہتی ہے کہ تم اسے کسی امریکی جیسے لگ رہے ہو۔''

''اسے بتاؤ کہ میں Luo قبیلے سے ہوں،'' میں نے چھاتی پہ ہاتھ مار کر کہا۔

بوڑھی عورت مسکرائی اور اوما سے میرا نام پوچھا۔ جواب سن کر وہ اور بھی زور سے ہنسی اور مجھے اپنے پاس بلا کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ اوما نے کہا، ''وہ کہہ رہی ہے کہ تم Luo جیسے نہیں لگتے، لیکن

تمہارے چہرے پر نرمی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ اس کی ایک بیٹی ہے جس سے تمہیں ملنا چاہیے، اور اگر تم اسے ایک سوڈا خرید کر دو تو وہ تمہیں دو شیشیاں اور یہ نیکلس پانچ سوشلنگ میں دے سکتی ہے۔''

نوجوان ہم سب کے لیے سوڈا لینے چلا گیا۔ ہم بوڑھی عورت کے دیے ہوئے سٹولوں پر بیٹھ گئے۔ اس نے اپنے کاروبار کے متعلق بتایا...... کہ کیسے وہ حکومت کو سٹال کا کرایہ دیتی تھی، کیسے اس کا دوسرا بیٹا فوج میں چلا گیا کیونکہ گاؤں میں اور کوئی کمانے والا نہیں رہا تھا۔ پیچھے ایک عورت رنگین تنکوں والی ٹوکریاں بن رہی تھی؛ اس کے ساتھ بیٹھا ایک آدمی کھال سے لمبی پٹیاں کاٹ رہا تھا تاکہ انہیں بطور سٹریپ استعمال کر سکے۔

میرے ارد گرد کی ساری دنیا کالی تھی۔ یہاں آپ جو تھے بس وہی تھے۔ آپ جھوٹا دکھاوا کیے یا کوئی دھوکا دیے بغیر اپنی زندگی کی تمام انوکھی چیزیں اپنانے کے قابل تھے۔ ہم نے اپنا اپنا سوڈا ختم کیا، رقم ادا کی اور بازار سے نکل آئے۔ وہ لمحہ وہیں رہ گیا۔

ہم نے بیاتھی سٹریٹ کا رخ کیا جو ماؤ ماؤ بغاوت کے ایک راہنما کے نام سے منسوب تھی۔

نیو سٹینلے ہوٹل میں ہم لنچ کرنے بیٹھے تو میں آس پاس گھومتے ہوئے سیاحوں پر غور کرنے لگا...... جرمن، جاپانی، برطانوی، امریکی۔ ان سب نے سفاری سوٹ پہن رکھے تھے۔ ہوائی میں جب ہم اس قسم کے کسی سیاح کو دیکھتے تو ان پر ہنسا کرتے تھے۔ یہاں افریقہ میں وہ مضحکہ خیز تو نہ معلوم ہوئے، لیکن میں نے ان کی معصومیت کو مبہم طور پر باعث تضحیک محسوس کیا۔ مجھے لگا کہ وہ قطعی انجانے میں ایک ایسی آزادی کا اظہار کر رہے تھے جو اوما کو یا مجھے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

چند ٹیبلز چھوڑ کر ایک امریکی فیملی بیٹھتی نظر آئی۔ دو افریقی ویٹر فوراً ان کی طرف لپکے۔ اوما اور میں ابھی تک ویٹر کا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے کچن کے قریب کھڑے دو ویٹرز کی طرف ہاتھ ہلایا۔ کچھ دیر تک وہ میری طرف دیکھنے سے گریز کرتے رہے، لیکن انجام کار سوئی ہوئی آنکھوں والا ایک بوڑھا ویٹر مینیو لے کر ہماری طرف آیا۔ اس کا انداز خفگی بھرا تھا۔ مزید کئی منٹ گزرنے کے بعد بھی اس کی واپسی کا کوئی امکان نظر نہ آیا۔ اوما کے چہرے پر غصے کے آثار ظاہر ہوئے۔ میں نے دوبارہ ویٹر کی طرف اشارہ کیا۔ اتنی دیر میں امریکیوں کا کھانا آ گیا تھا اور ہم ابھی تک منتظر تھے۔ اوما ایک دم اٹھی۔

''آؤ چلیں۔''

وہ باہر کی طرف چل دی، لیکن پھر اچانک مڑی اور ویٹر کے پاس گئی جو مجہول نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔

''تمہیں اپنے اوپر شرم آنی چاہیے، شرم آنی چاہیے تمہیں۔'' اوما کی آواز لرز رہی تھی۔

ویٹر نے سواحلی میں کوئی جواب دیا۔

''مجھے کوئی پروا نہیں کہ تم کتنے لوگوں سے آرڈر لیتے ہو، تمہیں اپنے لوگوں کے ساتھ کتوں والا سلوک نہیں کرنا چاہیے۔ یہ لو....'' اوما نے اپنا پرس کھولا اور ایک سوشلنگ کا مچڑا ہوا نوٹ نکالا: ''دیکھو! میں اپنے لعنتی کھانے کے لیے ادائیگی کر سکتی ہوں۔''

اس نے نوٹ زمین پر پھینکا اور بڑبڑاتی ہوئی باہر آ گئی۔ ہم کئی منٹ تک یونہی پھرتے رہے۔ انجام کار میں نے رائے دی کہ سنٹرل پوسٹ آفس کے قریب ایک بنچ پر بیٹھ جائیں۔

''تم ٹھیک ہو نا؟'' میں نے اوما سے پوچھا۔

اس نے ہاں میں سر ہلایا۔ ''ایسے پیسے پھینکنا بے وقوفی تھی۔'' اس نے پرس اپنے پہلو میں رکھا اور ٹریفک کو دیکھنے لگی۔ آخر کار وہ بولی ''پتا ہے، میں کسی اور افریقی عورت کو ساتھ لے کر ان میں سے کسی ہوٹل کے کلب میں نہیں جا سکتی۔ عسکری ہمیں فاحشائیں سمجھ کر باہر نکال دیں گے۔ اگر آپ افریقی ہیں اور وہاں کام نہیں کرتے تو مقصد بتائے بغیر اندر نہیں جا سکتے۔ لیکن اگر کوئی جرمن دوست ساتھ ہو تو ہر کوئی مسکرا کر خوش آمدید کہے گا۔ اسی لیے سارا افریقہ کینیا پر ہنستا ہے، چاہے جی این پی کتنا ہی ہو اور چاہے آپ یہاں کتنی بھی خریداری کر لیں۔ یہ افریقہ کی رنڈی ہے، بارک۔ یہ قیمت ادا کر سکنے والے کسی بھی شخص کے سامنے اپنی ٹانگیں کھولنے کو تیار ہے۔''

میں نے اوما کو بتایا کہ وہ کینیا کے لوگوں کے متعلق بہت درشت رائے دے رہی تھی، کہ جکارتہ یا میکسیکو سٹی میں بھی ایسا ہی ہوتا تھا...... اور یہ محض معاشیات کی بدبختی تھی۔ لیکن جب ہم واپس اپارٹمنٹ کی جانب روانہ ہوئے تو مجھے معلوم تھا کہ میرے الفاظ اس کی ڈھارس نہیں بندھا سکے۔ مجھے شک ہوا کہ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی: نیروبی میں سبھی لوگ وائلڈ لائف دیکھنے نہیں آتے تھے۔ کچھ اس لیے آتے کیونکہ کینیا اس دور کی بازیافت کا موقعہ پیش کرتا تھا جب بیرونی ممالک میں سفید فاموں کی زندگیوں کا بوجھ گہری رنگت والی نسلوں کی کمر پر لدا ہوا تھا۔ کینیا میں کوئی سفید فام آدمی آج بھی Isak Dinesen کے گھر میں جا سکتا یا لارڈ ڈیلامیئر ہوٹل کے سیلنگ فین کے نیچے

بیٹھ کر جن پیتے ہوئے ہیمنگوے کے پورٹریٹس کو سراہ سکتا تھا جن میں اسے سیاہ فام قلیوں کے درمیان بیٹھے دکھایا گیا تھا۔ کسی خوف یا احساس گناہ کے بغیر ہی وہ کسی کالے آدمی سے خدمت کروا سکتا اور فراخدلانہ ٹپ دے سکتا تھا۔ اور ہوٹل سے باہر کوئی بوڑھی فقیر دیکھ کر متلی ہونے کی صورت میں اس کے لیے فوری ایک ٹانک بھی دستیاب تھا۔ آخر سیاہ فاموں کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ یہ ان کا ملک تھا۔ ہم تو محض سیاح ہیں۔

کیا ہمارے ویٹر کو معلوم تھا کہ کالوں کی حکومت آ گئی ہے؟ کیا اس کے لیے یہ چیز کوئی معنی رکھتی تھی؟ شاید بھی رکھتی ہو، میں نے دل میں سوچا۔ اس کو پتا چلا تھا کہ جو لوگ آزادی سے قبل زمین پر مختار تھے اب بھی وہی قادر ہیں، کہ وہ اب بھی ان ریسٹورنٹس میں نہیں کھا سکتا یا گوروں کے بنائے ہوئے ہوٹلوں میں نہیں ٹھہر سکتا۔ وہ شہر کی دولت کو اپنے سر کے گرد چکر لگاتے ہوئے دیکھتا ہے، اور ٹیکنالوجی اپنے روبوٹ منہ سے چیزیں تھوکتی ہے۔ اگر وہ کچھ کرنے کا عزم رکھتا ہے تو گوروں کی زبان سیکھنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا، بالکل اسی طرح پیٹ پالنے کی کوشش کرے گا جیسے نیویارک میں کوئی کمپیوٹر مکینک یا شکاگو میں کوئی بس ڈرائیور کرتا ہے۔ اور اگر آپ اس سے کہیں کہ وہ نونو آبادیت کے مفادات پورے کر رہا ہے یا ایسی ہی کوئی اور بات تو وہ جواب دے گا کہ ہاں، اگر یہ ضروری ہے تو وہ ایسا ہی کرے گا۔ خدمت کرنے والے خوش قسمت ہیں؛ بدقسمت افراد گھٹیا کاموں کو اختیار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ویٹر کو یہ سب کچھ محسوس ہی نہ ہو۔ شاید اس کی ذات کا ایک حصہ اب بھی ماؤ ماؤ بغاوت کی کہانیوں سے چمٹا ہوا اور اس کی یادداشت میں گھر کی چکی میں اناج پینے کی آواز اب بھی موجود ہو۔ اس کی ذات کا ایک حصہ اب بھی کہتا ہو کہ گورے آدمی کے طور طریقے اس کے طور طریقے نہیں، کہ روزمرہ استعمال میں آنے والی اشیا اس کی اپنی بنائی ہوئی نہیں۔

اس شام کو ہم کار میں کاریاکو کی طرف گئے جو غلیظ مکانات کے درمیان میں ایک وسیع و عریض رہائشی کمپلیکس ہے۔ چاند کالے بادلوں کے پیچھے چھپ گیا تھا، اور ہلکی بارش ہونے لگی تھی۔ تیسری منزل پہ پہنچ کر اوما نے ایک دروازے پر لگی گھنٹی بجائی، دروازہ تھوڑا سا کھلا۔

''باری! آخر تم آ ہی گئے!''

چھوٹے قد اور گٹھے ہوئے جسم والی ایک عورت نے مجھے گلے لگا کر زور سے بھینچا۔ اس کے پیچھے کوئی پندرہ افراد تھے۔ سب کے سب کسی مجمعے کی طرح مسکرا اور ہاتھ ہلا رہے تھے۔ عورت نے میرے چہرے پر نظر ڈالی اور تیوری چڑھائی۔

''میں تمہیں یاد تو نہیں ہوں گی نا؟''

''میں......''

میں تمہاری آنٹی جین ہوں۔ میں نے ہی فون کر کے تمہیں تمہارے باپ کے فوت ہونے کی اطلاع دی تھی،'' وہ مسکرائی اور ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی۔ ''آؤ، تمہیں یہاں سب سے ملواتی ہوں۔ زیتونی سے تو تم مل چکے ہو۔ یہ......'' اس نے سبز پرنٹ والے لباس میں ملبوس ایک خوب صورت عورت کی جانب منہ کیا، ''یہ میری بہن کیزیا ہے۔ یہ اوما اور رائے اوباما کی ماں ہے۔''

کیزیا نے میرا ہاتھ پکڑا اور میرا نام لے کر سواحلی زبان میں چند الفاظ کہے۔

''وہ کہہ رہی کہ اس کا دوسرا بیٹا بھی آخر گھر آ ہی گیا ہے،'' جین بولی۔

''میرا بیٹا،'' کیزیا نے الفاظ دہرائے اور مجھے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بولی، ''میرا بیٹا گھر آ گیا ہے۔''

ہم سارے کمرے میں گئے اور خالاؤں، کزنز، بھانجوں، بھانجیوں سے ہاتھ ملائے۔ ہر کسی نے خوشی بھرے تجسس کے ساتھ مجھے خوش آمدید کہا، کہ جیسے پہلی مرتبہ کسی رشتے دار سے ملنا ان کے لیے روز کی بات ہو۔ میں بچوں کے لیے چاکلیٹس کا ایک بیگ لایا تھا۔ وہ میرے گرد اکٹھے ہو گئے اور بڑے انہیں بتانے لگے کہ میں کون ہوں۔ میں نے سولہ سترہ سال کے ایک نوجوان کو دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے دیکھا جس کے چہرے پر گہری سوچ کا تاثر تھا۔

اوما نے مجھے بتایا، ''یہ بھی تمہارے بھائیوں میں سے ایک ہے، برنارڈ۔''

میں نوجوان کے پاس گیا اور ہم نے ہاتھ ملاتے ہوئے ایک دوسرے کے چہروں کو پڑھا۔ مجھے الفاظ نہیں مل رہے تھے، مگر کسی طرح اس کی خیریت دریافت کر ہی لی۔

''ٹھیک ہی ہوں،'' اس نے نرمی سے جواب دیا جس پر تمام لوگ ہنسنے لگے۔

تعارف مکمل ہونے پر جین نے مجھے کھانے پینے کی اشیا سے بھری ایک میز کی جانب دھکیلا۔ کھانے کے دوران ان لوگوں نے مجھ سے ہوائی کی ہر چیز کے متعلق پوچھا، اور میں شکاگو میں اپنی

زندگی اور کام کے متعلق بیان کرتا رہا۔ انہوں نے ایجاب میں سر ہلائے لیکن کچھ بوکھلائے ہوئے محسوس ہوئے۔ چنانچہ میں نے بتایا کہ میں اس موسم خزاں میں ہارورڈ میں لا پڑھوں گا۔

جین نے ایک ہڈی چوستے ہوئے کہا، ''واہ، باری، یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ تمہارا باپ بھی اس سکول، ہارورڈ میں پڑھتا تھا۔ تم ہم سب کا سرفخر سے بلند کرو گے، جیسے اس نے کیا تھا۔ برنارڈ، تم بھی اپنے بھائی کی طرح دل لگا کر پڑھو۔''

''برنارڈ کا خیال ہے کہ وہ ایک فٹ بال سٹار بنے گا،'' زیتونی بولی۔

میں برنارڈ کی طرف مڑا۔ ''برنارڈ، کیا یہ بات درست ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے توجہ اپنی جانب ہونے پر بے سکون ہو کر کہا، ''میں فٹ بال کھیلتا ہوں۔ بس، اتنی سی بات ہے۔''

''اچھا..... شاید کسی وقت ہم آپس میں کھیلیں گے۔''

اس نے اپنا سر ہلایا اور کہا، ''اب مجھے باسکٹ بال کھیلنا پسند ہے، میجک جانسن کی طرح۔''

کھانے کے دوران ابتدائی جوش و خروش کچھ دھیما پڑ گیا اور بچے ایک بڑا سا بلیک اینڈ وائٹ ٹیلی ویژن دیکھنے لگے۔ میں اوما کے ہمراہ باقی کا اپارٹمنٹ دیکھنے گیا جو دو بیڈرومز پر مشتمل تھا اور دونوں میں ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک پرانے گدے بچھے ہوئے تھے۔

''یہاں کتنے لوگ رہتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ جین کسی کو انکار نہیں کر سکتی، سو کوئی بھی رشتے دار شہر میں آنے یا نوکری سے محروم ہونے پر یہاں آ جاتا ہے۔ کبھی کبھی وہ کافی عرصہ ٹھہرتے ہیں، یا پھر اپنے بچے یہاں چھوڑ جاتے ہیں۔ بوڑھا اور میری ماں برنارڈ کو اکثر یہاں چھوڑا کرتے تھے۔ دراصل جین نے ہی اسے پالا ہے۔'' اوما نے بتایا۔

''وہ اتنا خرچ برداشت کر لیتی ہے؟''

''حقیقت میں تو نہیں۔ وہ ٹیلی فون آپریٹر کی نوکری کرتی ہے اور زیادہ نہیں کماتی۔ مگر وہ کوئی شکایت نہیں کرتی۔ اس کے اپنے بچے نہیں ہو سکتے، لہٰذا وہ دوسروں کے بچوں کی دیکھ بھال کرتی رہتی ہے۔''

ہم واپس آ کر لونگ روم میں بیٹھ گئے۔ کچن میں زیتونی لڑکیوں کو پلیٹیں صاف کرنے کا کہہ

رہی تھی؛ کچھ بچے میری دی ہوئی چاکلیٹس پر آپس میں لڑ رہے تھے۔ وہاں کا ماحول شکاگو میں گارڈنز والے اپارٹمنٹ جیسا ہی لگا۔ وہی ماؤں اور بیٹیوں کا سلسلہ، وہی گپ شپ اور ٹی وی، وہی متواتر کھانا اور صفائی، وہی مردوں کی عدم موجودگی۔

کوئی دس بجے ہم نے اجازت لی اور دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے دروازے کی جانب چل دیے۔ جین نے آگے بڑھ کر اوما کے کان میں کہا، ''تم باری کو اپنی آنٹی سارہ سے بھی ملوانا،'' اور پھر مجھ سے مخاطب ہوئی، ''سارہ تمہارے باپ کی بڑی بہن ہے۔ سب سے بڑی۔ وہ تمہیں ملنے کی شدید خواہش مند ہے۔''

''ضرور۔ لیکن وہ آج رات یہاں کیوں نہیں آئی؟ کیا وہ بہت دور رہتی ہے؟''

جین نے اوما کی طرف دیکھا اور ان کے درمیان کسی ان کہی بات کا تبادلہ ہوا۔ آخر اوما بولی، ''آؤ بارک۔ میں کار میں چل کر تمہیں بتاتی ہوں۔''

سڑکیں خالی اور بارش کی وجہ سے پھسلنی ہو رہی تھیں۔ اوما نے یونیورسٹی کے قریب سے گزرتے ہوئے مجھے بتایا، ''جین ٹھیک کہتی ہے، بارک۔ تمہیں سارہ سے ملنا چاہیے۔ لیکن میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔''

''کیوں نہیں؟''

''یہ بوڑھے کی جائیداد کا مسئلہ ہے۔ سارہ بھی تو اس پر تنازعہ کھڑا کیے بیٹھی ہے۔ وہ لوگوں سے کہتی پھرتی ہے کہ رائے، برنارڈ اور میں ہم تینوں میں سے کوئی بھی بوڑھے کی اولاد نہیں۔'' اوما نے آہ بھری۔ ''مجھے نہیں معلوم۔ کبھی کبھی اس پر رحم آتا ہے۔ اس نے بڑی سخت زندگی گزاری ہے۔ پڑھنے یا باہر جانے کے بوڑھے جیسے مواقع اسے کبھی نہیں ملے۔ اس بات نے اسے سخت گیر بنا دیا ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ میری ماں، میں اور ہم سب اس کی حالت کے ذمہ دار ہیں۔''

''لیکن بوڑھے کی جائیداد کتنے کی ہو گی؟''

''زیادہ نہیں۔ شاید تھوڑی سی سرکاری پنشن۔ بے وقعت زمین کا ایک ٹکڑا۔ میں اس سب سے باہر رہنے کی کوشش کرتی ہوں۔ جو کچھ بھی تھا اب تک وکیلوں کی فیس پر خرچ ہو چکا ہو گا۔ لیکن دیکھا تم نے، ہر کوئی بوڑھے سے کتنی توقعات رکھتا تھا۔ اس نے خود کو ان کے سامنے بہت عظیم بنا کر پیش کیا تھا، حتیٰ کہ سب کچھ چھن جانے پر بھی۔ لہٰذا اب وہ اپنی اپنی زندگی گزارنے کے بجائے

آپس میں لڑتے جھگڑتے اور سمجھتے رہتے ہیں کہ بوڑھا کسی طور قبر سے نکل کر انہیں بچانے آ جائے گا۔ برنارڈ نے بھی یہی انتظار کا رویہ اپنا لیا ہے۔ بارک! تم نے دیکھا ہوگا کہ وہ کتنا سمارٹ ہے، لیکن سارا دن گھر پر بیکار بیٹھا رہتا ہے۔ اس نے سکول چھوڑ دیا اور نوکری ملنے کی کوئی زیادہ امید نہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ اگر وہ کچھ کرنا چاہتا ہے تو میں کوئی ہنر سیکھنے میں اس کی مدد کردوں گی۔ وہ ٹھیک ہے کہہ دیتا ہے، مگر اس سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھاتا۔ کبھی کبھی لگتا ہے کہ مجھے ہی اس کے لیے سب کچھ کرنا پڑے گا۔''

''شاید میں کچھ کرسکوں۔''

''ہاں، شاید تم اس سے بات کرلو۔ لیکن امریکہ سے یہاں آکر اب تم بھی ترکے میں حصے کے دعویدار بن گئے ہو۔ اسی لیے سارہ تم سے ملاقات کی مشتاق ہے۔ اس کے خیال میں میں تمہیں اس سے چھپا رہی ہوں اور سب کچھ تمہارے پاس ہی ہے۔''

ہم نے کار پارک کی تو بارش دوبارہ شروع ہوگئی تھی۔ عمارت کی ایک طرف لگا ہوا واحد بلب اوما کے چہرے پر مائع سایوں کا جال بچھا رہا تھا۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا، ''بارک، یہ سب چیزیں مجھے تھکا دیتی ہیں۔ تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ جرمنی میں رہنے کے دوران میں کینیا کو کتنا یاد کیا کرتی تھی۔ میں بس یہی سوچتی رہتی کہ کب گھر واپس جاؤں گی۔ میں نے سوچا تھا کہ اب یہاں کبھی تنہائی محسوس نہیں ہوگی اور خاندان کے لوگ ہر جگہ موجود ہیں، اور کوئی بھی اپنے بزرگوں کو بوڑھوں کے ادارے میں نہیں بھیجے گا یا بچوں کو اجنبیوں کے پاس نہیں چھوڑے گا۔ اب یہاں آئی ہوں تو ہر کوئی مدد مانگ رہا ہے، اور مجھے لگتا ہے کہ وہ سب مجھے چھوڑ رہے ہیں اور میں جلد ہی ڈوب جاؤں گی۔ مجھے احساس جرم ہوتا ہے کیونکہ میں ان کی نسبت زیادہ خوش قسمت نکلی۔ میں نے ایک یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ میں نوکری کرسکتی ہوں۔ لیکن، بارک میں کیا کروں؟ میں محض ایک اکیلی فرد ہی ہوں؟''

میں نے اوما کا ہاتھ تھاما اور ہم کئی منٹ تک یونہی کار میں بیٹھے رہے۔ آخر وہ بولی، ''تم نے پوچھا تھا کہ میرا کیا خواب ہے۔ کبھی کبھی میں خواب دیکھتی ہوں کہ دادا کی زمین پر خوب صورت سا گھر بناؤں گی۔ ایک بہت بڑا گھر جہاں ہم سب رہ سکیں اور اپنے اہل خانہ کو لا سکیں۔ دادا کی طرح ہم بھی پھل دار درخت لگا سکتے ہیں، ہمارے بچوں کا دھرتی سے رشتہ ہوگا اور وہ Luo بولیں گے اور

بزرگوں سے طور طریقے سیکھیں گے۔ یہ گھر ان کا ہوگا۔''

''اوما، ہم یہ سب کچھ کرسکتے ہیں۔''

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ ''میں تمہیں بتاتی ہوں کہ اس کے بعد کیا خیال آتا ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ میری عدم موجودگی میں گھر کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ مثلاً کوئی مرمت وغیرہ کروانی پڑ گئی تو کون ذمہ داری لے گا؟ مجھے معلوم ہے کہ یہ سب بہت خوفناک اور خود غرضانہ ہے۔ یہ خیالات آنے پر بس میں بوڑھے پر برسنے لگتی ہوں کیونکہ اس نے ہمارے لیے ایک گھر نہ بنایا۔ ہم بچے ہیں، بارک۔ ہم ہر کسی کا خیال کیوں رکھیں؟ ہر چیز الٹ پلٹ اور بے ترتیب ہے۔ برنارڈ کی طرح مجھے اپنا خیال بھی رکھنا پڑتا ہے۔ اب میں اپنی زندگی جینے کی عادی ہوگئی ہوں، بالکل کسی جرمن کی طرح۔ ہر چیز باترتیب اور منظم ہے۔ اگر کوئی چیز ٹوٹ جاتی ہے تو میں اسے ٹھیک کروا لیتی ہوں۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوجائے تو میں درست کرلیتی ہوں۔ اگر میرے پاس کچھ رقم ہو تو خاندان والوں کو بھیج دیتی ہوں، اور وہ اس رقم کا جو چاہے کریں۔ میں ان پر انحصار نہیں کرتی، اور وہ میرے اوپر منحصر نہیں ہیں۔''

''یہ سب تنہائی کا تاثر دیتا ہے۔''

''اوہ، بارک! مجھے معلوم ہے۔ اسی لیے میں گھر جاتی رہتی ہوں۔ اسی لیے میں اب بھی خواب دیکھتی ہوں۔''

دو دن بعد بھی مجھے اپنا بیگ واپس نہیں ملا تھا۔ ایئر لائن آفس نے کہا کہ ایئرپورٹ سے پتا کروں، لیکن ہمیشہ ٹیلی فون کرنے پر لائنز مصروف ملیں۔ آخر اوما نے کہا کہ ہم خود ایئرپورٹ پر جائیں۔ برٹش ایئرویز کے ڈیسک پر دو جوان لڑکیاں کسی نائٹ کلب کے بارے میں بات کرتی ہوئی ملیں جو کچھ ہی دن پہلے کھلا تھا۔ میں نے ان کی گفتگو میں خلل ڈالتے ہوئے اپنے بیگ کے متعلق پوچھا، اور ایک لڑکی کاغذ ٹٹولنے لگی۔

''ہمارے پاس آپ کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے،'' وہ بولی۔

''براہِ مہربانی دوبارہ چیک کرلیں۔''

عورت نے کندھے اچکائے۔ ''اگر آپ چاہیں تو آج رات کو آجائیں۔ اس وقت جوہانسبرگ سے ایک فلائٹ آرہی ہے۔''

"مجھے بتایا گیا تھا کہ میرا بیگ مجھے پہنچایا جائے گا۔"

"آئی ایم سوری۔ لیکن میرے پاس یہاں آپ کے بیگ کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ اگر آپ چاہیں تو ایک اور فارم پر کر سکتے ہیں۔"

"کیا مس اومورو موجود ہیں؟ انہوں نے......"

"اومورو چھٹیوں پر ہیں۔"

اوما نے مجھے ایک طرف کیا: "ہم اور کس سے بات کر سکتے ہیں، کیونکہ آپ کو تو لگتا ہے کسی چیز کا علم ہی نہیں۔"

"اگر آپ کسی اور سے بات کرنا چاہتے ہیں تو شہر میں ہمارے دفتر میں جائیں،" لڑکی نے یہ کہہ کر اپنی گفتگو کا سلسلہ جوڑ لیا۔

برٹش ایئرویز کے دفتر پہنچنے تک بھی اوما بڑبڑا رہی تھی۔ یہ ایک بلند عمارت تھی جس کی لفٹ ہر فلور پر وکٹورین لہجے میں اعلان کرتی تھی۔ ریسپشنسٹ نے دوبارہ کہا کہ ہم ایئرپورٹ پر جائیں۔

"مینیجر سے میری بات کروائیں،" میں نے چیخنے کی خواہش کو دباتے ہوئے کہا۔

"مجھے افسوس ہے۔ مسٹر مدوری ایک میٹنگ میں ہیں۔"

"دیکھیں، مس، ہم ابھی ابھی ایئرپورٹ سے آ رہے ہیں۔ انہوں نے یہاں رابطہ کرنے کا کہا ہے۔ دو روز قبل مجھے بتایا گیا تھا کہ میرا بیگ پہنچ جائے گا۔ اب مجھے بتایا جا رہا ہے کہ کسی کو اس کی گمشدگی کا علم تک نہیں۔ میں......" میں کہتے کہتے رک گیا۔ ریسپشنسٹ ایک سنگین ماسک کے پیچھے چلی گئی تھی، ایسی جگہ جہاں کوئی التجا اور نہ ہی کوئی پتھر پہنچ سکتا ہے۔ اوما نے بھی یہ چیز دیکھ لی تھی، کیونکہ وہ بالکل بے جان نظر آنے لگی تھی۔ ہم دونوں لاؤنج کی کرسیوں پہ بیٹھ کر سوچنے لگے کہ کریں تو کیا کریں۔ تب اچانک اوما کے کندھے پر ایک ہاتھ نمودار ہوا۔ اوما نے پلٹ کر دیکھا تو وہ نیلے بلیزر میں ملبوس ایک دبلے پتلے سیاہ آدمی کا ہاتھ تھا۔

"اوہ، انکل! آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

اوما نے اس آدمی سے میرا تعارف کروایا جو ہمارا کوئی دور کا رشتے دار لگتا تھا۔ اس نے پوچھا کہ کیا ہم کہیں جا رہے تھے۔ تب اوما نے اسے سارا ماجرا کہہ سنایا۔

"سنو! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ مدوری میرا اچھا دوست ہے۔ درحقیقت، کچھ دیر بعد میں اس کے ساتھ لنچ کرنے والا ہوں۔" انکل اکھڑ انداز میں ریسپشنسٹ کی جانب متوجہ ہوا جو بہت دلچسپی سے ہمیں گفتگو کرتے دیکھ رہی تھی۔

"مسٹر مدوری کو آپ کی آمد کا علم ہو چکا ہے،" وہ مسکرا کر بولی۔

مسٹر مدوری پھولی ہوئی نوک اور کڑک دار آواز والا بھاری بھرکم آدمی نکلا۔ ہم نے اپنی کہانی دوبارہ سنائی تو اس نے فوراً فون اٹھایا۔ "ہیلو؟ ہاں، میں مدوری ہوں۔ کون بول رہا ہے؟ سنو، میرے پاس مسٹر اوباما آئے ہیں جو اپنے ایک بیگ کی تلاش میں ہیں۔ ہاں۔ اوباما۔ ان کا بیگ آنا تھا۔ کیا؟ ہاں، مہربانی کر کے دیکھو۔" چند منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی۔ "ہاں.....او کے، وہ بھجوا دو....." اس نے اوما کے دفتر کا پتا بتایا اور فون رکھ کر کہنے لگا کہ بیگ اسی دوپہر کو پہنچا دیا جائے گا۔

"اگر مزید کوئی مسئلہ ہو تو مجھے کال کر لینا،" اس نے کہا۔

ہم نے تہ دل سے دونوں کا شکریہ ادا کیا اور فوراً باہر چلے آئے۔ نیچے آ کر میں آفس کی کھڑی میں لٹکی کینیا تا کی بڑی سی تصویر کے سامنے رک گیا۔ اس کی اعتماد سے بھرپور چمکتی ہوئی آنکھیں؛ طاقت ور اور مضبوط ہاتھوں میں Kikuyu سردار والی لاٹھی پکڑی ہوئی۔ اوما بھی آئی اور میرے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

اس نے کہا: "سب کچھ یہاں سے شروع ہوتا ہے۔ بڑا آدمی۔ پھر اس کے اسسٹنٹ یا اہل خانہ، یا دوست یا قبیلہ۔ چاہے آپ فون یا ویزا یا نوکری چاہتے ہوں، یہی کچھ کرنا پڑتا ہے۔ آپ کے رشتے دار کون ہیں؟ آپ کسے جانتے ہیں؟ اگر آپ کسی کو نہیں جانتے تو بھول جائیں۔ بوڑھے کو یہ بات کبھی سمجھ نہیں آئی تھی۔ وہ یہ سوچ کر یہاں آیا تھا کہ تعلیم یافتہ ہونے اور درست لہجے میں انگلش بول سکنے کی وجہ سے ہر کوئی اسے اہمیت دے گا۔ وہ بھول گیا تھا یہاں ہر چیز کس کے اختیار میں ہے۔"

"وہ ہار گیا تھا،" میں نے آہستہ سے کہا۔

چودھواں باب

کینیائی خاندان

برنارڈ نے مین دس بجے گھنٹی بجائی۔ اس نے اڑے ہوئے رنگ والی نیلی شارٹس اور بہت چھوٹی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور اس کے ہاتھوں میں ایک نارنجی باسکٹ بال تھا۔

''تیار ہو؟'' اس نے پوچھا

''تقریباً، بس دومنٹ۔ میں جوتے پہن لوں۔''

وہ اپارٹمنٹ میں میرے پیچھے پیچھے آیا اور کہنے لگا، ''تم دوبارہ پڑھائی کرنے لگ گئے ہو، باری۔تمہاری گرل فرینڈ تو بور ہو جائے گی۔تم ہر وقت کتابوں میں کھوئے رہتے ہو۔''

میں نے بیٹھ کر تسمے باندھتے ہوئے جواب دیا، ''مجھے یہی سکھایا گیا ہے۔''

اس نے بال ہوا میں اچھالا۔'' مجھے کتابوں میں اتنی دلچسپی نہیں۔ میں عملی انسان ہوں۔ ریمبو کی طرح۔''

میں مسکرادیا اور دروازہ کھولتے ہوئے بولا، ''او کے، ریمبو! چلو دیکھتے ہیں کہ تم کورٹس میں کیا کارکردگی دکھاتے ہو۔''

''کورٹس کافی دور ہیں۔ کار کدھر ہے؟''

''اوما کار پہ دفتر گئی ہے۔ بہر حال اس نے بتایا کہ فاصلہ صرف ایک میل ہے۔ چلو اچھا ہے،ہم وارم اَپ ہو جائیں گے۔''

وہ نیم دلی سے میرے پیچھے ہولیا۔ کوئی چوتھائی میل چلنے کے بعد برنارڈ تھک کر بیٹھ گیا، اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے دکھائی دے رہے تھے۔

اس نے ہوا کے گھونٹ بھرتے ہوئے کہا، ''باری! میں وارم اَپ ہو گیا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں بھاگنے کے بجائے چلنا چاہیے۔''

پریکٹس کے دوران وہ مختلف سوالات کرتا رہا۔ ''تم نے میجک جانسن کو کھیلتے دیکھا ہے۔''

''صرف ٹیلی ویژن پر۔''

''امریکہ میں ہر شخص کے پاس کار اور ٹیلی فون ہے۔'' اس نے استفہامیہ انداز میں بیان دیا۔

''زیادہ تر کے پاس، سب کے پاس نہیں۔''

''میرے خیال میں وہاں حالات اچھے ہیں۔ شاید میں بھی امریکہ آ جاؤں۔ میں وہاں تمہیں کاروبار میں مدد دے سکتا ہوں۔''

''فی الحال میرا وہاں کوئی کاروبار نہیں۔ شاید لا سکول سے ڈگری لینے کے بعد.....''

''وہاں کام بہت آسانی سے مل جاتا ہوگا۔''

''ہر کسی کو نہیں۔ دراصل بہت سے لوگوں کو سٹیٹس میں خراب حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بالخصوص کالوں کو۔''

''لیکن یہاں جتنے برے حالات تو نہیں ہوں گے۔''

جب دھوپ زیادہ تیز ہوئی تو ہم یونیورسٹی سے چند بلاکس پرے واقع آئس کریم پارلر تک گئے۔ برنارڈ نے چاکلیٹ سنڈے کا آرڈر دیا اور منظم انداز میں کھانے لگا۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔

''اوما نے مجھے بتایا ہے کہ تم ٹریڈ سکول میں داخلہ لینے کا سوچ رہے ہو'' میں نے کہا۔

اس نے ہاں میں سر ہلایا، کسی جوش کے بغیر۔

''تمہیں کس قسم کے کورسز میں دلچسپی ہے؟''

''پتا نہیں۔'' اس نے چمچ آئس کریم کے اندر ڈالا اور لمحہ بھر سوچ کر بولا: ''غالباً آٹو مکینکس۔ ہاں..... میرے خیال میں آٹو مکینکس اچھا ہے۔''

''کیا تم نے اس قسم کے کسی پروگرام میں داخلہ لینے کی کوشش کی ہے؟''

''نہیں..... فیس دینا پڑتی ہے۔''

''برنارڈ! تم کتنے سال کے ہو گئے ہو؟''

"سترہ۔"

"سترہ سال کا ہو جانے کا مطلب سمجھتے ہو؟ اس کا مطلب ہے کہ تم اب ایک بالغ شخص ہو اور تم پر کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ اپنی اور گھر والوں کی ذمہ داریاں۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اب تمہیں فیصلہ کر لینا چاہیے کہ تمہیں کس چیز میں دلچسپی ہے۔ آٹو مکینکس یا کچھ اور۔ لیکن جو کچھ ہو، تمہیں کچھ مقصد طے کرنے ہوں گے اور انہیں حاصل کرنے کی جدوجہد کرنا ہو گی۔ اوما اور میں تمہیں سکول کی فیس میں مدد دے سکتے ہیں، لیکن ہم تمہاری خاطر تمہاری زندگی نہیں گزار سکتے۔ تمہیں خود بھی کوشش کرنا ہو گی، سمجھے؟"

برنارڈ نے ہاں میں سر ہلایا۔ "میں سمجھتا ہوں۔"

ہم دونوں کچھ دیر خاموشی سے بیٹھے رہے۔ برنارڈ مائع ہو چکی آئس کریم میں چمچ ہلا رہا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ میرے الفاظ اسے کس قدر کھوکھلے لگے ہوں گے۔ اس کی خطا بس یہ تھی کہ وہ دنیا کے اس طرف پیدا ہوا۔ غالباً وہ مجھ سے کوئی خفگی نہیں رکھتا تھا۔ فی الحال تو نہیں۔ لیکن وہ سوچتا تو ضرور ہو گا کہ میں اپنے اصول اس پر کیونکر لاگو کر سکتا تھا۔ وہ تو بس دوستی کی کچھ نشانیاں چاہتا تھا...... باب مارلے کی کیسٹیں، اور شاید میرے باسکٹ بال شوز۔ بس یہ چھوٹی چھوٹی توقعات۔ باقی میرا پیش کیا ہوا سب کچھ...... نصیحتیں، جھڑکیاں اور مستقبل کی منصوبہ بندی کی ہدایات...... اسے کمتر لگتی ہوں گی۔

میں نے پاؤں سے سگریٹ بجھایا اور کہا کہ اب ہمیں چلنا چاہیے۔ گلی میں پہنچے تو برنارڈ نے اپنا بازو میرے کندھے پہ رکھتے ہوئے کہا:

"بڑے بھائی کا پاس ہونا اچھا لگتا ہے۔" وہ خدا حافظ کہہ کر مجمعے میں غائب ہو گیا۔

خاندان کیا ہے؟ کیا یہ محض ایک جنیٹک کڑی ہے، والدین اور اولاد، میرے جیسے لوگ؟ یا کیا اس کی کوئی سماجی ہیئت ہے؟ یہ ایک معاشی اکائی ہے تاکہ بچوں کو پالا اور محنت کو بانٹا جا سکے؟ یا کیا یہ کوئی بالکل ہی اور چیز ہے: مثلاً مشترکہ یادوں کا ایک گودام؟ محبت کی سرحد؟ خلا کے آر پار جانے کا ایک راستہ؟

میں مختلف ممکنات کی فہرست بنا سکتا تھا۔ لیکن کبھی کسی قطعی جواب تک نہ پہنچ سکا۔ مجھے اچھی

طرح علم تھا کہ میرے حالات میں اس قسم کی کوئی کوشش لازماً ناکام ہو گی۔ اس کے بجائے میں نے اپنے گرد دائروں کا ایک سلسلہ بنایا جن کی حدود وقت گزرنے اور چہرے بدلنے کے ساتھ آگے پیچھے ہوتی رہیں، مگر ایک اختیار کا التباس قائم رہا۔ ایک اندرونی دائرہ جہاں محبت مستقل تھی اور دعوے بلا سوال۔ پھر ایک دوسرا حلقہ تھا، قابل مذاکرات محبت کی اقلیم، آزادانہ منتخب کردہ وعدے۔ اور پھر رفقائے کار، واقف کاروں کا ایک حلقہ؛ چہکتی ہوئی سفید بالوں والی خاتون جو شکاگو میں مجھے سودا سلف لا کر دیا کرتی تھی۔ انجام کار حلقہ وسیع ہو کر ساری قوم یا نسل یا مخصوص اخلاقی ضابطے کو سمیٹ لیتا۔

افریقہ میں آ کر میری یہ فلکیات ناکام ہو گئی۔ کیونکہ خاندان ہر کہیں نظر آتا تھا: دکانوں، پوسٹ آفس، گلیوں اور پارکوں میں۔ سب لوگ اوباما کے لمبے عرصے سے گمشدہ بیٹے کو دیکھتے۔ اگر میں نے کبھی بھول کر بھی ذکر کر دیا کہ مجھے ایک نوٹ بک یا شیونگ کریم چاہیے تو فوراً کوئی آنٹی اصرار کرتی کہ وہ مجھے نیروبی کے کسی دور دراز کونے میں لے جائے گی جہاں بہت اچھے داموں پر وہ چیز مل سکتی ہے۔

"آہ باری...... اپنے بھائی کے بیٹے کی مدد کرنے سے زیادہ اہم چیز اور کیا ہو سکتی ہے؟"

اگر کسی کزن کو پتا لگتا کہ اوما مجھے چھوڑ کر یونیورسٹی گئی ہوئی ہے تو وہ دو میل پیدل چل کر بھی مجھے کمپنی دینے کی خاطر اوما کے اپارٹمنٹ میں پہنچ جاتا۔

"آہ، باری! تم نے مجھے کال کیوں نہیں کی؟ آؤ، میں تمہیں اپنے کچھ دوستوں سے ملواتا ہوں۔"

اور شام کے وقت اوما اور میں چچاؤں کی جانب سے آنے والی غیر مختتم دعوتوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے۔ ہمیں بھوک نہ ہونے کے باوجود کھانا پڑ جاتا۔

"آہ، باری! کینیا میں ہم لوگوں کے پاس زیادہ کچھ تو نہیں، لیکن جب تک تم یہاں ہو، تمہیں ہمیشہ کھانے کو ملتا رہے گا!"

شروع میں تو میں نے یوں ردعمل دیا جیسے اپنی ماں کی چھاتی سے لگا کوئی بچہ دیا کرتا ہے...... سادہ اور بلا سوال تشکر کے ساتھ۔ یہ چیز افریقہ اور افریقیوں کے متعلق میرے تصور سے مطابقت رکھتی تھی...... امریکی زندگی کی بڑھتی ہوئی تنہائی سے واضح طور پر مختلف، ایسا فرق جسے میں نے نسلی

کے بجائے ثقافتی معنوں میں لیا۔ جو کچھ ہم نے ٹیکنالوجی اور تیزی کی خاطر قربان کر دیا تھا، یہاں جوں کا توں تھا: انسانی گرمائش کی مسرت اور دوسروں کی صحبت پر خوشی وغیرہ۔

اب میرے پاس ایک خاندان تھا۔ اب میرے اوپر کچھ ذمہ داریاں تھیں لیکن اس کا دوٹوک مطلب کیا تھا؟ وہاں یو ایس میں میں اس قسم کے احساسات کو سیاست، تنظیم سازی، ایک مخصوص تردید ذات میں منتقل کر دیا کرتا تھا۔ کینیا میں یہ حکمت عملی فضول معلوم ہوئی۔ سیاہ فاموں کو مقتدر بنانے کا عزم برنارڈ کو نوکری نہیں دلوا سکتا تھا۔ شراکتی جمہوریت پر یقین جین کو چادروں کا ایک نیا جوڑا خرید کر نہیں دے سکتا تھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے خود کو حقیقی معنوں میں دولت کے متعلق سوچتے ہوئے پایا میرے اپنے پاس دولت نہ ہونا، اس کی خاطر تگ و دو، اس کے ذریعے خریدی جا سکنے والی خام مگر نا قابل تردید راحت۔ میری ذات کے ایک حصے نے سوچا کہ کاش میرے پاس اتنی دولت ہوتی کہ اپنے رشتے داروں کی توقعات پر پورا اتر سکتا: کوئی امریکی بزنس مین، کارپوریٹ وکیل۔ لیکن یقیناً میں ان میں سے کچھ بھی نہیں تھا۔

نیروبی میں میرے پہلے ہفتے کے اختتام پر زیتونی مجھے پھپھو سارہ سے ملوانے لے گئی۔ اوما اب بھی ساتھ جانے کو تیار نہ تھی، مگر اس نے اپنے مکینک سے کہا کہ مجھے اس کے گھر تک لے جائے جو قریب ہی رہتا تھا۔

زیتونی میرے ساتھ تھی۔ ہم نے دروازے پر دستک دی تو ایک گہرے رنگ کی، متوسط عمر کی گٹھے ہوئے بدن والی عورت نمودار ہوئی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور Luo زبان میں کچھ کہا۔

زیتونی نے ترجمہ کیا،'' وہ کہہ رہی ہے کہ اپنے بھتیجے کے ساتھ اس قدر گھٹیا جگہ پر ملنا نہایت شرمناک لگ رہا ہے۔''

ہمیں ایک چھوٹے سے کمرے میں لیجایا گیا جہاں ایک بستر، ایک ڈریسر، دو کرسیاں اور ایک سلائی مشین رکھی تھی۔ میں اور زیتونی سارہ کے کمرے میں ایک ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ وہ عورت گئی اور دو گرم سوڈے لے کر واپس آئی۔ سارہ بستر کے کنارے پر بیٹھے بیٹھے آگے جھکی تاکہ میرے چہرے کا معائنہ کر سکے۔ اوما نے کہا تھا کہ سارہ کو تھوڑی بہت انگلش آتی تھی، لیکن اب وہ عموماً Luo ہی بولا کرتی تھی۔ زیتونی کے ترجمے کا فائدہ ہونے کے بغیر بھی وہ خوش نہ ہوتی۔

زیتونی نے کہا،'' وہ جاننا چاہتی ہے کہ تم نے اس سے ملنے کے لیے آنے میں اتنی تاخیر کیوں کر دی۔ وہ کہہ رہی ہے کہ وہ تمہارے دادا حسین اونیانگو کی اولاد میں سب سے بڑی ہے اور تمہیں چاہیے تھا کہ سب سے پہلے اس کے پاس آتے۔''

''اس سے کہو کہ میرا مقصد بے ادبی کرنا نہیں تھا۔ جب سے آیا ہوں سر کھجانے کی فرصت نہیں ملی۔ جلدی آنا بہت مشکل تھا۔'' میں نے کہا۔

سارہ کی آواز میں کچھ کرختگی پیدا ہوئی۔'' وہ کہہ رہی ہے کہ تم جن لوگوں کے پاس ٹھہرے ہو وہ تمہیں جھوٹ ہی بتا رہے ہوں گے۔''

''اس سے کہو کہ میں نے اس کے خلاف کچھ بھی نہیں سنا۔ اور بوڑھے کی جائیداد کے متعلق جھگڑوں کی وجہ سے اوما یہاں نہیں آ سکی۔''

ترجمہ سن کر سارہ پھنکاری اور اس کی آواز دیواروں سے ٹکرانے لگی۔ آخرکار جب تک وہ چپ ہوئی، زیتونی بھی خاموش رہی۔

''وہ کیا کہہ رہی ہے زیتونی؟''

زیتونی کی نگاہیں کچھ دیر سارہ کے چہرے پر ٹکی رہیں۔ پھر اس نے کہا،'' وہ کہتی ہے کہ مقدمے میں اس کی کوئی غلطی نہیں۔ یہ سب کیزیا...... اوما کی ماں کا کیا دھرا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ اوباما کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرنے والے بچے اس کے نہیں۔ انہوں نے اس کا سب کچھ چھین لیا اور اصل رشتے داروں کو بھکاریوں کی طرح جینے پر مجبور کر دیا۔''

سارہ نے سر ہلایا اور اس کی آنکھیں سلگنے لگیں۔ ایک دم وہ انگلش میں بولی:'' ہاں، باری۔ میں نے ہی بچپن میں تمہارے باپ کی پرورش کی تھی۔ میری ماں اکومو تمہارے باپ کی بھی ماں ہے۔ اکومو تمہاری دادی لگتی ہے۔ اکومو نے ہی تمہارے باپ کو جنم دیا...... تمہیں اس کی مدد کرنی چاہیے اور میں، تمہارے باپ کی بہن ہوں۔ دیکھو، میں کیسے زندگی گزار رہی ہوں۔ تم ان لوگوں کے بجائے ہماری مدد کیوں نہیں کرتے۔''

میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی زیتونی اور سارہ Luo زبان میں بحث کرنے لگیں۔ آخرکار، زیتونی کھڑی ہوئی اور اپنی سکرٹ ٹھیک کرتے ہوئے بولی:

''باری! اب ہمیں چلنا چاہیے۔''

میں کرسی سے اوپر اٹھنے لگا لیکن سارہ نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیے اور کچھ نرم آواز میں بولی:

''کیا تم مجھے کچھ دو گے؟ اپنی دادی کے لیے؟''

میں نے اپنا بٹوہ نکالا اور محسوس کیا کہ دونوں آنٹیوں کی نگاہیں مجھے نوٹ گنتے ہوئے دیکھ رہی تھیں..... شاید تیس ڈالر کے برابر شلنگ۔ میں نے وہ نوٹ سارہ کے ہاتھوں میں تھما دیے۔ اس نے رقم فوراً اپنے بلاؤز کے اندر ڈالی اور میرا ہاتھ دوبارہ پکڑ لیا۔

''باری، میرے پاس ہی رہو، تمہیں چاہیے کہ ان سے بھی ملو.....''

''باری، تم پھر بھی آ جانا۔ آؤ چلیں،'' زیتونی بولی۔

کوئی دس منٹ پیدل چلنے کے بعد ہی میں نے زیتونی سے پوچھا کہ وہ اور سارہ آپس میں کس بات پر لڑ رہی تھیں۔

''آہ، کچھ بھی نہیں، باری! بیوہ بوڑھی عورتوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔'' زیتونی مسکرائی مگر اس کے چہرے پر تناؤ کی کیفیت صاف دکھائی دے رہی تھی۔

''بتاؤ نا آنٹی۔ مجھے سچ سچ بتاؤ۔''

زیتونی نے انکار میں سر ہلایا۔ ''میں سچائی نہیں جانتی۔ کم از کم پورا سچ تو نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ سارہ جوان ہونے کے بعد بھی ہمیشہ اپنی اصل ماں اکومو کے پاس رہی۔ بارک صرف میری ماں کی پروا کرتا تھا جس نے اکومو کے جانے کے بعد ان سب کو پالا۔''

''اکومو چھوڑ کر کیوں گئی؟''

''یقین سے تو کچھ نہیں کہہ سکتی۔ تم اس بارے میں دادی سے پوچھ لینا۔''

زیتونی نے اشارے سے بتایا کہ ہمیں سڑک پار کرنی ہے اور بات دوبارہ وہیں سے شروع کر دی۔ ''تمہیں معلوم ہے، تمہارا باپ اور سارہ اصل میں بالکل ایک جیسے تھے حالانکہ ان کی پرورش ساتھ ساتھ بھی نہیں ہوئی۔ سارہ بھی اس کی طرح ہوشیار اور خودمختار تھی۔ جب ہم بچے تھے تو وہ اس سے کہا کرتی تھی کہ وہ تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہے تا کہ کسی مرد پر انحصار نہ کرنا پڑے۔ یہی وجہ ہے کہ

اس نے یکے بعد دیگرے چار شادیاں کیں۔ کوئی بھی شادی نہ چل سکی۔ پہلا شوہر مر گیا لیکن باقی کے شوہروں کو اس نے چھوڑ دیا کیونکہ وہ بہت کاہل تھے یا اس کے ساتھ غلط سلوک کیا کرتے تھے۔ اس معاملے میں میں اس کی معترف ہوں۔ لیکن سارہ کو اپنی خودمختاری کی قیمت بھی ادا کرنا پڑی ہے۔''

زیتونی نے ہاتھ کی پشت سے پیشانی پر چمکتا ہوا پسینہ پونچھا۔ ''سارہ نے پہلے شوہر کی وفات کے بعد فیصلہ کیا کہ تمہارے باپ کو اس کی اور اس کے بچے کی کفالت کرنی چاہیے کیونکہ ساری تعلیم اسی نے حاصل کی تھی۔ اسی لیے وہ کیزیا اور اس کے بچوں کو ناپسند کرتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ کیزیا محض ایک خوب صورت لڑکی ہے اور ہر چیز ہڑپ کرنا چاہتی ہے۔ باری، تمہیں سمجھنا چاہیے...... Luo دستور کے مطابق سب کچھ نرینہ اولاد کو ملتا ہے۔ سارہ کو خوف تھا کہ اس کا باپ اور تمہارا دادا مر گیا تو سب کچھ بارک اور اس کی بیویوں کا ہو جائے گا اور اسے کچھ بھی نہیں ملے گا۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ بوڑھے کے بچوں کے بارے میں جھوٹ بولا جائے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن.....''

''لیکن کیا؟''

زیتونی چلتے چلتے رک گئی اور میری جانب منہ کر کے بولی: ''جب تمہارا باپ اس امریکی بیوی روتھ کے ساتھ رہنے چلا گیا تو کبھی کبھی کیزیا کے پاس آیا کرتا تھا۔ تمہیں پتا ہونا چاہیے کہ روایتی لحاظ سے وہ بدستور اس کی بیوی تھی۔ اس قسم کے ایک دورے کے دوران کیزیا ابو سے حاملہ ہوئی، تمہارا بھائی جس سے تم ابھی تک نہیں ملے۔ بات یہ تھی کہ کیزیا اس دوران کچھ عرصہ ایک اور آدمی کے ساتھ بھی رہی۔ چنانچہ جب اس کے پیٹ میں برنارڈ تھا تو کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کا......''

زیتونی کہتے کہتے رک گئی اور تخیل کو بات مکمل کرنے دی۔

''کیا برنارڈ کو اس بات کا علم ہے؟''

''ہاں، اب اسے معلوم ہو گیا ہے۔ جانتے ہو، تمہارے باپ کو اس قسم کی باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ ان سب کو اپنی اولاد ہی کہتا تھا۔ اس نے اس دوسرے آدمی کو نکالا اور جب بھی

ممکن ہوتا کیزیا کو بچوں کے لیے پیسے دیتا۔لیکن جب وہ مرگیا تو اس بات کا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ آیا اس نے سب بچوں کو اپنا قبول کر لیا تھا۔''

''اب تم نے جان لیا کہ تمہارے باپ نے کیا دکھ جھیلا۔''

''کیا؟'' میں نے پوری آنکھیں کھول کر اوپر دیکھا۔ آنٹی مجھے گھور رہی تھی۔

''ہاں، باری، تمہارے باپ نے دکھ جھیلا۔ میں تمہیں بتاتی ہوں، اس کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ بہت بڑے دل کا مالک تھا۔ جب وہ زندہ تھا تو جو بھی مانگنے آتے اسے خالی ہاتھ واپس نہ جانے دیتا۔ اوران سبھی نے اس سے مانگا۔ تمہیں معلوم ہے، وہ پورے ضلعے میں پہلا شخص تھا جو باہر تعلیم حاصل کرنے گیا۔ چنانچہ وہ اس سے ہر قسم کی توقع رکھتے تھے۔ آہ، باری! اب تم ایک بڑی شخصیت بن گئے ہو۔ تمہیں چاہیے کہ مجھے کچھ دو۔ تمہیں میری مدد کرنی چاہیے۔' خاندان والوں کی طرف سے ہمیشہ یہ دباؤ رہتا۔ اور وہ ناں نہیں کہہ سکتا تھا، وہ فراخ دل تھا۔ جب میں حاملہ تھی تو تب بھی میں نے اس کا خیال رکھا۔ وہ میرے حوالے سے بہت مایوس تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں کالج جاؤں۔ لیکن میں نے اس کی بات نہ سنی اور اپنے شوہر کے ساتھ چلی گئی۔ اس سب کے باوجود جب شوہر نے میرے ساتھ غلط سلوک کیا اور میں بالکل خالی ہاتھ گھر چھوڑنے پر مجبور ہوگئی تو جانتے ہو کس نے مجھے اپنے پاس رکھا؟ ہاں ...... یہ وہی تھا۔ اسی لیے، دوسرے چاہے کچھ بھی کہتے رہیں، میں ہمیشہ اس کی شکر گذار رہوں گی۔''

ہم گیراج کے قریب پہنچنے والے تھے اور اوما مکینک کے ساتھ گفتگو کرتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے قریب ہی ایک ننگا لڑکا، کوئی تین سال کا، گھوم رہا تھا۔ زیتونی پھر رک گئی۔

اس نے کہا، ''جب تمہارے باپ کی قسمت نے پلٹا کھایا تو جن کی اس نے مدد کی تھی اسے بھول گئے۔ وہ اس پر دانت نکالتے۔ حتیٰ کہ خاندان والوں نے اسے اپنے گھر میں رکھنے سے انکار کر دیا۔ ہاں، باری! انکار کر دیا! وہ بارک کو خطرات سے آگاہ کرتے رہتے۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ چیز اسے دکھ دیتی تھی، لیکن اس نے کسی کو الزام نہ دیا۔ تمہارا باپ کبھی بھی بغض نہیں رکھتا تھا۔ درحقیقت، جب اس کی حالت بحال ہوئی اور وہ دوبارہ کچھ کرنے کے قابل ہوا تو مجھے پتا چلا کہ وہ خود کو دھتکارنے والے کچھ لوگوں کی بھی مدد کر رہا تھا۔ آہ، میں اس چیز کو سمجھ نہ پائی۔ میں نے اس

سے کہا، 'بارک! تمہیں صرف اپنی اور اپنی بچوں کی فکر کرنی چاہیے، ان لوگوں نے تمہارے ساتھ بہت برا سلوک کیا تھا۔ وہ کاہل پن کی وجہ سے خود کچھ نہیں کرتے۔' اور جانتے ہو، اس نے مجھے کیا جواب دیا؟ وہ کہنے لگا: 'تم کیسے جانتی ہو کہ فلاں شخص کو اس چیز کی مجھ سے زیادہ ضرورت نہیں؟'''

آنٹی مڑی اور زبردستی چہرے پہ مسکراہٹ سجا کر اوما کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ جب ہم آگے بڑھے تو اس نے مزید کہا، ''میں تمہیں یہ سب اس لیے بتا رہی ہوں تا کہ تمہیں پتا چلے کہ تمہارے باپ نے اس جگہ پر کتنا کچھ سہا ہے۔ سو تم اس کے بارے میں کچھ برا مت سوچو اور تمہیں اس کی زندگی سے سیکھنا چاہیے۔ اگر تمہارے پاس کوئی چیز ہے تو ہر کوئی اس میں سے حصہ لینا چاہے گا۔ لہٰذا تمہیں کہیں نہ کہیں حد قائم کرنا پڑے گی۔ اگر ہر کوئی خاندان ہے تو کوئی بھی خاندان نہیں۔ میرے خیال میں تمہارے باپ کو یہ بات کبھی سمجھ نہیں آئی تھی۔''

پندرھواں باب

آبائی گاؤں میں

شام ساڑھے پانچ بجے ہماری ٹرین پرانے نیروبی ریلوے سٹیشن سے کیسوموکی جانب روانہ ہوئی۔ جین نے ساتھ نہ جانے کا فیصلہ کیا تھا کیونکہ باقی کے اہل خانہ جارہے تھے..... کیزیا، زیتونی اور اوما ایک پارٹمنٹ میں؛ رائے، برنارڈ اور میں ساتھ والے میں۔ جب ہر کوئی اپنا اپنا سامان چڑھانے میں لگا ہوا تھا تو میں نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر پیچھے بل کھاتی ہوئی ریلوے لائن کو دیکھا۔ اسی ریلوے نے کینیا میں نوآبادیاتی تاریخ کا دور شروع کیا تھا۔

اوما نے کہا، ''کیسومو پہنچنے میں ساری رات لگ جائے گی۔ ہم وہاں سے ایک بس یا مٹاٹو (matatu) لیں گے اور مزید پانچ گھنٹے لگ جائیں گے شاید۔''

پھر وہ رائے کی کسی بات پر مسکرائی اور پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور ٹرین کی چھک چھک سننے لگی۔ ''یہ ٹرین بہت سی یادیں واپس لے آئی ہے۔ تمہیں یاد ہے رائے، ہم گھر جانے کا کتنی بے چینی سے انتظار کرتے رہتے تھے؟ بارک! وہ بہت خوب صورت ہے! نیروبی جیسا بالکل نہیں۔ اور دادی..... وہ بہت مزے کی ہے! اوہ، بارک! تمہیں وہ بہت اچھی لگے گی۔ اس کی حس مزاح بہت اچھی ہے۔''

''اس میں حس مزاح اچھی ہونی ہی چاہیے تھی، ڈراؤنے (Terror) کے ساتھ اتنا لمبا عرصہ گزارنے کے لیے،'' رائے بولا۔

''یہ ڈراؤنا کون ہے؟''

''ہم اپنے دادا کو ڈراؤنا ہی کہا کرتے تھے۔ کیونکہ وہ بہت خراب تھا،'' اوما نے بتایا۔

رائے نے اپنا سر ہلایا اور مسکرادیا۔

اوما نے رائے دی، ''بارک! کیا تم تصور کرسکتے ہو کہ میرے خیال میں خاندان کے سارے مسئلے دادا سے ہی شروع ہوئے۔ وہ واحد شخص تھا جس کی بات پر بوڑھا بھی پریشان ہوجایا کرتا تھا۔ اسے بس صرف اس شخص کا خوف تھا۔''

تھوڑی دیر باتیں کرنے اور کھانا کھانے کے بعد میں سو گیا۔

ہم دن چڑھے کیسومو پہنچنے اور نصف میل پیدل چل کر بس ڈپو تک گئے۔ وہاں بہت رش تھا اور matatu ہارن بجارہی تھیں۔ ہمیں ایک پرانی سی اور بدحال گاڑی ملی جو ہماری منزل کی طرف جارہی تھی۔ اوما اندر گئی اور منہ بنا کر واپس اتر آئی۔

''سیٹیں نہیں ہیں،'' اس نے کہا۔

رائے نے کہا، ''پریشان مت ہو۔ یہ افریقہ ہے، اوما..... یورپ نہیں۔'' ہمارے بیگ بس کی چھت پر رکھے جارہے تھے۔ رائے میری جانب مڑا اور کرایہ جمع کرتے ہوئے نوجوان سے کہنے لگا، ''بھائی، تم ہمیں سیٹیں لے دو گے؟''

اس آدمی نے ہاں میں سر ہلایا۔ ''کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ بس فرسٹ کلاس ہے۔''

ایک گھنٹے بعد اوما ایک ٹوکری اور کسی کی بچی اٹھائے ہوئے میری گود میں بیٹھی تھی۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ تھرڈ کلاس کا کیا حال ہوگا،'' میں نے کہا۔

اوما نے کسی اجنبی کی کہنی اپنے چہرے سے پرے ہٹاتے ہوئے جواب دیا، ''بس پہلا جھٹکا لگنے کی دیر ہے، سارے مذاق بھول جاؤ گے۔''

خوش قسمتی سے ہائی وے زیادہ خراب نہیں تھی۔ اردگرد کے زمینی مناظر خشکی جھاڑیوں اور نیچی پہاڑیوں پر مشتمل تھے۔ ہم Ndori میں اترے اور دو گھنٹے تک کچھ کھاتے پیتے یا ادھر اُدھر پھرتے رہے۔ آخر کار ایک مٹاٹو آتی دکھائی دی۔ شمال کی طرف جاتی ہوئی سڑک گرد کے غبار سے بھر گئی۔

ہم اس میں سوار ہوئے اور پہاڑی راستے پر روانہ ہوگئے۔ تب سڑک چوڑی ہوئی اور انجام کار ایک صاف میدان میں پہنچ کر ختم ہوگئی۔ دونو جوان وہاں درخت کے سائے میں بیٹھے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی ان کے چہروں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ رائے نیچے کودا اور دونوں سے گلے ملا۔

''بارک! یہ ہمارے چچا ہیں۔ یہ یوسف ہے اور یہ ہمارے باپ کا سب سے چھوٹا بھائی سعید'' رائے چہکا۔

''آہا، ہم نے اس کے بارے میں تو بہت سی عظیم باتیں سن رکھی ہیں۔ ویلکم باری، ویلکم۔ آؤ، اپنا سامان مجھے دے دو۔'' نسبتاً بڑے قد اور مونڈے ہوئے چہرے والے سعید نے کہا۔

ہم یوسف اور سعید کے پیچھے ایک پگڈنڈی پر چلتے ہوئے ایک بلند باڑ کے پار گئے اور بہت بڑے صحن میں داخل ہوئے۔ صحن کے وسط میں ایک مستطیل شکل کا گھر تھا جس کے اوپر لوہ کی چھت اور کنکریٹ کی دیواریں تھیں۔ بوگن ویلیا، سرخ اور پیلے اور گلابی پھول، بڑے سے تالاب کے ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔

ایک بڑی سی عورت سکارف سے ہاتھ پونچھتی ہوئی باہر آئی ''آہ اوباما!'' اس کا چہرہ سعید جیسا اور آنکھیں چمکدار، مسکراتی ہوئی تھیں۔ اس نے اوما اور رائے کو یوں گلے لگایا جیسے انہیں زمین پہ گرا دینا چاہتی ہو۔ پھر وہ میری طرف پلٹی اور میرا ہاتھ پکڑ کر زوردار مصافحہ کیا۔

''ہالو!'' اس نے انگلش بولنے کی کوشش کی۔

''موساوا!'' میں نے Luo زبان میں جواب دیا۔

وہ ہنس پڑی اور اوما سے کچھ بولی۔

''وہ کہہ رہی ہے کہ وہ اس دن کا خواب دیکھا کرتی تھی، جب وہ اپنے پوتے سے ملے گی۔ وہ کہہ رہی ہے کہ تمہارا آنا اس کے لیے بہت خوشی کا باعث ہے اور آخر تم گھر آ ہی گئے ہو۔''

دادی نے سر ہلایا اور گھر کے اندر جانے سے قبل مجھے کھینچ کر سینے سے لگایا۔ چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں سے دوپہر کی تھوڑی سی دھوپ اندر آرہی تھی۔ گھر میں کہیں کہیں فرنیچر پڑا تھا...... لکڑی کی چند کرسیاں، ایک کافی ٹیبل، ایک پرانا دیوان۔ دیواروں پر مختلف چیزیں آویزاں تھیں: بوڑھے کا ہارورڈ ڈپلومہ؛ اس کی اور پچیس برس قبل امریکہ جانے والے چچا عمر کی تصویر؛ ان کے علاوہ دو زیادہ پرانی، زردی مائل تصویریں بھی تھیں؛ غضب ناک آنکھوں والی ایک دراز قد جوان عورت، گود میں چھوٹا سا گول مٹول بچہ، پہلو میں کھڑی ہوئی ایک لڑکی؛ دوسری میں ایک زیادہ عمر کا آدمی کھڑا تھا۔ اس آدمی نے کلف لگی شرٹ اور ایک کنگال پہن رکھا تھا؛ اس کی ٹانگیں کسی انگریز کی طرح کراس کی صورت میں تھیں، لیکن گود میں ایک قسم کا عصا نظر آیا جس کی ہتھی کھال میں لپٹی

ہوئی تھی۔ رخسار کی ابھری ہوئی ہڈیاں اور چھوٹی آنکھیں اس کے چہرے کو ایک مشرقی انداز دے رہی تھیں۔ اوما میرے قریب آکر بولی:

''یہ ہے وہ۔ ہمارا دادا۔ تصویر میں نظر آرہی عورت ہماری دادی اکومو ہے۔ لڑکی سارہ ہے۔ اور بچہ، وہ بوڑھا ہے۔''

میں کچھ دیر تصویروں کو غور سے دیکھتا رہا، پھر نوٹ کیا اور آخری تصویر میں گھنے کالے بالوں اور ہلکی سی خوابناک مسکان والی عورت نظر آئی۔ میں نے پوچھا کہ یہ کون ہے۔ دادی نے Luo زبان میں کچھ کہا جس کا ترجمہ اوما نے بتایا۔

''وہ کہہ رہی ہے کہ یہ ہمارے دادا کی ایک بیوی کی تصویر ہے۔ اس نے لوگوں کو بتایا کہ برما میں جنگ لڑنے کے دوران اس نے اس سے شادی کی تھی۔''

رائے ہنسا ''وہ زیادہ بری نہیں لگتی۔ ہے نا بارک؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ میری ماں جیسی لگتی تھی۔

ہم لونگ روم میں بیٹھ گئے اور دادی نے چائے بنالی۔ اس نے بتایا [illegible] مویشی پال رہے تھے، اگرچہ اس نے کچھ زمین رشتے داروں کو دے دی تھی۔ لہٰذا یوسف ہماری زمین خود کاشت نہیں کرسکتا تھا۔ آمدنی میں کمی پوری کرنے کی خاطر قریبی سکول کے بچوں کو چیزیں بیچتی اور جب کبھی فالتو رقم ہوتی تو کیسومو سے چیزیں خرید کر مقامی مارکیٹ میں لایا کرتی تھی۔ اس کا واحد حقیقی مسئلہ گھر کی چھت تھی...... اس نے چھت میں آتی ہوئی روشنی کی طرف اشارہ کیا اور بتایا کہ اپنے بیٹے عمر کی اسے ایک سال سے کوئی اطلاع نہیں آئی۔

سامان کھولنے کے بعد رائے نے مجھے اشارے سے اپنے پیچھے صحن میں آنے کو کہا۔ ایک گندم کے کھیت کے کنارے پر، آم کے پیڑ تلے میں نے سیمنٹ کی دو مستطیل ابھری ہوئی قبریں دیکھیں۔ ایک قبر کے تعویذ پر کھدا ہوا تھا: حسین اونیا گو اوباما، پیدائش 1895ء، وفات 1979ء۔ دوسری قبر پر پیلے رنگ کی باتھ روم ٹائلز لگی تھیں۔ تعویذ پر تختی کی جگہ خالی تھی۔ رائے نے جھک کر چیونٹیوں کی قطار کو ہاتھ سے ہٹایا اور کہنے لگا:

''چھ سال ہوگئے اور آج بھی کوئی نہیں بتا سکتا کہ یہاں کون دفن ہے۔ سنو بارک! جب میں مرجاؤں تو میری قبر پہ نام ضرور لکھوانا۔'' اس نے اپنا سر ہلایا اور واپس گھر کی طرف چلا گیا۔

میں اس روز کے اپنے جذبات کیسے بیان کروں؟ ہر لمحہ میرے ذہن میں باری باری ابھرتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ دوپہر والی منڈی میں اوما اور میں دادی کے ہمراہ گئے تھے؛ مجھے مکئی کے پتوں کی چرمراہٹ، اپنے چچاؤں کے چہرے پر توجہ کے آثار، زمین کی مغربی حد بندی کرنے کے لیے کھدائی کرتے وقت اپنے پسینے کی مہک، سب یاد ہے۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ دوپہر کے وقت ایک لڑکا گوڈفرے ہمارے صحن میں آیا۔ اوما نے بتایا کہ وہ دادی کے ساتھ رہتا تھا کیونکہ اس کے اپنے گاؤں کے قریب کوئی سکول نہیں تھا۔

ان لمحات میں مجھے محض خوشی ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بجائے ہر کام، ہر لمس، ہر سانس اور ہر لفظ میں اپنی ساری زندگی کا وزن محسوس ہونے کا احساس تھا۔ البتہ ایک دوپہر کو اس موڈ میں رخنہ پیدا ہوا جب مارکیٹ سے واپس آتے ہوئے اوما ہمارے آگے آگے بھاگتی ہوئی کیمرہ لینے گئی۔ میں اور دادی اکیلے رہ گئے۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد دادی نے میری جانب دیکھا اور مسکرا کر ''ہالو!'' کہا۔ میں نے ''مساوا!'' کہا اور اس کے ساتھ ہی ہمارا باہمی ذخیرۂ الفاظ ختم ہو گیا۔ ہم آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ آخر اوما کیمرہ لے کر واپس آ گئی۔ تب دادی نے اس سے کچھ کہا اور مجھے لگا کہ وہ اپنے پوتے سے بات نہ کر سکنے پر دکھی ہو گی۔

''اس سے کہو کہ میں Luo زبان سیکھنا پسند کروں گا، لیکن سٹیٹس میں اس کام کے لیے وقت نکالنا بہت مشکل ہے۔ اسے بتاؤ کہ میں کتنا مصروف ہوتا ہوں۔''

''وہ اس بات کو سمجھتی ہے۔ لیکن اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ انسان کو کبھی اتنا مصروف نہیں ہونا چاہیے کہ اپنے لوگوں کے لیے بھی وقت نہ نکال سکے۔''

میں نے دادی کی جانب دیکھا اور اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ تب مجھے پتا چلا کہ اس وقت محسوس ہو رہی مسرت ہمیشہ نہیں رہے گی اور یہ چیز بھی حلقے کا حصہ تھی: یہ امر کہ میری زندگی ایک جگہ رکی ہوئی نہیں، اور یہ کہ اس ملاقاتی دورے کے بعد بھی بدستور مشکل انتخاب کرنے پڑیں گے۔

رات بہت جلد ہو گئی اور ہوا کے جھونکے آنے لگے۔ برنارڈ، رائے اور میں تالاب کی طرف گئے اور کھلی فضا میں نہائے۔ گھر واپس آنے پر کھانا لگا ہوا تھا اور ہم نے جی بھر کر کھایا۔ کھانے کے بعد رائے یہ کہہ کر چلا گیا کہ اسے کسی سے ملنا ہے۔ یوسف اپنی جھونپڑی میں گیا اور ایک پرانا

ٹرانزسٹر ریڈیو لے کر آیا جو دادا کا ہوا کرتا تھا۔ اس نے بی بی سی کا خبرنامہ لگایا۔ آوازیں کسی اور دنیا سے آتی ہوئی لگ رہی تھیں۔

تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد دیے کی لو نیچی ہو گئی اور سب اپنے اپنے بستر میں کھسکنے لگے۔ دادی کمبل اور دو چارپائیاں لائی۔ ہم لیٹ گئے تو اس نے دیا بجھایا۔ تھکن کے باعث میرا جسم درد کر رہا تھا۔ دادی کے بیڈروم سے اس کی اور اوما کی باتوں کی مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ رائے کہاں گیا تھا۔ پھر مجھے بوڑھے کی قبر پر لگی پیلی ٹائلز کا خیال آیا۔

برنارڈ نے سرگوشی کی: باری! کیا تم جاگ رہے ہو؟''

''ہاں۔''

کیا چیز تمہیں گھر کی طرف کھینچ لائی ہے؟''

''برنارڈ! یقین سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بس لگا کہ مجھے یہاں آنا چاہیے۔''

برنارڈ نے جواب دیے بغیر کروٹ بدل لی۔ لمحہ بھر بعد ہی مجھے اس کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز آئی۔ میں اندھیرے میں گھورتے ہوئے رائے کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

صبح کے وقت سعید اور یوسف نے کہا کہ اوما اور میں ان کے ساتھ زمینوں پر چلیں۔ جب ہم صحن پار کر کے مکئی اور جوار کے کھیتوں میں چلنے لگے تو یوسف مڑا اور مجھ سے کہنے لگا ''میں تمہیں بہت قدیم قسم کا انسان لگتا ہوں گا، امریکہ میں فارمرز کے مقابلے میں۔''

میں نے اسے بتایا کہ میں کاشت کاری کے متعلق زیادہ نہیں جانتا، مگر جہاں تک مجھے پتا ہے زمین بہت زرخیز تھی۔

یوسف نے تائید کی۔ ''زمین بہت اچھی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ یہاں کے لوگ ان پڑھ ہیں۔ انہیں ترقی کے متعلق زیادہ سمجھ بوجھ نہیں۔ موزوں زرعی طریقے وغیرہ کچھ بھی نہیں جانتے۔ میں انہیں بتانے کی کوشش کرتا ہوں تو وہ سنتے ہی نہیں۔ اس لحاظ سے Luo لوگ بہت ضدی ہیں۔''

میں نے دیکھا کہ سعید اپنے بھائی کو قہر آلود نظروں سے دیکھ رہا تھا، لیکن کچھ نہ بولا۔ چند منٹ بعد ہم ایک چھوٹے سے نالے پر پہنچے۔ سعید نے اونچی آواز میں ہمیں خبردار کیا۔ دوسرے کنارے پر دو جوان لڑکیاں کھڑی تھیں، ان کے گیلے بال سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ وہ شرما کر

جھاڑیوں کے پیچھے ہو گئیں اور سعید نے پانی کے ساتھ ساتھ لگی باڑ کی جانب اشارہ کر کے کہا:

''یہاں ہماری زمین ختم ہوتی ہے۔ پہلے، جب میرا باپ زندہ تھا تو کھیت کہیں زیادہ بڑے تھے لیکن جیسا کہ ماں نے بتایا، اب بہت سی زمین دوسروں کو دے دی ہے۔''

یوسف نے اس جگہ سے واپس جانے کا فیصلہ کیا، لیکن سعید مجھے اور اوما کو کچھ آگے تک لے گیا۔ وہاں ایک جھونپڑی کے سامنے درمیانی عمر کی عورت بیٹھی غلہ چھان رہی تھی۔ اس کا سارا لباس سرخ تھا۔ اس نے کام چھوڑ کر ہم سے ہاتھ ملایا اور بتانے لگی کہ وہ میرے باپ کو یاد کرتی ہے...... وہ بچپن میں اکٹھے بکریاں چرایا کرتے تھے۔ جب اوما نے پوچھا کہ زندگی کیسی چل رہی ہے تو اس نے نفی میں سر ہلایا اور مدھم آواز میں بولی:

''حالات بدل گئے ہیں۔ جوان آدمی شہر کو چلے گئے۔ صرف بوڑھے، عورتیں اور بچے رہ گئے ہیں۔ ہماری تمام دولت ختم ہو گئی۔'' جب وہ بول رہی تھی تو ایک بوڑھا آدمی سائیکل پر آیا۔ اس کی سانس سے شراب کی بو آ رہی تھی۔ ان لوگوں نے کہا کہ کیا ہم انہیں کچھ دے سکتے ہیں۔ اوما نے دونوں کے ہاتھ میں کچھ شلنگ رکھ دیے اور ہم وہاں سے واپس روانہ ہوئے۔

کچھ دور پہنچ کر اوما نے پوچھا، ''سعید، یہاں کیا ہوا ہے؟ پہلے تو کبھی اس طرح بھیک نہیں مانگی جاتی تھی؟''

''تم ٹھیک کہتی ہو۔ میرے خیال میں انہوں نے یہ چیز شہر والوں سے سیکھی ہے۔ لوگ کیسومو یا نیروبی سے واپس آتے اور انہیں بتاتے ہیں کہ تم غریب ہو۔ سو اب یہاں غربت کا یہ تصور پایا جاتا ہے۔ پہلے ایسے نہیں سوچا جاتا تھا۔ میری ماں کو دیکھو۔ ہم کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگتے۔ وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہے۔ اسے زیادہ پیسے نہیں ملتے، مگر مل ضرور جاتے ہیں۔ وہ اس چیز پر فخر کرتی ہے۔ ہر کوئی ایسے ہی کر سکتا ہے، لیکن یہاں بہت سے لوگ ہمت ہار دیتے ہیں۔''

جب ہم واپس پہنچے تو دادی اور رائے گھر سے باہر بیٹھے ایک بھاری سوٹ میں ملبوس آدمی سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ آدمی قریبی سکول کا پرنسپل تھا۔ میں نے دیکھا کہ رائے نے اپنا تھیلا باندھا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔

''کینڈو بے کی طرف۔ پرنسپل صاحب اسی طرف جا رہے تھے، سو میں، برنارڈ اور ماں بھی

ان کے ساتھ ہی جانے کو تیار ہو گئے تا کہ ایبو کو ساتھ لے آئیں۔ تم بھی چلو اور وہاں خاندان والوں سے مل لینا۔''

اوما نے دادی کے پاس ہی رہنے کا فیصلہ کیا، لیکن سعید اور میں اپنے کپڑے سمیٹ کر پرنسپل صاحب کی پرانی jalopy میں بیٹھ گئے۔ مرکزی شاہراہ سے دو گھنٹے لگ گئے؛ مغرب میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد وکٹوریہ جھیل دکھائی پڑ جاتی۔ کینڈو پہنچ کر ہم نے پرنسپل کا شکریہ ادا کیا اور مٹاٹو پہ سوار ہو کر گلیوں کی بھول بھلیوں میں روانہ ہو گئے۔ ایک مرتبہ پھر ہر طرف کھیت اور چراگاہیں تھیں۔ ایک موڑ پر کیزیا نے ہمیں مٹاٹو سے اترنے کا اشارہ کیا۔ تب ہم دریا کے کنارے چلتی ہوئی ایک گلی میں داخل ہوئے۔ عورتیں پتھروں پر کپڑے دھوتی ہوئی نظر آئیں۔ کیزیا ایک جگہ پر رکی اور پتھروں کے ایک ڈھیر کی جانب اشارہ کر کے کچھ بولی۔

''یہ اوباما کی قبر ہے۔ ہمارا پردادا۔ آس پاس کی ساری زمین K'Obama یعنی اوباما کی زمین کہلاتی ہے۔ ہم Jok'Obama ہیں، یعنی اوباما کے لوگ۔ ہمارے لکڑ دادا کی پرورش ایلیگو میں ہوئی تھی، لیکن وہ جوانی میں ہی یہاں آ گیا۔ اوباما یہیں آباد ہوئے اور ان کے بچے بھی یہاں پیدا ہوئے،'' رائے نے وضاحت کی۔

''تو ہمارا دادا واپس ایلیگو کیوں گیا تھا؟''

رائے کیزیا کی جانب مڑا جس نے اپنا سر ہلایا۔ رائے نے کہا، ''یہ سوال دادی سے پوچھنا۔ میری ماں کا خیال ہے کہ شاید اس کی اپنے بھائیوں سے نہیں بنتی تھی۔ درحقیقت اس کا ایک بھائی اب بھی یہاں رہتا ہے۔ وہ کافی بوڑھا ہو گیا ہے لیکن شاید تم اس سے مل سکتے ہو۔''

ہم ایک چھوٹی سی لکڑی کی جھونپڑی کے سامنے پہنچے جہاں ایک دراز قد خوب صورت عورت صحن میں جھاڑو دے رہی تھی۔ اس کے پیچھے ایک جوان آدمی پورچ میں بیٹھا تھا۔ عورت نے آنکھوں پہ ہاتھ سے سایہ کیا اور ہاتھ ہلانے لگی۔ آدمی ہمارے جانب آنے لگا۔ رائے نے آگے بڑھ کر عورت سے ہاتھ ملایا جس کا نام سیلینا تھا۔

''آہ، تو تم لوگ آ ہی گئے۔'' ایبو ہم میں سے ہر ایک کو باری باری گلے ملتے ہوئے بولا'' میں نے کافی عرصہ پہلے سنا تھا کہ تم باری کے ساتھ آ رہے ہو!''

''ہاں، تمہیں تو حالات کا پتا ہی ہے۔ ہمیں انتظامات کرنے میں کچھ عرصہ لگ گیا،'' رائے نے کہا۔

''مجھے تمہارے آنے کی بہت خوشی ہے۔ مجھے واپس نیروبی جانا پڑ رہا ہے۔''

کیوں، یہاں ٹھیک نہیں ہے؟''

''یہاں کافی بوریت ہے۔ تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ نہ ٹیلی ویژن، نہ کلب۔ میرے خیال میں یہ دیہاتی لوگ بہت سست ہیں۔ اگر بلی نہ آیا ہوتا تو میں یقیناً دیوانہ ہو جاتا۔''

''بلی آیا ہوا ہے؟''

''ہاں، وہ یہیں کہیں ہوگا....'' ابو نے ہاتھ ہلایا اور پھر میری طرف دیکھ کر مسکرایا: ''سو، باری! تم میرے لیے امریکہ سے کیا لائے ہو؟''

میں نے بیگ میں ہاتھ ڈالا اور پورٹیبل کیسٹ پلیئر نکالا جو میں نے اس کے اور برنارڈ کے لیے خریدا تھا۔ اس نے کیسٹ پلیئر الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر کچھ مایوس ہو کر بولا:

یہ سونی کا تو نہیں ہے نا؟'' پھر اس نے اوپر دیکھا اور کچھ سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے میری پشت پر ہاتھ مارا: ''ٹھیک ہے باری! شکریہ، بہت بہت۔''

میں نے غصہ چھپاتے ہوئے سر ہلا دیا۔ وہ برنارڈ کے ساتھ کھڑا تھا اور دونوں کی شکل بہت ملتی تھی: ایک جتنی قد، ایک جیسا چھریرا بدن، ایک جیسے نقوش۔ میں نے دل میں سوچا کہ اگر ابو کی مونچھیں نہ ہوں تو انہیں جڑواں ہی سمجھا جائے گا۔

ہم سیلینا کے پیچھے چلتے ہوئے گھر کے اندر گئے اور وہ ایک ٹرے میں بسکٹ اور سوڈا لائی۔ اتنے میں مونچھوں والا ایک خوش شکل نوجوان دروازے سے اندر آیا اور بلند آواز میں بولا۔

''رائے! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

رائے اٹھا اور اسے گلے لگایا۔ ''تم مجھے جانتے ہو۔ کھانے کو کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔ میں تم سے بھی یہی پوچھوں گا۔''

''میں۔ میں تو ماں سے ملنے آیا تھا۔ اگر میں زیادہ عرصہ ڈال دوں تو وہ شکایت کرتی ہے۔''

اس نے سیلینا کو رخسار پر چوما اور میرا ہاتھ پکڑ کر زور سے مصافحہ کیا۔ ''میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میرے

امریکی کزن کو لائے ہو! باری! میں نے تمہارے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ تم یہاں ہو۔'' وہ سیلینا کی جانب مڑا۔ ''کیا تم نے باری کو کچھ کھلایا ہے؟''

''ابھی دیتی ہوں، بلی۔'' سیلینا نے کیزیا کا ہاتھ پکڑا اور رائے کی جانب مڑی۔ ''تم نے دیکھا کہ ماں کو کیا کچھ کرنا پڑتا ہے؟ ویسے تمہاری دادی کیسی ہے؟''

''ویسی کی ویسی۔''

اس نے سوچتے ہوئے سر ہلایا۔ ''پھر تو کوئی بری بات نہیں۔''

وہ کیزیا کے ہمراہ کمرے سے باہر چلی گئی اور بلی دیوان پر رائے کے پہلو میں دراز ہو گیا۔

''اچھا، تو تم اب بھی بوانا کے لیے پاگل ہو؟ ذرا اپنا حال دیکھو؟ ہٹے کٹے سانڈ ہو! تمہیں تو سٹیٹس میں مزے اڑانے چاہئیں۔''

رائے بولا ''بس ٹھیک ہے۔ مومباسا کیسا ہے؟ میں نے سنا ہے کہ تم پوسٹ آفس میں نوکری کر رہے ہو۔''

بلی نے کندھے اچکائے۔ ''تنخواہ اچھی ہے۔ زیادہ کچھ نہیں کرنا پڑتا۔'' وہ میری جانب مڑا۔

''باری، میں تمہیں بتاؤں تمہارا یہ بھائی جنگلی تھا! سچی بات تو یہ ہے کہ پہلے ہم سب جنگلی ہوا کرتے تھے۔ ہم زیادہ تر وقت گرم جسموں کا پیچھا کرنے میں گزارتے تھے۔ ہے نا رائے!'' پھر اس نے رائے کی ران پر ہاتھ مارا اور ہنسا، ''تو مجھے بتاؤ، امریکی عورتیں کیسی ہیں؟''

رائے ہنسا، لیکن سیلینا اور کیزیا کو کھانا لے کر واپس آتے دیکھ کر اس نے کچھ سکھ کا سانس لیا۔

بلی بولا ''دیکھو باری۔ تمہارا باپ اور میرا باپ ہم عمر تھے۔ بہت کم فرق تھا۔ جب رائے اور میں بڑے ہو رہے تھے تو ہم بھی ہم عمر تھے، اس لیے ہمارا قریبی تعلق بننا فطری بات ہے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں، تمہارا باپ ایک عظیم انسان تھا۔ اپنے باپ کی نسبت اس کے ساتھ میرے زیادہ اچھے تعلقات تھے۔ اگر مجھے کوئی مصیبت پیش آتی تو انکل بارک سب سے پہلے ہاتھ آگے بڑھاتے۔ اور رائے، مجھے یقین ہے کہ تم بھی میرے باپ سے ہی رجوع کرو گے۔''

رائے نے دھیمی آواز میں جواب دیا، ''ہمارے خاندان کے لوگ ہمیشہ دوسروں کے بچوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتے رہے ہیں۔ اپنے بچوں کے معاملے میں وہ کمزور نہیں نظر آتا

چاہتے تھے۔''

بلی نے سر ہلایا اور اپنی انگلیوں کو چاٹا۔ ''پتا ہے رائے، میرے خیال میں تمہاری بات کافی حد تک درست ہے۔ میں خود یہ غلطی نہیں کرنا چاہتا۔ میں اپنے گھر والوں سے برا سلوک نہیں کروں گا۔'' بلی نے اپنے صاف ہاتھ سے بٹوہ نکالا اور مجھے اپنی بیوی اور دو بچوں کی تصویر دکھائی۔ ''قسم سے، شادی آپ کو ہڑپ کر لیتی ہے! اب مجھے دیکھو رائے۔ میں بہت متحمل مزاج ہو گیا ہوں۔ گھردار آدمی۔ یقیناً انسان ایک حد تک ہی جا سکتا ہے۔ میری بیوی جانتی ہے کہ مجھ سے کیسے نمٹنا ہے۔ تم کیا کہتے ہو، سعید؟''

میں نے محسوس کیا کہ جب سے ہم وہاں پہنچے تھے سعید چپ چپ سا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ دھوئے اور بلی کی جانب متوجہ ہوا۔

''میری ابھی تک شادی نہیں ہوئی، اس لیے شاید مجھے بات نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن میں مانتا ہوں کہ ان معاملات پر کچھ سوچ بچار کرتا رہا ہوں۔ میں نے نتیجہ نکالا ہے کہ افریقہ کا سنگین ترین مسئلہ معلوم ہے کہ کیا ہے؟'' اس نے کمرے میں نگاہ ڈالی۔ ''مرد اور عورت کے درمیان یہ چیز۔'' ہم مرد طاقتور بننے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن ہماری طاقت اکثر صحیح جگہ پر نہیں لگتی۔ جیسے ایک اور عورت لانے کا معاملہ ہے۔ ہمارے باپوں کی کئی کئی بیویاں تھیں، سو ہم بھی کئی عورتیں چاہتے ہیں۔ ان سب عورتوں کا کیا انجام ہوتا ہے؟ وہ حسد کرنے لگتی ہیں۔ ان کے بچے اپنے باپوں سے دور ہو جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ......''

سعید کہتے کہتے رک گیا۔ ''یقیناً میری ایک بھی بیوی نہیں، اس لیے مجھے مزید نہیں بولنا چاہیے۔ میں مانتا ہوں کہ تجربہ نہ ہو تو عقل مند آدمی کو خاموشی اختیار کرنی چاہیے۔''

کھانا ختم ہونے تک اندھیرا چھا چکا تھا، اور ہم کھانے کے لیے سیلینا اور کیزیا کا شکریہ ادا کر کے بلی کے ہمراہ باہر گلی میں نکل گئے۔ پورے چاند کی روشنی میں چلتے چلتے ہم ایک چھوٹے سے مکان میں پہنچے جہاں ایک پیلی کھڑکی کے باہر پتنگے اڑ رہے تھے۔ بلی نے دروازے پر دستک دی تو ایک چھوٹے قد کا آدمی باہر آیا۔ اس کی آنکھیں ہمیں گھور رہی تھیں لیکن لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس کے پیچھے ایک اور دراز قد اور بہت دبلا پتلا آدمی بیٹھا تھا۔ دونوں نے پرجوش انداز میں ہم سے

مصافحہ کیا اور میرے ساتھ ٹوٹی پھوٹی انگلش بولنے کی کوشش کی۔

تمہارا بھتیجا!'' سفید بالوں والے آدمی نے اپنی طرف اشارہ کر کے کہا۔

چھوٹے قد کا آدمی ہنس کر بولا۔ ''اس آدمی کے بال سفید ہیں، لیکن تمہیں انکل کہہ رہا ہے! ہا ہا۔ پسند آئی یہ انگلش؟ آؤ۔''

وہ ہمیں لکڑی کی ایک میز تک لے گئے جس پر بغیر لیبل والی ایک بوتل اور تین گلاس پڑے تھے۔ سفید بالوں والے نے بوتل اٹھائی اور ہر گلاس میں شراب ڈالی۔ بلی نے اپنا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''باری، یہ وہسکی سے بہتر ہے۔ یہ آدمی کو مرد بنا دیتی ہے۔'' اس نے سارا گلاس حلق میں انڈیل لیا؛ رائے اور میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میری چھاتی پھٹ جائے گی۔ گلاس دوبارہ بھرے گئے، لیکن سعید نے منع کر دیا۔ سفید بالوں والے آدمی نے مزید ایک ڈرنک پیا۔

''اور؟''

''نہیں، ابھی نہیں۔ شکریہ۔'' میں نے کھانسی روکتے ہوئے کہا۔

''تم میرے لیے کچھ لائے ہو نا؟ کوئی ٹی شرٹ، یا جوتے؟'' سفید بالوں والے نے پوچھا۔

''مجھے افسوس ہے..... میں سب چیزیں ایلیگو میں رکھ آیا ہوں۔''

چھوٹے قد والا آدمی مسکراتا رہا کہ جیسے اسے سمجھ نہ آئی ہو اور مجھے دوبارہ ڈرنک پیش کیا۔ اس مرتبہ بلی نے اس کا ہاتھ پرے کر دیا۔

''اسے رہنے دو! ہم بعد میں اور پی لیں گے۔ پہلے اپنے دادا سے مل لیں۔''

دونوں آدمی ہمیں پچھلے کمرے میں لے گئے۔ وہاں ایک مٹی کے تیل والے دیے کے سامنے نہایت بوڑھا شخص بیٹھا نظر آیا۔ اس کے بال برف جیسے سفید اور جلد کپڑے جیسی باریک تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے بے حرکت بیٹھا تھا۔

بلی نے اسے بتایا کہ کون ملنے آیا ہے۔ بوڑھے نے سر ہلایا اور ہلکی، شکستہ آواز میں کچھ کہنے لگا۔

''وہ کہہ رہا ہے کہ اسے تم سے مل کر خوشی ہوئی۔ وہ تمہارے دادا کا بھائی ہے۔ وہ تمہارے لیے دعا گو ہے۔'' رائے نے ترجمہ کر کے بتایا۔

میں نے کہا کہ میں بھی اس سے مل کر بہت خوش ہوں۔ بوڑھے نے دوبارہ سر ہلایا۔

"وہ کہہ رہا ہے کہ گوروں کے ملک میں بہت سے نوجوان کھو گئے ہیں۔ اس کا اپنا بیٹا بھی امریکہ میں ہے اور کئی سال سے گھر نہیں آیا۔ وہ کہتا ہے کہ اس قسم کے آدمی بھوت ہیں۔ جب وہ مر جائیں تو کوئی بھی گریہ وزاری نہیں کرے گا۔ انہیں اجداد بھی خوش آمدید نہیں کہیں گے۔ اس لیے اچھی بات ہے کہ تم واپس آ گئے۔"

بوڑھے نے ہاتھ اٹھایا تو میں نے آہستگی سے مصافحہ کیا۔ جب ہم اٹھنے لگے تو پیچھے سے اس نے آہستہ سے Luo زبان میں کچھ کہا۔

باہر آ کر رائے نے وضاحت کی: "وہ کہہ رہا ہے کہ اگر تمہیں اس کے بیٹے کی کوئی خبر ملے تو اسے کہنا کہ گھر آ جائے۔"

سولھواں باب

دادا اور دادی

رائے اور ابیو کی آنکھ کھلی تو ان کے سر درد کر رہے تھے، اور کیزیا کے ہمراہ مزید ایک دن کینڈو میں ہی ٹھہرے۔ حالت کچھ بہتر ہونے کی وجہ سے میں نے سعید اور برنارڈ کے ہمراہ بذریعہ بس واپس گاؤں جانے کا فیصلہ کیا، جس پر جلد ہی پچھتانا پڑا۔ زیادہ تر سفر کے دوران ہمیں کھڑے رہنا پڑا۔ ہمارے سر بس کی نیچی چھت سے بار بار ٹکراتے۔ ہر مرتبہ جھٹکا لگنے پر اور بھی برا حال ہو جاتا۔ جب گاؤں پہنچا تو دادی اور اوما مجھے لنگڑا کر چلتے دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔ عورتیں آم کے پیڑ تلے چٹائیاں بچھائے بیٹھی تھیں اور دادی اوما کی چٹیا کر رہی تھی، جبکہ پڑوسیوں کی لڑکی زیتونی سے چٹیا کروا رہی تھی۔

اوما نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے پوچھا، "اچھا وقت گزرا؟"

"زبردست،" میں ان کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک دبلی پتلی بوڑھی عورت مکان سے باہر نکلی اور دادی کے پاس آ بیٹھی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ بوڑھی عورت بہتر تہتر سال کی ہو گی، مگر اس نے شوخ گلابی رنگ کا سویٹر پہن رکھا تھا اور کسی شرمیلی لڑکی کی طرح اپنی ٹانگیں ایک طرف کو سمیٹ کر بیٹھی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا اور Luo میں اوما سے کچھ بولی۔

"وہ کہتی ہے کہ تمہارا حال اچھا نہیں لگ رہا۔"

بوڑھی مسکرائی تو دو سامنے والے نچلے دانت غائب نظر آئے۔

اوما نے مزید بتایا، "یہ ہمارے دادا کی بہن ڈورسیلا ہے۔ پردادا اوباما کی آخری اولاد۔ یہ کسی اور گاؤں میں رہتی ہے لیکن جب اس نے سنا کہ......۔ اووو! بارک، تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں چٹیا

نہیں کھولنا پڑتی۔ میں کیا کہہ رہی تھی؟ ہاں.....ڈورسیلا کہتی ہے کہ جب اس نے ہماری آمد کا سنا تو اتنی دور سے پیدل چل کر ہمیں ملنے آئی ہے۔ وہ اپنے گاؤں کے سب لوگوں کی جانب سے تمہارے لیے دعائیں اور پیار لائی ہے۔''

میں نے ڈورسیلا سے ہاتھ ملایا اور بتایا کہ میں اس کے بڑے بھائی سے کینڈو میں مل کر آیا ہوں۔ اس نے ہاں میں سر ہلایا اور دوبارہ کچھ بولی۔

اوما نے ترجمہ کیا،''وہ کہتی ہے کہ اس کا بھائی بہت بوڑھا ہے۔ جوانی میں وہ بالکل تمہارے دادا جیسا لگتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ خود بھی غلطی کھا جاتی تھی۔''

میں نے ہاں میں ہاں ملائی اور اپنا لائٹر نکال کر اسے دکھایا اور بتایا کہ وہ کیسے کام کرتا تھا۔

ڈورسیلا ہنستی ہی جا رہی تھی۔ اوما نے وضاحت کی:''وہ کہتی ہے کہ چیزیں اس قدر تیزی سے بدل رہی ہیں کہ اس کا سر گھوم گیا ہے۔ جب اس نے پہلی بار ٹیلی ویژن دیکھا تو یہی سمجھی کہ ڈبے کے اندر موجود لوگ بھی اسے دیکھ سکتے تھے۔ وہ انہیں بہت بدتمیز خیال کرتی تھی کیونکہ وہ کبھی کسی بات کا جواب ہی نہیں دیتے تھے۔''

ڈورسیلا خود پر ہنسی، جبکہ زیتونی کھانا پکانے والے جھونپڑے میں چلی گئی۔ چند منٹ بعد زیتونی ہاتھ میں ایک مگ لیے ہوئے آئی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ سعید اور برنارڈ کا کیا بنا۔

''وہ سو رہے ہیں۔ یہ لو، پیو،'' اس نے کپ مجھے پکڑاتے ہوئے کہا۔

میں نے بھاپ دیتے ہوئے سبز مائع کو سونگھا۔

''یہ کیا ہے؟''

''یہ یہاں اگنے والے ایک پودے سے تیار کیا گیا ہے۔ اطمینان رکھو.....یہ تمہارا معدہ بالکل ٹھیک کر دے گا۔''

میں نے ہچکچا کر ایک گھونٹ لیا۔ جوشاندے کا ذائقہ بھی اس کی شکل جتنا خراب تھا، لیکن زیتونی میرے سر پہ کھڑی رہی اور آخری قطرہ پی لینے تک وہاں سے نہ ہٹی۔ اس نے کہا،''یہ تمہارے دادا کا نسخہ ہے۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ وہ جڑی بوٹیوں کا ماہر تھا۔''

میں نے سگریٹ کا ایک اور کش لیا اور اوما کو واپس کر دیا۔''دادی سے کہو کہ مجھے اس کے متعلق اور بھی کچھ بتائے۔ میرا مطلب ہے کہ دادا کے بارے میں۔ رائے نے کہا ہے کہ وہ دراصل کینڈو

میں پلا بڑھا تھا۔ تو پھر وہ ایلیگو کیوں آ گیا؟''

دادی نے اوما کا ترجمہ سن کا سر ہلایا۔''کیا وہ جانتی تھی کہ دادا کینڈو چھوڑ کے کیوں آ گیا؟''

دادی نے کندھے اچکائے۔''وہ کہہ رہی ہے کہ اس کے لوگوں کا اصل وطن یہی تھا۔'' اوما نے مجھے بتایا۔

میں نے دادی سے کہا کہ شروع سے بتائے۔ ہمارا پردادا اوباما کینڈو میں کیوں آیا؟ ہمارا دادا کہاں کام کرتا تھا؟ بوڑھے کی ماں چھوڑ کر کیوں چلی گئی۔ جب اس نے جواب دینا شروع کیا تو مجھے یوں لگا جیسے فضا میں ایک دم جان پڑ گئی اور پھر وہ مردہ ہو گئی۔ بہت اوپر بادلوں کی ایک قطار نے پہاڑیوں کو پار کیا۔ اور آم کے پیڑ تلے مجھے تمام آوازیں آپس میں ملتی ہوئی معلوم ہوئیں...... ست روندی کے دھاروں کی طرح آپس میں ملتی ہوئی تین پشتوں کی آواز۔ لیکن ان سب آوازوں نے ایک ہی کہانی کے دھارے کا روپ اختیار کر لیا......

> سب سے پہلے میویرو تھا۔ اس سے پہلے کے کسی آدمی کے متعلق معلوم نہیں۔ میویرو کا بیٹا سیگوما، سیگوما کا بیٹا اووینی، اووینی کا بیٹا کیشودھی، کیشودھی کا بیٹا اوگیلو، اوگیلو کا بیٹا اوکوتھ اور اوکوتھ کا بیٹا اوبیو تھا۔ انہیں جنم دینے والی عورتوں کے نام بھلائے جا چکے ہیں، کیونکہ ہمارے لوگ سلسلۂ نسب اسی انداز میں یاد رکھتے ہیں۔
>
> اوکوتھ ایلیگو میں رہتا تھا۔ اس سے پہلے کہا جاتا ہے کہ کنبے موجودہ یوگنڈا کی طرف سے طویل سفر کر کے آیا کرتے تھے، اور ہم مسائی کی طرح پانی اور چراگاہوں کی تلاش میں نقل مکانی کیا کرتے تھے۔ ایلیگو میں لوگ آباد ہوئے اور کاشت کاری شروع کی۔ دیگر Luo جھیل کے کنارے جا بسے اور ماہی گیری سیکھی۔ کچھ اور بانتو بولنے والے قبیلے بھی تھے جو Luo کی آمد کے وقت پہلے سے ایلیگو میں رہا کرتے تھے۔ اور زبردست لڑائیاں ہوئیں۔ ہمارا جدامجد اووینی ایک مشہور سورما اور اپنے لوگوں کا سردار تھا۔ اس نے بانتو افواج کو شکست دی، لیکن بانتو لوگوں کو وہیں رہنے اور Luo سے شادیاں کرنے کی اجازت دی۔ انہوں نے ہمیں کاشت کاری اور نئی

زمین کے متعلق بہت کچھ سکھایا۔

ایک مرتبہ جب لوگ بس گئے اور کاشت کاری کرنے لگے تو ایلیگو بہت گنجان ہو گیا۔ اوکوتھ کا بیٹا اوپیو چھوٹا بھائی تھا، لہٰذا شاید اسی لیے اس نے کینڈو بے جانے کا فیصلہ کیا۔ جب وہ وہاں گیا تو بے زمین تھا، لیکن ہمارے لوگوں کی روایت میں کوئی آدمی کسی بھی بیکار پڑی زمین کو استعمال میں لا سکتا تھا۔ جو زمین کوئی بھی استعمال نہ کرتا وہ قبیلے کو واپس مل جاتی۔ چنانچہ اوپیو کی صورت حال شرمناک نہیں تھی۔ اس نے دیگر آدمیوں کے کھیتوں میں کام کیا اور اپنے لیے بھی زمین صاف کی۔ لیکن خوش حالی آنے سے پہلے وہ جوانی میں ہی مر گیا۔ اس کے پسماندگان میں دو بیویاں اور متعدد بچے تھے۔ ایک بیوی کو اس وقت کے رواج کے مطابق اوپیو کے بھائی نے لے لیا...... وہ اس کے بھائی کی بیوی اور بچے اس کے بھائی کے بچے بن گئے۔ لیکن دوسری بیوی بھی مر گئی اور اس کا سب سے بڑا بیٹا اوباما لڑکپن میں ہی یتیم ہو گیا۔ وہ بھی اپنے تایا کے ساتھ رہتا تھا، لیکن خاندان کے وسائل کم تھے۔ چنانچہ بڑا ہونے پر اوباما بھی باپ کی طرح دوسروں کے کھیتوں میں کام کرنے لگا۔

جس خاندان کے لیے وہ کام کیا کرتا تھا وہ بہت امیر اور بہت سے مویشیوں کے مالک تھے۔ لیکن وہ اوباما کے معترف ہوئے کیونکہ وہ بڑی محنت اور لگن سے کاشت کاری کیا کرتا تھا۔ جب اس نے ان کی سب سے بڑی بیٹی سے شادی کرنا چاہی تو وہ مان گئے اور خاندان کے چچاؤں نے جہیز کی ضروری چیزیں مہیا کیں۔ اور جب وہ لڑکی مر گئی تو انہوں نے اوباما کو اپنی چھوٹی بیٹی نیاؤ کی سے شادی کرنے کی رضامندی دی۔ انجام کار اوباما نے کل چار شادیاں کیں اور بہت سے بچوں کا باپ بنا۔ اس نے اپنے لیے زمین صاف کی اور خوش حال ہو گیا۔ اس کے پاس خاصا بڑا مکان اور بہت سے مویشی تھے۔ وہ اپنی شائستگی اور فرض شناسی کی وجہ سے کینڈو میں ایک بڑا آدمی بنا اور بہت سے لوگ اس سے مشورے لینے کے لیے آنے لگے۔

تمہارا دادا اونیاگو نیاؤ کی کا پانچواں بیٹا تھا۔ یہ ڈورسیلا اوباما کی آخری بیوی کی اولاد ہے۔

اس دور میں گورے ابھی نہیں آئے تھے۔ ہر خاندان کا اپنا اپنا مکان تھا، لیکن وہ سب بزرگوں کے بنائے ہوئے قوانین کی اطاعت کرتے تھے۔ آدمیوں کی اپنی جھونپڑیاں تھیں اور وہ اپنی زمین کو صاف کرنے اور ہل لانے کے ذمہ دار تھے۔ مویشیوں کو جنگلی درندوں سے بچانا اور دوسرے قبائل کے حملوں کو روکنا بھی ان کی ذمہ داری تھی۔ ہر بیوی اپنی کیاری میں سبزیاں اگاتی، جس میں صرف وہ یا اس کی بیٹیاں ہی بیج بو سکتی تھیں۔ بیوی اپنے شوہر کے لیے کھانا پکاتی، پانی لاتی اور جھونپڑی کو صاف ستھرا رکھتی۔ کاشت کاری اور فصل کے تمام معاملات بزرگ طے کرتے تھے۔ انہوں نے ہر گھرانے کے ذمہ باری باری مختلف کام لگائے تاکہ سب ایک دوسرے کی مدد کریں۔ بزرگ ہی بیواؤں یا غریبوں کو کھانا تقسیم کرتے، مویشیوں سے محروم آدمیوں کے لیے جہیز میں مویشی دینے کا انتظام کرتے اور تمام جھگڑے نمٹاتے۔ بزرگوں کے الفاظ ہی قانون تھے اور ان پر سختی سے عمل کیا جاتا ..... نافرمانوں کو وہاں سے جانا اور کوئی نیا گاؤں بسانا پڑتا تھا۔

بچے سکول جانے کے بجائے اپنے ماں باپ سے ہی سب کچھ سیکھتے۔ لڑکیاں اپنی ماؤں سے غلہ پیسنا، دلیہ بنانا، سبزیاں اگانا اور جھونپڑیوں پر لیپ کرنا سیکھتی تھیں۔ باپ اپنے بیٹوں کو مویشی چرانا اور بھالا پھینکنا سکھاتے۔ جب کوئی ماں مر جاتی تو دوسری بچے کا خیال رکھتی اور اپنے بچے کی طرح دودھ پلاتی۔ رات کے وقت بیٹیاں اپنی ماؤں کے ساتھ کھانا کھاتی تھیں، جبکہ بیٹے اپنے باپوں کے پاس ان کی جھونپڑی میں چلے جاتے۔ وہ ان سے کہانیاں سنتے اور رسم و رواج سیکھتے۔ کبھی کبھی کوئی ساز

بجانے والا آتا اور سارا گاؤں اس سے گیت سننے کے لیے اکٹھا ہو جاتا۔ گویا ماضی کے عظیم کارنامے گیتوں کی صورت میں سناتا...... عظیم سورماؤں اور دانا بزرگوں کے قصے۔ وہ اچھی کاشت کاری کرنے والے تمام مردوں یا تمام خوب صورت عورتوں کی تعریف کرتے اور سست یا ظالم لوگوں کو برا بھلا کہتے۔ ان گیتوں میں بتایا جاتا کہ سب کا گاؤں کی زندگی میں اچھا یا برا کیا حصہ ہے۔ اس طرح اجداد کی روایات تمام سننے والوں میں زندہ رہتیں۔ جب بچے اور عورتیں چلے جاتے تو مرد اکٹھے ہو کر گاؤں کے مختلف امور کا فیصلہ کرتے۔

تمہارا دادا اونیا گو لڑکپن سے ہی عجیب تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی گا... میں چیونٹیاں تھیں، کیونکہ وہ کسی جگہ ٹک کر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ وہ کئی کئی دن اکیلا گھومتا پھرتا اور جب واپس آتا تو کچھ نہ بتاتا کہ کہاں گیا تھا۔ وہ ہمیشہ بہت سنجیدہ رہتا...... وہ کبھی نہ ہنستا اور نہ ہی دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیلتا، اور کبھی کوئی مذاق بھی نہ کرتا۔ وہ ہمیشہ دوسرے لوگوں کی ٹوہ میں رہتا۔ یوں اس نے جڑی بوٹیوں کا علم حاصل کر لیا۔ تمہیں پتا ہوگا کہ جڑی بوٹیوں کا ماہر عام جھاڑ پھونک کرنے والے سے مختلف ہوتا ہے۔ جھاڑ پھونک کرنے والا شخص منتر سے کام لیتا اور روحانی دنیا سے بات کرتا ہے۔ جڑی بوٹیوں کا ماہر یا حکیم جانتا ہے کہ کونسے پودے سے کس بیماری یا زخم کا علاج ہو سکتا ہے۔ نوجوانی میں تمہارا دادا اپنے گاؤں کے حکیم کی جھونپڑی میں بیٹھا رہتا اور بغور اس کی باتیں سنتا، جبکہ دوسرے لڑکے کھیل کود میں مصروف ہوتے۔

جوانی میں اسے پتا چلا کہ گورے کیسومو قصبے میں آئے تھے۔ بتایا گیا کہ ان گوروں کی چمڑی بچے جیسی نرم تھی، لیکن وہ ایک بحری جہاز پہ سوار ہوتے تھے اور ان کے پاس چھڑیاں تھیں جن میں سے آگ نکلتی تھی۔ تب تک ہمارے گاؤں میں کسی نے بھی گوروں کو نہیں دیکھا تھا...... بس کبھی کبھار

عرب تاجر کھانڈ اور کپڑا بیچنے آ جاتے تھے۔ لیکن ایسا بھی شاذ و نادر ہوتا، کیونکہ ہمارے لوگ زیادہ کھانڈ استعمال نہیں کرتے تھے اور ہم کپڑے کے بجائے صرف بکرے کی کھال سے اپنے آپ کو ڈھانپتے تھے۔ جب بزرگوں نے یہ کہانیاں سنیں تو آپس میں صلاح مشورہ کیا اور مردوں سے کہا کہ وہ ان گوروں کے متعلق ٹھیک طرح سے کچھ معلوم ہو جانے تک کیسومو سے دور رہیں۔

تنبیہ کے باوجود اونیا گو کو تجسس ہوا اور اس نے جا کر گوروں کو خود دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ ایک روز وہ اچانک غائب ہو گیا اور کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں گیا ہے۔ کئی مہینے تک کوئی خبر نہ ملی اور اونیا گو کے بیٹے زمین پر کام کرتے رہے۔ پھر ایک دن وہ واپس گاؤں آیا۔ اس نے ایک گورے کا ٹراؤزر اور اسی کی شرٹ اور جوتے پہن رکھے تھے۔ چھوٹے بچے ڈر گئے، اور اس کے بھائیوں کو سمجھ نہ آئی کہ اس تبدیلی کا کیا کریں۔ انہوں نے اوباما کو بلایا۔ وہ اپنے جھونپڑے سے باہر نکلا، سارا خاندان اونیا گو کے گرد جمع ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

اوباما نے پوچھا، ''تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم نے یہ عجیب و غریب کھالیں کیوں پہن رکھی ہیں؟'' اونیا گو نے جواب میں کچھ نہ کہا اور اوباما نے فیصلہ کیا کہ وہ ضرور اپنے ختنے چھپانے کی خاطر ٹراؤزر پہنے ہوئے تھا جس کی Luo روایت میں اجازت نہیں۔ اس نے سوچا کہ اونیا گو کی شرٹ ضرور کسی زخم وغیرہ کو چھپانے کے لیے ہے۔ اوباما اپنے دوسرے بیٹوں کی طرف مڑا اور بولا، ''اپنے اس بھائی کے قریب مت جانا۔ یہ ناپاک ہے۔'' تب وہ واپس اپنے جھونپڑے میں چلا گیا اور دوسرے لوگ اونیا گو پر ہنستے رہے۔ اسی وجہ سے اونیا گو کیسومو واپس چلا گیا اور باقی ساری زندگی اپنے باپ سے نہ بولا۔

اس وقت کسی نے بھی محسوس نہ کیا کہ گورے لوگ اس علاقے میں رہنے

آئے تھے۔ ہم سمجھے کہ وہ بس چیزیں بیچنا اور خریدنا چاہتے ہیں۔ جلد ہی ہم نے ان والی کچھ عادتیں اختیار کر لیں، جیسے چائے پینا۔ چائے پینے پر ہمیں پتا چلا کہ چینی اور کیتلیاں اور کپ بھی ضروری ہیں۔ ہم یہ تمام چیزیں کھالوں اور گوشت اور سبزیوں کے بدلے خریدنے لگے۔ بعد میں ہم نے گوروں کا سکہ استعمال کرنا سیکھا۔ لیکن ان چیزوں نے ہم پر زیادہ گہرائی میں اثر نہ کیا۔ عربوں کی طرح گوروں کی تعداد بھی کم رہی اور ہم نے فرض کر لیا کہ انجام کار وہ اپنے وطن واپس چلے جائیں گے۔ کچھ گورے کیسومو میں مقیم ہو گئے اور ایک مشن بنایا۔ یہ آدمی اپنے خدا کی بات کرتے تھے جسے قادر مطلق بتایا گیا۔ لیکن بیشتر لوگوں نے انہیں نظر انداز کر دیا اور ان کی گفتگو کو احمقانہ سمجھا۔ حتیٰ کہ جب گورے رائفلیں لے کر آئے تو کسی نے بھی مزاحمت نہ کی کیونکہ تب تک ہماری زندگیاں اس قسم کے ہتھیاروں سے آنے والی موت سے آشنا نہیں تھیں۔ بہت سے لوگوں نے بندوقوں کو محض آرائشی ڈنڈے خیال کیا۔

گوروں کے ساتھ پہلی جنگ کے بعد حالات تبدیل ہونے لگے۔ مزید بندوقیں آئیں اور ان کے ساتھ ایک گورا آدمی بھی جو خود کو ڈسٹرکٹ کمشنر کہتا تھا۔ ہم نے اس آدمی کو بواناداگالو کا نام دیا جس کا مطلب ''ظالم'' بنتا ہے۔ اس نے فی جھونپڑا ایک ٹیکس عائد کیا جو گورے کے خزانے میں جمع کروانا ہوتا تھا۔ اس طرح بہت سے آدمی تنخواہ پر کام کرنے پر مجبور ہوئے۔ اس نے سامان لانے، لیجانے اور سڑک بنانے کے لیے فوراً بہت سے آدمیوں کو فوج میں جبری بھرتی کر لیا۔ وہ Luo لوگوں میں گھرا رہتا جو گوروں جیسا ہی لباس پہنتے اور اس کے لیے محصول جمع کرتے۔ ہمیں پتا چلا کہ اب ہمارے ایسے سردار موجود تھے جو بزرگوں کی مجلس کے بھی رکن نہ تھے۔ ان تمام چیزوں کی مدافعت کی گئی، اور بہت سے آدمی لڑنے لگے۔ لیکن ایسا کرنے والوں کو پیٹا یا گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ محصول

ادا نہ کر سکنے والوں نے اپنے جھونپڑوں کو آنکھوں کے سامنے جل کر راکھ ہوتے دیکھا۔ کچھ گھرانے دور کے دیہی علاقے میں چلے گئے اور نئے گاؤں بسائے۔ لیکن بیشتر لوگ وہیں رہے اور نئے حالات سے سمجھوتہ کرنا سیکھا۔ البتہ اب ہم نے محسوس کر لیا تھا کہ گورے کی آمد کو نظر انداز کرنا بے وقوفی ہوگی۔

اس دوران تمہارا دادا گورے کے لیے کام کیا کرتا تھا۔ اس زمانے میں چند ایک لوگ ہی انگلش یا سواحلی زبان بول سکتے تھے...... لوگ اپنے بیٹوں کو گوروں کے سکول میں بھیجنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس کے بجائے وہ انہیں اپنے ساتھ زمین پر ہی کام کرواتے۔ لیکن اونیانگو نے پڑھنا اور لکھنا سیکھ لیا تھا، اور گوروں کا ریکارڈ رکھنے کا نظام اچھی طرح سمجھ لیا۔ یوں وہ گورے کے لیے فائدہ مند بن گیا اور جنگ کے دوران اسے سڑک والے عملے کا انچارج بنایا گیا۔ آخر کار اسے تانگانیکا بھیجا گیا جہاں وہ کئی سال تک رہا۔ جب وہ واپس آیا تو کینڈو میں زمین صاف کی، لیکن وہ جگہ اس کے باپ کے گھر سے دور تھی اور وہ شاذ و نادر ہی اپنے بھائیوں سے بات کیا کرتا تھا۔ اس نے اپنے لیے مناسب جھونپڑا بھی نہ بنایا، بلکہ ایک خیمے میں رہتا تھا۔ لوگوں نے اس سے پہلے کبھی ایسی چیز نہ دیکھی تھی اور وہ اسے پاگل سمجھنے لگے۔ آخر کار وہ نیروبی کی طرف گیا جہاں ایک گورے نے اسے ملازمت پیش کی۔

ان دنوں چند ایک افریقی ہی ٹرین پر سوار ہو سکتے تھے، لہٰذا اونیانگو پیدل نیروبی تک گیا۔ اس سفر میں اسے دو ہفتے سے زیادہ وقت لگا۔ بعد ازاں اس نے ہمیں اس سفر کے دوران پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کیا۔ کئی مرتبہ چیتوں نے تعاقب کر کے اسے اس کے panga سے نکال دیا۔ ایک مرتبہ ایک بپھری ہوئی بھینس نے اسے درخت میں چھپنے پر مجبور کر دیا اور وہ دو دن تک وہیں سوتا رہا۔ ایک مرتبہ اسے جنگل میں عین راستے پر

ڈرم پڑا ہوا ملا، لیکن جب اسے کھولا تو ایک سانپ نکل کر جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ مگر اسے کوئی نقصان نہ پہنچا اور انجام کار اس نے نیروبی پہنچ کر گورے کے گھر میں کام شروع کیا۔

وہ شہر جانے والا اکیلا شخص نہیں تھا۔ جنگ کے بعد بہت سے دیگر افریقیوں نے بھی اجرت پر کام شروع کیا، بالخصوص انہوں نے جنہیں فوج میں جبراً بھرتی کیا گیا یا جو شہروں کے قریب رہتے تھے یا گوروں کے مشنز میں شامل ہو چکے تھے۔ جنگ کے دوران اور فوراً بعد بہت سے لوگ بے گھر ہو گئے تھے۔ جنگ اپنے ساتھ قحط، وبا اور گورے آبادکاروں کی ایک بہت بڑی تعداد بھی لائی جنہیں بہترین زمین ضبط کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔

کی کویو (Kikuyu) نے ان تبدیلیوں کو سب سے زیادہ محسوس کیا کیونکہ وہ نیروبی کے آس پاس سطح مرتفع میں رہتے تھے جہاں گوروں کی آبادی سب سے زیادہ تھی۔ لیکن Luo نے بھی گوروں کی حکومت کا اثر لیا۔ تمام افراد کو نوآبادیاتی انتظامیہ کے پاس رجسٹریشن کروانا پڑی اور جھونپڑا ٹیکس میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس چیز نے مزید آدمیوں کو گورے کے وسیع کھیتوں پر بطور مزدور کام کرنے پر مجبور کیا۔ ہمارے گاؤں میں اب زیادہ گھرانے گوروں جیسا لباس پہنتے تھے اور زیادہ باپ اپنے بچوں کو مشن سکول میں داخل کروانے پر آمادہ تھے۔ بلاشبہ سکول جانے والے لوگ بھی گوروں والے کام نہیں کر سکتے تھے۔ صرف گوروں کو مخصوص زمین خریدنے اور مخصوص کاروبار کرنے کی اجازت تھی۔ دیگر کام قانون کے تحت صرف ہندو اور عرب کر سکتے تھے۔

کچھ آدمی ان پالیسیوں کے خلاف منظم ہونے اور احتجاج کرنے لگے۔ لیکن ان کی تعداد بہت کم تھی اور زیادہ تر لوگ محض زندہ رہنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ مزدوروں کے طور پر کام نہ کرنے والے افریقی اپنے

دیہات میں ہی ٹھہرے اور پرانے طور طریقوں کو قائم رکھنے کی کوشش میں لگے رہے۔ لیکن دیہات میں بھی رویے بدل گئے تھے۔ زمین گنجان آباد ہو گئی تھی، کیونکہ ملکیت کے نئے قوانین نافذ ہونے کی وجہ سے اب بیٹے نئے قطعوں پر کھیتی باڑی شروع نہیں کر سکتے تھے...... ہر چیز کسی نہ کسی کی ملکیت تھی۔ روایت کا احترام نرم پڑ گیا، کیونکہ نوجوانوں نے اپنے بزرگوں کو بے اختیار دیکھا۔ ایک دور میں بیئر شہد سے بنائی جاتی تھی اور مرد کبھی کبھار ہی پیا کرتے تھے۔ اب یہ بوتلوں میں آتی اور بہت سے مرد نشے میں رہنے لگے۔ ہم میں سے متعدد لوگوں کو گوروں کی زندگی کا چسکا پڑ گیا اور ہم نے فیصلہ کیا کہ ان کے مقابلے میں ہماری زندگیاں حقیر تھیں۔

ان معیاروں کے مطابق تمہارے دادے نے ترقی کی۔ نیروبی میں نوکری کرتے ہوئے اس نے گوروں والا کھانا بنانا اور ان کی طرح گھر کو منظم کرنا سیکھا۔ اس وجہ سے وہ مالکوں میں مقبول تھا اور کچھ نہایت اہم گوروں، حتیٰ کہ لارڈ ڈیلامیئر کی جاگیروں میں کام کرتا تھا۔ اس نے اپنی تنخواہ بچائی اور کینڈو میں زمین و مویشی خریدے۔ ان زمینوں پر آخر اس نے اپنے لیے ایک جھونپڑا بنایا۔ لیکن اس کا جھونپڑے کو منظم کرنے کا طریقہ دوسروں سے مختلف تھا۔ اس کا جھونپڑا بالکل صاف ستھرا اور بے داغ تھا۔ وہ لوگوں سے کہتا کہ اندر آنے سے قبل پاؤں رگڑیں یا جوتے اتار دیں۔ اندر وہ اپنا کھانا چھری اور کانٹے کی مدد سے میز اور کرسی پر کھاتا جس کے گرد مچھر دانی لگی ہوتی۔ وہ ہاتھ دھوئے بغیر کھانے کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگاتا اور پکانے کے فوراً بعد ڈھانپ دیتا۔ وہ ہر وقت نہاتا رہتا، ہر رات کو اپنے کپڑے دھوتا۔ وہ اپنی زندگی کے آخر تک ایسا ہی رہا، بہت صاف ستھرا۔ اگر آپ کوئی چیز غلط جگہ پر رکھ دیتے یا کچھ صحیح طرح صاف نہ کرتے تو وہ غصے میں آ جاتا۔

وہ اپنی جائیداد کے معاملے میں بھی بہت سخت تھا۔ اگر آپ اس سے مانگتے

تو وہ ہمیشہ آپ کو کچھ نہ کچھ دیتا...... اپنا کھانا، پیسے، حتیٰ کہ کپڑے۔ لیکن اگر آپ بغیر پوچھے ان چیزوں کو ہاتھ بھی لگاتے تو وہ بہت غصہ کرتا۔ بچے پیدا ہونے کے بعد بھی وہ ہمیشہ ان سے یہی کرتا کہ دوسروں کی چیزوں کو کبھی ہاتھ نہ لگائیں۔

کینڈو کے لوگوں کو یہ چیزیں عجیب لگتی تھیں۔ وہ اس کے گھر آتے کیونکہ وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ کھانے کو پیش کرتا۔ لیکن وہ بعد میں اس پر ہنستے کیونکہ اس کی نہ بیوی تھی نہ بچے۔ شاید اونیاگو نے اس قسم کی کوئی بات سن لی، کیونکہ جلد ہی بیوی لانے کا فیصلہ کیا۔ مسئلہ یہ تھا کہ کوئی بھی عورت اس کی مرضی کے مطابق گھر نہیں چلا سکتی تھی۔ اس نے متعدد لڑکیوں کو جہیز دیا، لیکن جب بھی کوئی لڑکی سستی کرتی یا پلیٹ توڑ دیتی تو تمہارا دادا اسے بری طرح پیٹتا۔ کسی غلطی پر اپنی بیویوں کو مارنا Luo مردوں میں عام تھا، لیکن Luo لوگ بھی اونیاگو کو درشت مزاج خیال کرتے تھے، اور انجام کار اس کی لائی ہوئی عورتیں بھاگ کر واپس اپنے باپ کے گھر چلی جاتیں۔ اس طرح تمہارا دادا اپنے زیادہ تر مویشیوں سے ہاتھ دھو بیٹھا، کیونکہ وہ جہیز واپس مانگنا اپنی توہین سمجھتا تھا۔

انجام کار اسے ایک بیوی ملی جو اس کے ساتھ رہنے کے قابل تھی۔ اس کا نام حلیمہ تھا۔ یہ معلوم نہیں کہ وہ تمہارے دادا کے متعلق کیا محسوس کرتی تھی، لیکن وہ خاموش طبع اور خلیق تھی ...... اور سب سے اہم بات یہ کہ وہ تمہارے دادا کے اعلیٰ معیاروں کے مطابق گھر چلا سکتی تھی۔ دادا نے اس کے لیے کینڈو میں ایک جھونپڑا بنایا جہاں اپنا زیادہ تر وقت گزارا کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اسے نیروبی بھی لے جاتا جہاں وہ کام کرتا تھا۔ کچھ سال گزرنے پر پتا چلا کہ حلیمہ بچے پیدا نہیں کر سکتی۔ Luo لوگوں میں یہ عموماً طلاق کے لیے ایک جائز وجہ تھی...... کوئی مرد اپنی بانجھ بیوی کو واپس میکے بھیج سکتا اور جہیز کی واپسی کا مطالبہ کر سکتا تھا۔ لیکن تمہارے دادا نے حلیمہ کو

ساتھ ہی رکھنے کا فیصلہ کیا اور اس مفہوم میں اس کے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آیا۔

پھر بھی حلیمہ کو بہت تنہائی محسوس ہوتی ہوگی، کیونکہ دادا تو ہر وقت کام میں لگا رہا اور اس کے پاس دوستوں یا تفریح کے لیے کوئی وقت نہ تھا۔ وہ دوسرے آدمیوں کے ساتھ شراب نوشی نہ کرتا اور نہ ہی تمباکو نوشی کرتا تھا۔ ہر ماہ ایک مرتبہ نیروبی کے ڈانس ہالز میں جانا اس کی واحد مسرت تھی۔ لیکن وہ خود اچھا ڈانسر نہیں تھا ...... وہ بے ہنگم انداز میں ڈانس کرتے ہوئے دوسرے لوگوں کے پیر مسل دیتا تھا۔ بیشتر لوگ اس بات پر کچھ نہ کہتے کیونکہ انہیں اونیاگو اور اس کے غصے کا علم تھا۔ البتہ ایک روز نشے میں مست ایک آدمی نے اونیاگو کے خلاف شکایت شروع کر دی۔ وہ آدمی بہت بدتمیزی سے پیش آیا اور تمہارے دادا سے کہا، ''اونیاگو، تم بوڑھے ہو چکے ہو۔ تمہارے پاس بہت سے مویشی ہیں، اور بیوی بھی ہے، مگر کوئی بچہ نہیں۔ کیا تم بتاؤ گے کہ تمہاری ٹانگوں کے درمیان کیا مسئلہ ہے؟''

یہ گفتگو سننے والے لوگ ہنسنے لگے، اور اونیاگو نے اس آدمی کو بری طرح پیٹا۔ لیکن بدمست آدمی کے الفاظ تمہارے دادا کے ذہن میں پیوست ہو گئے ہوں گے، کیونکہ اسی ماہ وہ دوسری بیوی ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا۔ وہ کینڈو واپس آیا اور گاؤں میں تمام عورتوں کے متعلق پوچھا۔ آخر کار اس نے اکومو نامی ایک جوان لڑکی کو پسند کیا جو اپنی خوب صورتی کے لیے شہرت رکھتی تھی۔ اس کا رشتہ کسی اور آدمی سے طے پا چکا تھا، جس نے اکومو کے باپ کو جہیز میں چھ مویشی بھی دے دیے تھے، اور مزید چھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن اونیاگو لڑکی کے باپ کو جانتا تھا اور اسے چھ مویشی واپس کرنے پر مائل کر لیا۔ بدلے میں اونیاگو نے موقع پر ہی اسے پندرہ مویشی دیے۔ اگلے روز، تمہارے دادا نے جنگل میں ہی اکومو کو جالیا اور گھسیٹ کر اونیاگو کے جھونپڑے میں لے آیا۔

ایک نوجوان گوڈفرے پانی کا تسلا لے کر آیا اور لنچ کے لیے ہمارے ہاتھ دھلوائے۔ اوما نے کھڑے ہو کر کمر سیدھی کی۔ اس کے آدھے بالوں کی مینڈھیاں اب بھی ہونا باقی تھیں۔ اس نے ڈورسیلا اور دادی سے کچھ کہا اور ان دونوں نے کوئی لمبا سا جواب دیا۔

''میں ان سے پوچھ رہی تھی کہ کیا ہمارے دادا نے اکومو کے ساتھ زبردستی کی تھی،'' اوما نے پلیٹ میں کچھ گوشت ڈالتے ہوئے مجھے بتایا۔

''انہوں نے کیا کہا؟''

''ان کا کہنا ہے کہ عورت کو دبوچ کر لے جانا Luo روایت میں شامل تھا۔ روایت کے لحاظ سے جب مرد جہیز کی رقم ادا کر دیتا تو عورت پر لازم ہوتا کہ وہ اس کے پاس جانے کا شوق ظاہر نہ کرے۔ وہ اسے مسترد کرتی رہتی، لہٰذا مرد اپنے دوستوں کے ہمراہ آتا اور اسے اپنے جھونپڑے میں لے جاتا تھا۔ اس رسم کے بعد ہی ان کی باقاعدہ شادی ہوتی تھی۔'' اوما نے نوالہ منہ میں رکھا۔ ''میں نے ان سے کہا ہے کہ اس قسم کی روایت میں تو ہوسکتا ہے کہ کچھ عورتیں واقعی نخرے نہ کر رہی ہوں۔''

زیتونی بولی، ''ہاں اوما، یہ اتنا برا نہیں تھا جتنا تم بتا رہی ہو۔ اگر شوہر برا سلوک کرتا تو لڑکی کبھی بھی اسے چھوڑ سکتی تھی۔''

''لیکن اگر وہ عورت اپنے باپ کا طے کیا ہوا رشتہ مسترد کر دیتی تو کیا ہوتا؟'' اوما نے پوچھا۔

زیتونی نے کندھے اچکائے، ''وہ خود کو اپنے گھر والوں کو رسوا کرتی۔''

''دیکھا نا؟'' اوما نے مڑ کر دادی سے کچھ پوچھا جس نے جواب میں اس کی بازو پر ہلکی سی چپت لگائی۔

''میں نے اس سے پوچھا ہے کہ کیا کوئی مرد کسی لڑکی کو زبردستی اٹھا کر لے جانے کے بعد رات کو اپنے ساتھ سونے پر مجبور کرتا تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ مرد کے جھونپڑے میں ہونے والی بات کا کسی کو بھی علم نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اس نے یہ بھی پوچھا ہے کہ کوئی مرد ایک گھونٹ چکھے بغیر سوپ کا پورا پیالہ لینے کی خواہش کیسے کرسکتا ہے۔'' اوما نے کہا۔

میں نے دادی سے پوچھا کہ ہمارے دادا سے شادی کے وقت اس کی عمر کیا تھا۔ سوال نے اسے اتنا مزہ دیا کہ اس نے ڈورسیلا کو بھی بتایا اور دونوں ہنسنے لگیں۔

اوما بولی، ''وہ ڈورسیلا سے کہہ رہی ہے کہ تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ اونیا گو نے جب اسے رجھایا تو وہ کتنے سال کی تھی۔''

دادی بتانے لگی کہ وہ شادی کے وقت سولہ برس کی تھی؛ ہمارا دادا اس کے بھائی کا دوست تھا۔

''اس زمانے میں زیادہ عمر کے آدمی سے شادی کرنا عام تھا۔ اس طرح خاندان ملتے اور پورا نیا گاؤں بس جاتا۔ آپ محبت کے متعلق کوئی بات نہیں کرتے تھے۔ اگر آپ کو اپنے شوہر سے محبت کرنا نہ آتی تو آپ اس کی اطاعت کرنا سیکھ لیتے تھے۔''

اس موقعہ پر اوما اور دادی کوئی طویل بات کرنے لگیں۔ دادی نے کچھ کہا اور دونوں دوبارہ ہنس پڑیں۔ اوما جھنجلا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور پلیٹیں اوپر نیچے رکھنے لگی۔

میں نے پریشان ہو کر پوچھا کہ دادی نے کیا کہا ہے؟

اوما کچھ غصے سے بولی: ''میں نے اس سے پوچھا تھا کہ ہماری عورتیں بڑوں کے طے کیے ہوئے رشتے کیوں قبول کر لیتی ہیں۔ مرد ہی ہمارے سارے فیصلے کرتے ہیں۔ بیویوں کو مارا جاتا ہے۔ پتا ہے، اس نے کیا جواب دیا؟ وہ کہتی ہے کہ اکثر عورتوں کو مار کی ضرورت ہوتی ہے، ورنہ وہ اپنے سے وابستہ امیدوں پر پورا نہیں اترتیں۔ دیکھا تم نے کہ ہمارا کیا حال ہے؟ ہم شکایت تو کرتی ہیں، لیکن اب بھی مردوں کو اکساتی ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ گھٹیا سلوک کریں۔ وہ دیکھو وہاں گوڈفرے بیٹھا ہے۔ دادی اور ڈورسیلا کے منہ سے یہ باتیں سن کر اس کے اپنے رویے پر کیا اثرات پڑیں گے؟''

دادی اوما کے الفاظ کا مطلب تو نہ سمجھ پائی، مگر وہ لہجے کی تیزی ضرور جان گئی تھی۔ وہ ایک دم سنجیدہ آواز میں اوما سے بولی۔

''اوما، تمہاری کہی ہوئی زیادہ تر باتیں درست ہیں۔ ہماری عورتوں نے بہت بھاری بوجھ اٹھایا ہے۔ اگر آپ مچھلی ہوں تو آپ کو اڑنے کی کوشش کرنے کی ضرورت نہیں...... آپ دوسری مچھلیوں کے ساتھ تیر سکتے ہیں۔ آپ جو جانتے ہیں بس وہی کچھ جانتے ہیں۔ شاید اگر آج میں جوان ہوتی تو ان چیزوں کو قبول نہ کرتی۔ شاید آج میں اپنے احساسات اور محبت وغیرہ پر زیادہ توجہ دیتی۔ لیکن جس دنیا میں میں نے پرورش پائی وہ اس جیسی نہیں تھی۔ جو کچھ میں نے دیکھا ہی نہیں اس کے لیے میرا دل دکھ محسوس نہیں کرتا۔''

میں دوبارہ چٹائی پر ہی دراز ہوگیا اور دادی کی کہی ہوئی بات پر غور کرنے لگا۔ اس میں ایک خاص قسم کی دانش موجود تھی؛ وہ ایک مختلف دور، ایک مختلف مقام کے متعلق بات کر رہی تھی۔ لیکن مجھے اوما کا غصہ بھی سمجھ آ گیا۔ دادا کی جوانی کی کہانی سننے پر میں خود بھی جھنجلاہٹ کا شکار ہوا تھا۔ میرے ذہن میں موجود اونیاگو کا دھندلا سا تصور ہمیشہ ایک جابر حاکم والا رہا تھا۔ لیکن میں نے اسے ایک خودمختار آدمی بھی تصور کیا تھا جس نے گوروں کی حکومت کی مخالفت کی۔ اب مجھے پتا چلا کہ اس تصور کی کوئی حقیقی بنیادیں نہیں تھی۔

اتنے میں سعید اور برنارڈ گھر سے باہر آئے۔ زیتونی نے اشارے سے انہیں پلیٹوں کی طرف جانے کو کہا۔ جب وہ کھانا کھانے بیٹھ گئے اور اوما دوبارہ پڑوسی لڑکی سے مینڈھیاں کروانے لگی تو دادی نے کہانی کا ٹوٹا ہوا سلسلہ دوبارہ جوڑا۔

> تمہارے دادا کے خیالات مجھے بھی ہمیشہ سمجھ نہیں آ جاتے تھے۔ یہ بہت مشکل کام تھا، کیونکہ وہ لوگوں کو اپنے متعلق بتانا پسند نہیں کرتا تھا۔ حتیٰ کہ اگر وہ آپ سے بات کر بھی لیتا تو کسی اور طرف دیکھتا رہتا تا کہ آپ اس کے اندر کی بات نہ جان سکیں۔ گوروں کے ساتھ بھی اس کا یہی رویہ تھا۔
>
> ایک روز وہ کوئی بات کہتا اور اگلے دن کچھ اور کہہ رہا ہوتا۔ میں جانتی ہوں کہ وہ گوروں کی طاقت، مشینوں، ہتھیاروں اور منظم زندگی کی وجہ سے ان کا احترام کرتا تھا۔ وہ کہتا کہ گورے ہمیشہ خود کو بہتر بنانے میں لگے رہتے ہیں، جبکہ افریقی ہر نئی چیز کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ مجھ سے کہتا، ”افریقی پر چربی چڑھی ہوئی ہے۔ اس سے کوئی کام لینے کے لیے اسے پیٹنے کی ضرورت ہوتی ہے۔“
>
> لیکن ان الفاظ کے باوجود میرا نہیں خیال کہ وہ گوروں کو افریقیوں سے پیدائشی طور پر برتر سمجھتا تھا۔ درحقیقت وہ گوروں کے طور طریقوں یا ان کے رسم و رواج کا احترام نہیں کرتا تھا۔ اس کے خیال میں ان کے بہت سے کام احمقانہ یا غیر منصفانہ تھے۔ خود اس نے کبھی کسی گورے سے مار نہ

کھائی۔ اسی لیے کئی نوکریوں سے ہاتھ دھوئے۔ اگر گورا مالک بہت زیادہ گالیاں دیتا تو وہ اسے لات مارتا اور نئی نوکری تلاش کرنے نکل کھڑا ہوتا۔ ایک مرتبہ کسی مالک نے اسے بید مارنے کی کوشش کی تو تمہارے دادا نے بید چھین کر اسے ہی پیٹ ڈالا۔ اس بنا پر اسے گرفتار کر لیا گیا، لیکن جب اس نے صورت حال بتائی تو حکام نے جرمانہ کیا اور تنبیہ کر کے چھوڑ دیا۔

تمہارا دادا اصل میں طاقت اور قوت کا احترام کرتا تھا۔ نظم و ضبط۔ اسی لیے وہ گوروں کے طور طریقے سیکھنے کے باوجود Luo روایت پر کاربند رہا اور ہمیشہ بزرگوں کا احترام کیا۔ اور اسی وجہ سے اس نے عیسائی مذہب کو مسترد کیا ہوگا۔ کچھ عرصہ کے لیے اس نے عیسائیت قبول بھی کی اور حتیٰ کہ اپنا نام بھی بدل کر جانسن رکھ لیا۔ لیکن اسے دشمنوں پر رحم کرنے یا یسوع مسیح کے ذریعے انسانی گناہوں کا کفارہ ادا ہونے جیسے خیالات کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ تمہارے دادا کی نظر میں یہ احمقانہ چیز تھی جس سے عورتوں کی ہی تشفی ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے اسلام قبول کر لیا...... اس کا خیال تھا کہ اسلامی عقائد اس کے عقائد سے زیادہ قریب تھے۔

دراصل اسی درشتی نے تمہارے دادا اور اکومو کے درمیان کئی مسئلے پیدا کیے۔ جب میں اس کے ساتھ رہنے کے لیے آئی تو وہ اونیاگو کے دو بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ پہلی بیٹی سارہ تھی۔ تین سال بعد تمہارا باپ بارک پیدا ہوا۔ میں اکومو کو اچھی طرح سے نہیں جانتی تھی کیونکہ وہ اور اس کے بچے کینڈو والے گھر میں حلیمہ کے ساتھ رہا کرتے تھے، جبکہ میں نیروبی میں اس کے ساتھ رہی۔ لیکن جب بھی تمہارے دادا کے ہمراہ کینڈو گئی تو اکومو کو ناخوش نہ پایا۔ وہ باغیانہ مزاج کی تھی اور اس نے اونیاگو کو بہت زیادہ تقاضے کرنے والا پایا۔ وہ ہمیشہ شکایت کرتا کہ اکومو گھر کا انتظام ٹھیک طرح سے نہیں چلاتی۔ بچوں کی پرورش کے سلسلے میں بھی وہ اس پر

بہت سختی کرتا۔ وہ اسے کہتا کہ بچوں کو پالنے میں رکھے اور انہیں نیروبی سے آئے ہوئے اچھے کپڑے پہنائے۔ بچوں کو ہر مرتبہ چھونے کے بعد مزید صاف کرنا پڑتا۔ حلیمہ اکومو کی مدد کرنے کی کوشش کرتی، اور بچوں کا یوں خیال رکھتی جیسے وہ اس کے اپنے ہوں، لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اکومو عمر میں مجھ سے صرف چند سال بڑی تھی، اور اسے بہت سی خوشیاں ملی تھیں۔ اور شاید اوما نے ٹھیک کہا..... شاید اس آدمی سے محبت کرتی تھی جس کے ساتھ اونیا گو سے پہلے اس کی شادی ہونے والی تھی۔

بہر حال، اس نے ایک سے زائد مرتبہ اونیا گو کو چھوڑ کر جانے کی کوشش کی۔ ایک مرتبہ سارہ اور دوسری مرتبہ بارک کی پیدائش کے بعد۔ اپنے غرور کے باوجود دادا نیا گو دونوں مرتبہ اسے لینے گیا، کیونکہ اسے یقین تھا کہ بچوں کو ماں کی ضرورت ہے۔ دونوں موقعوں پر اکومو کے گھر والوں نے اونیا گو کا ساتھ دیا، سو اس کے پاس واپسی کے سوا کوئی راہ نہ تھی۔ انجام کار اس نے خود سے وابستہ توقعات پر پورا اترنا سیکھ لیا۔ لیکن وہ خاموشی سے اپنی تلخی پیتی رہی۔

دوسری عالمی جنگ شروع ہونے پر اس کی زندگی کچھ آسان ہو گئی۔ تمہارا دادا انگریز کیپٹن کے خانساماں کی حیثیت میں سمندر پار گیا اور میں اکومو اور حلیمہ کے پاس آ گئی۔ کچھ عرصہ تک اونیا گو سے ملاقات نہ ہوئی۔ اس نے برطانوی رجمنٹوں کے ہمراہ دور دراز کے سفر کیے ...... برما اور سائیلون، عرب اور یورپ کے دیگر ممالک۔ تین سال بعد جب وہ واپس آیا تو ایک گراموفون اور ایک عورت کی تصویریں بھی ساتھ لایا جس کے متعلق اس نے بتایا کہ برما میں اس سے شادی کی تھی۔ دیوار پر لگی ہوئی وہ تصویریں اسی دور کی ہیں۔

اب اونیا گو کی عمر پچاس برس کے قریب تھی۔ وہ گوروں کی نوکری چھوڑنے

اور واپس کھیتوں میں آنے کا سوچنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ کینڈو کے آس پاس کی زمین میں آبادی اور چرائی ضرورت سے زیادہ تھی۔ سو اس کا خیال ایلیگو کی طرف گیا جہاں سے اس کا دادا اٹھ کر آیا تھا۔ ایک روز وہ اپنی بیویوں کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ ایلیگو جانے کی تیاری کریں۔ میں کم عمر اور آسانی سے مان جانے والی تھی۔ حلیمہ اور اکومو کو شدید دھچکا پہنچا۔ ان دونوں کے خاندان کینڈو میں تھے اور وہ وہاں رہنے کی عادی ہو چکی تھیں۔ بالخصوص حلیمہ کو ڈر تھا کہ نئی جگہ پر وہ بالکل تنہا ہو گی اور وہ تقریباً اونیا گو کی ہم عمر اور اولاد سے محروم تھی۔ چنانچہ اس نے جانے سے انکار کر دیا۔ شروع میں اکومو بھی نہ مانی، لیکن ایک مرتبہ پھر میکے والوں نے اسے شوہر اور بچوں کے ساتھ جانے پر آمادہ کر لیا۔

جب ہم ایلیگو میں پہنچے تو زیادہ تر زمین جھاڑیوں سے بھری ہوئی تھی اور ہم سب کے لیے زندگی نہایت دشوار تھی۔ لیکن تمہارے دادا نے نیروبی میں قیام کے دوران زراعت کے جدید طریقے سیکھے تھے اور یہاں ان علم کو عملی استعمال میں لایا۔ وہ کچھ بھی اگا سکتا تھا، اور ایک سال سے بھی کم عرصے میں اس نے اتنی فصل پیدا کر لی کہ منڈی میں فروخت کرنے کے قابل ہو گیا۔ اس نے زمین کو ہموار کر کے ایک وسیع لان بنایا، اور کھیتوں کو صاف کیا۔ اس نے آم اور کیلے کے درخت لگائے جو تم آج بھی دیکھتے ہو۔

حتیٰ کہ اس نے اپنے بہت سے مویشی بھی بیچ ڈالے کیونکہ اس کے خیال میں بہت زیادہ چرائی زمین کو غیر زرخیز بنا دیتی تھی۔ اس رقم سے اس نے اکومو، میرے اور اپنے لیے جھونپڑیاں بنائیں۔ وہ انگلینڈ سے اپنے ساتھ ایک کرسٹل سیٹ لایا تھا جسے شیلف پر سجایا۔ وہ اپنے گراموفون پر رات گئے عجیب و غریب گانے بجایا کرتا تھا۔ جب میرے پہلے بچے عمر اور زیتونی پیدا ہوئے تو وہ پالنے، گاؤن اور مچھر دانیاں لایا، بچے بابا اور

سارہ کے لیے بھی لایا تھا۔ باورچی خانے میں اس نے ایک چولہا بنایا جس میں روٹی اور کیک پکایا کرتا تھا۔

ایلیگو میں پڑوسیوں نے پہلے کبھی اس قسم کی چیزیں نہیں دیکھی تھیں۔ شروع میں انہیں اس پر شک ہوا اور اسے پاگل سمجھے ...... بالخصوص مویشی بیچنے پر۔ لیکن جلد ہی وہ اس کی فراخدلی کا احترام کرنے لگے۔ تمہارے دادا نے پڑوسیوں کو جڑی بوٹیوں سے علاج کا طریقہ بھی سکھایا۔ وہ اس کا غصہ بھی برداشت کرنے لگے، کیونکہ ان کے خیال میں وہ انہیں جادو ٹونے سے محفوظ رکھ سکتا تھا۔ اس زمانے میں لوگ اکثر روحانی معالجوں کے پاس جایا اور ان سے خوف کھایا کرتے تھے۔ مشہور تھا کہ وہ محبوب کو راغب کرنے اور دشمن کو ہلاک کرنے کے لیے بھی نسخے دیتے تھے۔ لیکن تمہارے دادا کو ان باتوں پر یقین نہیں تھا۔ اس نے کافی سفر کیا تھا اور بہت کچھ پڑھ رکھا تھا۔ وہ ان روحانی آدمیوں کو شعبدہ باز کہتا۔

ایک مرتبہ کسی نے اپنی پسند کی لڑکی کو حاصل کرنے کی خاطر ایک جادوگر کو بلوایا تو تمہارے دادا نے اس کا راستہ روک لیا اور کہا: ''اگر تم واقعی اتنے طاقت ور ہو تو مجھ پر بجلی گرا کر دکھاؤ۔'' جادوگر نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو اونیانگو نے اسے زمین پر گرایا اور سارے گنڈے تعویذ چھین لیے۔

اگلے دن بزرگوں کی مجلس میں مقدمہ پیش ہوا تو اونیانگو نے وہی پہلے والی دہرائی۔ بزرگ بھی روحوں سے خوف زدہ تھے۔ لیکن جب جادوگر کچھ نہ کر سکا تو اونیانگو نے اس سے کہا: ''جہاں سے آئے ہو وہیں واپس چلے جاؤ، کیونکہ اس گاؤں میں کوئی کسی کو ہلاک نہیں کر سکتا۔''

بزرگ ان باتوں پر تو رضامند ہو گئے۔ لیکن انہوں نے اصرار کیا کہ وہ جادوگر سے چھینا ہوا سوٹ کیس واپس کر دے، کیونکہ وہ خوامخواہ کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتے۔ اونیانگو بھی مان گیا اور اجلاس ختم ہونے پر جادوگر کو

اپنے جھونپڑے میں لایا۔ اس نے مجھے ایک مرغی ذبح کرنے کو کہا تاکہ جادوگر کو کھانا کھلایا جا سکے۔ اس نے جادوگر کو پیسے بھی دیے تاکہ ایلیگو آنا بے کار نہ جائے۔ لیکن جانے سے پہلے اس سے کہا کہ سوٹ کیس میں موجود تمام چیزوں کے خواص اسے سمجھائے۔

میرا خیال ہے کہ اگر اونیانگو ان میں سے کوئی نسخہ اکومو پر آزماتا تو تب بھی اسے خوش نہیں کر سکتا تھا۔ وہ چاہے اسے کتنا ہی مارتا مگر اکومو بد زبانی سے باز نہ آتی۔ وہ مجھ سے بھی جلتی اور نفرت کرتی تھی۔ اس کے ہاں تیسری اولاد بھی ہوئی جس کا نام اوما رکھا۔ اس نئے بچے کی دیکھ بھال کے دوران اس نے چوری چھپے فرار کا منصوبہ بنالیا۔ ایک رات کو وہ بارہ سالہ سارہ اور نو سالہ بارک کو چھوڑ کر چلی گئی۔ اس نے سارہ کو جگا کر بتایا کہ وہ کینڈو جا رہی ہے اور اتنا کٹھن سفر کرنا بچوں کے بس کی بات نہیں، لیکن بڑے ہونے پر وہ بھی وہیں آ جائیں۔ پھر وہ نومولود اوما کو لے کر تاریکی میں غائب ہو گئی۔

جب اونیانگو کو صورت حال کا پتا چلا تو بہت غصے میں آیا۔ شروع میں اس نے سوچا کہ اکومو کو چھوڑ ہی دے، لیکن نوعمر بارک اور سارہ کو دیکھ کر وہ دوبارہ کینڈو میں اکومو کے میکے گیا اور واپس چلنے کو کہا۔ لیکن اس مرتبہ میکے والوں نے انکار کر دیا۔ درحقیقت وہ اکومو کی دوسری شادی کے لیے جہیز وصول کر چکے تھے اور اکومو اپنے نئے شوہر کے ہمراہ تانگانیکا چلی گئی تھی۔

اونیانگو کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا، لہٰذا وہ ایلیگو واپس چلا آیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اب میں ہی ان سب بچوں کی ماں ہوں۔

اونیانگو کو یا مجھے سارہ سے اکومو کی آخری ملاقات کا علم نہ تھا۔ لیکن سارہ نے ماں کی ہدایات کو ذہن میں رکھا۔ ابھی چند ہفتے ہی گزرے تھے کہ اس نے آدھی رات کے وقت بارک کو جگایا اور خاموشی سے تیاری کرنے کو کہا۔ وہ

دونوں پیدل کینڈو جانے والی سڑک تک گئے۔ مجھے حیرت ہے کہ وہ دونوں زندہ کیسے بچ گئے۔ انہوں نے مسلسل دو ہفتے تک پیدل سفر کیا اور کھیتوں کے راستے گئے تاکہ سڑک پر کسی کی نظر نہ پڑ سکے۔ کینڈو کچھ ہی دور تھا کہ وہ راستہ بھول گئے۔ ایک عورت کو ان کی حالت دیکھ کر بہت ترس آیا۔ وہ انہیں اپنے ساتھ لے گئی اور کھانا کھلانے کے بعد نام پوچھے۔ جب اسے اندازہ ہوا کہ وہ کس کے بچے تھے تو تمہارے دادا کو بلوا بھیجا۔ اونیا گو آیا تو ان کی حالت دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ یہ واحد موقعہ تھا جب کسی نے بھی اسے روتے دیکھا۔

بچوں نے پھر کبھی بھاگنے کی کوشش نہ کی۔ لیکن میرے خیال میں انہوں نے اس سفر کو ہمیشہ یاد رکھا۔ سارہ ہمیشہ اونیا گو سے دور اور دل ہی دل میں اکوموکی وفادار رہی، کیونکہ وہ بڑی تھی اور شاید اپنی ماں کو باپ سے پٹتے ہوئے بھی دیکھ چکی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی ماں کی جگہ لینے کی وجہ سے مجھ سے بھی نفرت کرتی تھی۔ بارک کا رویہ مختلف تھا۔ وہ اپنے چھوڑے جانے کو معاف نہ کر سکا اور یوں ظاہر کرتا جیسے اکوموکا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ اس نے سب سے یہی کہا کہ میں اس کی ماں ہوں۔ اگرچہ وہ جوان ہونے پر ماں کو روپے بھیجا کرتا تھا، لیکن آخری دم تک اس کے ساتھ سرد مہری سے پیش آیا۔

عجیب بات یہ تھی کہ سارہ کی شخصیت اپنے باپ سے بہت ملتی تھی۔ نظم وضبط کی پابند، محنتی، آسانی سے غصے میں آجانے والی۔ جبکہ بارک اکوموجیسا جنگلی اور ضدی تھا۔ لیکن یقیناً آپ کو اپنے اندر اس قسم کی چیزیں نظر نہیں آیا کرتیں۔

جیسا کہ تم توقع کر سکتے ہو، اونیا گو کا رویہ اپنے بچوں کے ساتھ بہت سخت تھا۔ وہ ان سے محنت کرواتا اور گھر کے صحن سے باہر کھیلنے کی اجازت نہ

دیتا، کیونکہ اس کے مطابق دوسرے بچے گندے اور بدتمیز تھے۔ اونیا گو جب بھی کہیں جاتا تو میں ان ہدایات کو نظرانداز کر دیتی کیونکہ بچوں کا دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنا اسی طرح ضروری ہے جیسے کھانا اور سونا۔ لیکن میں نے تمہارے دادا کو کبھی پتا نہ لگنے دیا۔ میں اس کے واپس آنے سے پہلے پہلے بچوں کو نہلا دھلا کر بٹھا دیتی۔

بالخصوص بارک کے لیے یہ سب کچھ آسان نہیں تھا۔ وہ لڑکا بہت ہی خراب تھا! اونیا گو کی موجودگی میں وہ بڑا بھلا مانس اور مؤدب بنا رہتا، لیکن باپ کی کہی ہوئی کوئی بات نہ ٹالتا۔ لیکن اس کی عدم موجودگی میں جو دل میں آتا کرتا۔ جب اونیا گو کام کے سلسلے میں کہیں جاتا تو بارک موزوں کپڑے اتار کر دوسرے لڑکوں کے ساتھ کشتی کرنے یا دریا میں تیرنے یا پڑوسی کے درختوں سے پھل چرانے جاتا۔ پڑوسی براہ راست اونیا گو سے شکایت کرتے ہوئے ڈرتے تھے، چنانچہ وہ میرے پاس آتے۔ لیکن میں بارک پر غصہ نہیں کر سکتی تھی، کیونکہ اسے اپنے بیٹے کی طرح چاہتی تھی۔

تمہارے دادا نے کبھی اپنی محبت ظاہر تو نہ کی مگر وہ بارک سے واقعی بہت پیار کرتا تھا کیونکہ وہ لڑکا بہت ہوشیار تھا۔ بچپن میں اونیا گو اسے اے بی سی اور اعداد سکھایا کرتا تھا، اور جلد ہی بیٹے نے باپ کو ان چیزوں میں پیچھے چھوڑ دیا۔ اونیا گو بہت خوش ہوا کیونکہ اس کی نظر میں گوروں کی طاقت کا راز علم میں تھا، اور وہ اپنے بیٹے کو بھی گوروں جیسا تعلیم یافتہ بنانا چاہتا تھا۔ اسے سارہ کی تعلیم کی زیادہ فکر نہ تھی، مگر وہ بھی بارک کی طرح بڑی سمجھدار نکلی۔ بیشتر لوگوں کے خیال میں بیٹیوں کو پڑھانا رقم ضائع کرنے کے مترادف تھا۔ جب سارہ نے پرائمری پاس کر لی تو آگے پڑھنے کے لیے اونیا گو سے فیس مانگنے آئی۔ اس نے سارہ سے کہا، ''تم نے کل کو اگلے گھر چلے جانا ہے تو میں تمہارے اوپر خرچ کیوں کروں؟ جاؤ اپنی ماں کا ہاتھ

بٹاؤ اور گھرداری سیکھو۔"

اس چیز نے سارہ اور اس کے چھوٹے بھائی کے درمیان مزید بگاڑ پیدا کر دیا۔ بارک کے لیے حالات بہت سازگار رہے۔ وہ قریبی مشن سکول میں گیا، لیکن وہ واپس آیا اور کہنے لگا کہ وہاں نہیں پڑھ سکتا، کیونکہ اس کی کلاس کو ایک عورت پڑھاتی تھی اور وہ کلاس میں سکھائی جا رہی تمام چیزیں پہلے سے جانتا تھا۔ اس نے یہ رویہ اپنے باپ سے سیکھا، لہٰذا اونیا گو کچھ نہ بولا۔ دوسرا قریب ترین سکول چھ میل کے فاصلے پر تھا۔ وہاں مرد استاد تھا، لیکن بارک کو اپنا مسئلہ حل ہوتا نظر نہ آیا۔ اسے ہمیشہ جواب پہلے سے معلوم ہوتا اور کبھی کبھی ساری کلاس کے سامنے ٹیچر کی تصحیح بھی کر دیتا۔ استاد نے بارک کو جھڑکا مگر وہ نہ مانا۔ اس وجہ سے اسے ہیڈ ماسٹر سے کافی مار کھانا پڑی۔ لیکن ضرور اس نے کچھ سبق بھی سیکھا ہوگا، کیونکہ اگلے ہی سال جب وہ ایک استانی کی کلاس میں گیا تو کوئی اعتراض نہ کیا۔

پھر بھی وہ سکول سے اکتایا ہوا تھا۔ کچھ بڑا ہونے پر وہ کئی ہفتے سکول نہ جاتا۔ امتحانات سے چند ہفتے پہلے وہ کسی ہم جماعت کو بلاتا اور سارے سبق پڑھ لیتا۔ وہ چند دن کے اندر اندر ہر چیز یاد کر لینے کے قابل تھا، اور جب نتیجہ آتا تو وہ ہمیشہ اول پوزیشن پر ہوتا۔ چند بار جب وہ اول نہ آسکا تو روتا ہوا میرے پاس آتا، کیونکہ وہ بہترین کارکردگی دکھانے کا عادی تھا۔ لیکن ایسا صرف ایک یا دو بار ہوا...... عام طور پر وہ ہنستا اور خوشی سے چلاتا ہوا ہی گھر واپس آتا۔

بارک اپنے ہم جماعتوں کے سامنے کبھی تکبر نہ کرتا اور بڑے اچھے طریقے سے پیش آتا۔ اس کی شیخیاں کسی ایسے بچے جیسی تھیں جو اپنی دوسروں سے زیادہ تیز بھاگنے یا بہتر شکار کرنے کی اہلیت سے آگاہ ہو۔ لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ دوسرے لڑکے اس بات پر رنجیدہ ہو سکتے ہیں۔ جوان ہونے

پر بھی وہ ان باتوں کو نہ سمجھ پایا۔ وہ بار یا کسی ریسٹورنٹ میں اپنے کسی ہم جماعت کو دیکھتا جو اب وزیر یا بزنس مین بن چکا ہوتا، اور سب کے سامنے کہنے لگتا کہ ان کے خیالات کس قدر احمقانہ تھے۔ وہ ان سے کہتا، ''اوئے، مجھے یاد ہے کہ میں نے تمہیں ریاضی سکھائی تھی۔ تم اتنے بڑے آدمی کیسے بن سکتے ہو؟'' پھر وہ ہنستا اور انہیں بیئر پلاتا۔ وہ لوگ منہ سے تو کچھ نہ کہتے مگر دل میں ضرور برا مناتے۔

جب تمہارا باپ جوان ہوا تو کینیا میں حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ بہت سے افریقی دوسری عالمی جنگ میں لڑ چکے تھے۔ انہوں نے اسلحہ استعمال کیا تھا اور برما فلسطین میں کافی اچھی کارکردگی دکھائی تھی۔ انہوں نے گوروں کو اپنے ہی لوگوں کے ساتھ لڑتے ہوئے دیکھا، وہ گوروں کے ساتھ ہلاک ہوئے اور خود بھی بہت سے گورے مارے۔ انہیں پتا چلا تھا کہ افریقی بھی گوروں کی مشینیں چلا سکتا تھا اور امریکہ سے آئے ہوئے کالوں سے ان کی ملاقاتیں ہوئیں جو جہاز اڑاتے اور سرجری بھی کرتے تھے۔ جب وہ واپس کینیا آئے تو نئی معلومات دوسروں کو بتانے کے لیے بے قرار تھے۔ اب وہ گوروں کی حکومت سے مطمئن نہیں تھے۔

لوگ آزادی کی باتیں کرنے لگے۔ جلسے اور مظاہرے منعقد کیے جاتے۔ انتظامیہ کے نام شکایتی درخواستوں میں زمین کی ضبطگی اور سرداروں کی بدعنوانیوں کے متعلق بتایا جاتا۔ حتیٰ کہ مشن سکولوں میں تعلیم حاصل کرنے والے افریقیوں نے بھی اپنے گرجا گھروں کے خلاف بغاوت کر دی اور گوروں پر الزام لگایا کہ وہ ہر افریقی کو ذلیل کر کے عیسائیت کو بدنام کر رہے ہیں۔ پہلے کی طرح اب بھی اس ساری سرگرمی کا مرکز Kikuyu سرزمین تھی کیونکہ اس قبیلے پر گوروں کا بوجھ سب سے زیادہ پڑا تھا۔ لیکن Luo لوگ بھی استحصال کا شکار تھے اور بہت سوں کو جبری مشقت پر لگایا گیا

تھا۔ ہمارے علاقے کے لوگ کی کویو لوگوں کے ساتھ مل کر مظاہرے کرنے لگے۔ بعد میں جب انگریزوں نے ایمرجنسی نافذ کرنے کا اعلان کیا تو بہت سے آدمیوں کو حراست میں لے لیا گیا، اور کچھ ایک دوبارہ کبھی نظر نہ آئے۔

دوسرے لڑکوں کی طرح تمہارے باپ نے بھی خودمختاری کے متعلق باتوں کا اثر قبول کیا۔ وہ سکول سے واپس آتا تو راستے میں دیکھے ہوئے جلسوں کے متعلق بتانے لگتا۔ تمہارا دادا ابتدائی سیاسی جماعتوں (مثلاً KANU) کے بہت سے مطالبات کے ساتھ متفق تھا، لیکن تحریک آزادی کا کوئی نتیجہ برآمد ہونے کے متعلق ہمیشہ متشکک رہا، کیونکہ اس کے خیال میں افریقی کبھی بھی گوروں کی فوج سے جیت نہیں سکتے تھے۔ وہ بارک سے کہتا، ''کوئی افریقی کسی گورے کو کیسے شکست دے سکتا ہے، جبکہ وہ اپنی بائیسکل بھی خود نہیں بنا سکتا؟'' وہ کہتا کہ افریقی لوگ گوروں کے خلاف اس لیے بھی نہیں جیت سکتے کیونکہ وہ صرف اپنے خاندان یا قبیلے کے لیے کام کر سکتے ہیں۔ اونیاگو کہتا، ''گورا اکیلے میں کسی چیونٹی کی طرح ہے۔ اسے بہ آسانی کچلا جا سکتا ہے۔ لیکن گورے چیونٹیوں کی طرح ہی مل کر کام کرتے ہیں۔ ان کی قوم، ان کا کاروبار یہ چیزیں ان کے لیے خود اپنے آپ سے بھی زیادہ اہم ہیں۔ گورا اپنے قائد کی پیروی کرتا ہے اور سوال نہیں اٹھاتا۔ سیاہ فام اس طرح کے نہیں۔ احمق ترین سیاہ فام بھی خود کو دانشمند سے بہتر سمجھتا ہے۔ اسی لیے سیاہ فام کو ہمیشہ شکست ہو گی۔''

اس طرز عمل کے باوجود ایک مرتبہ تمہارا دادا بھی گرفتار ہوا۔ ضلعی کمشنر کے لیے کام کرنے والا ایک افریقی تمہارے باپ کی زمینوں سے جلتا تھا۔ ایک بار تمہارے دادا نے اس کی سرزنش کی تھی کہ وہ زیادہ محصول وصول کرتا اور اپنی جیب بھرتا ہے۔ ایمرجنسی کے دوران اس آدمی نے اونیاگو کا

نام KANU کے حامیوں کی فہرست میں شامل کر دیا اور گورے کو بتایا کہ وہ بہت خودسر تھا۔ ایک روز گورے کا عسکری اونیاگو کو لینے آیا اور اسے قیدیوں کے ایک کیمپ میں رکھا گیا۔ انجام کار اس کا مقدمہ زیر سماعت آیا اور وہ بے گناہ نکلا۔ لیکن تب تک چھ ماہ گزر چکے تھے۔ وہ ایلیگو واپس آیا تو بہت کمزور اور گندا نظر آ رہا تھا۔ اسے چلنے میں مشکل ہو رہی تھی اور سر جوؤں سے بھرا ہوا تھا۔ شرم کے مارے اس نے گھر میں آنے یا ہمیں صورت حال کے متعلق بتانے سے انکار کر دیا۔ اس کے بجائے اس نے مجھے کہا کہ پانی گرم کروں اور استرا لا کر دوں۔ اس نے اپنے بال صاف کیے۔ میں کافی دیر تک اسے نہانے میں مدد دیتی رہی۔ بالکل اسی جگہ پر جہاں تم بیٹھے ہو۔ اور اس روز کے بعد وہ مجھے بوڑھا لگنے لگا۔

اس وقت بارک کہیں گیا ہوا تھا۔ اسے بعد میں گرفتاری کا پتا چلا۔ اس نے ضلعی امتحان دیا تھا اور کوئی پچاس میل جنوب کی طرف ماسینو کے مشن سکول میں داخل ہو گیا تھا۔ یہ بارک کے لیے بڑے اعزاز کی بات ہو گی کیونکہ چند ایک افریقیوں کو ہی سیکنڈری تعلیم حاصل کرنے کی اجازت تھی، اور بہترین طالب علم ہی ماسینو جا سکتے تھے، لیکن تمہارے باپ کی باغیانہ فطرت نے سکول میں کافی مسائل پیدا کیے۔ وہ چھپ چھپا کر لڑکیوں کے پیچھے ڈارمیٹری میں گھس جاتا۔ وہ ہمیشہ ان کے ساتھ بڑی میٹھی باتیں کرتا اور انہیں اونچے اونچے خواب دکھاتا۔ وہ اور اس کے دوست قریبی فارم سے مرغیاں اور شکرقندی چوری کر کے لاتے کیونکہ انہیں ڈارمیٹری کا کھانا پسند نہیں تھا۔ سکول میں استادوں کو ان حرکتوں کا علم نہ ہوتا کیونکہ وہ بڑا ہوشیار تھا۔ آخر کار بارک حد سے بڑھ گیا اور اسے سکول سے نکال دیا گیا۔

خبر ملنے پر اونیاگو اس قدر غضب ناک ہوا کہ بارک کو چھڑی سے مار مار کر

لہولہان کر دیا۔لیکن بارک بھاگا اور نہ ہی رویا، حتیٰ کہ کوئی وضاحت بھی
پیش نہ کی۔آخر کار اونیا گو نے بارک سے کہا، ''اگر تم میرے گھر میں ٹھیک
طرح سے نہیں رہ سکتے تو مجھے تم سے کوئی لینا دینا نہیں!'' اگلے ہفتے اونیا گو
نے بارک کو بتایا کہ اس نے اسے ساحل پر بھجوانے کا انتظام کیا ہے جہاں
وہ بطور کلرک کام کرے گا۔ اس نے کہا، ''اب تمہیں تعلیم کی اہمیت کا
احساس ہوگا۔اب میں دیکھتا ہوں کہ تم روزی کماتے ہوئے کیسے مزے
کرتے ہو۔''

بارک کے پاس اطاعت کے سوا کوئی راہ نہیں تھی۔وہ موم باسا گیا اور ایک
عرب تاجر کے دفتر میں ملازمت شروع کر دی۔لیکن تھوڑے ہی عرصے
بعد اس کا عرب سے جھگڑا ہوا اور وہ اپنی تنخواہ لیے بغیر چلا گیا۔اس نے
احساس غیرت کے باعث اپنے باپ سے بھی مدد نہ مانگی اور نہ ہی اپنی
غلطی تسلیم کی۔بہر حال، بات اونیا گو تک پہنچی اور جب بارک ملنے کے
لیے گھر آیا تو وہ اس پر چلایا اور اسے بالکل بے کار قرار دیا۔بارک نے
اونیا گو کو بتانے کی کوشش کی کہ ایک نئی نوکری اس پہلے والی نوکری کی نسبت
کہیں زیادہ فائدہ مند تھی۔اس نے کہا کہ وہ ہر ماہ ایک سو پچاس شلنگ کما
رہا تھا۔سو اونیا گو بولا: ''ذرا اپنی تنخواہ والی کتاب دکھاؤ۔دیکھوں تو سہی کہ
کیا تم واقعی اتنے امیر ہو گئے ہو۔'' جب بارک کچھ نہ بولا تو اونیا گو کو معلوم
ہو گیا کہ بیٹے نے اس سے جھوٹ کہا ہے۔وہ سیدھا اپنے جھونپڑے میں
گیا اور بارک سے کہا کہ وہ چلا جائے کیونکہ وہ باپ کے لیے شرم کا باعث
ثابت ہوا ہے۔

بارک نیروبی چلا گیا اور ریلوے میں بطور کلرک ملازمت کرنے لگا۔لیکن
اس کا دل اکتا گیا، اور وہ جلد ہی ملکی سیاست ہی دلچسپی لینے لگا۔کیکویو
لوگوں نے جنگلوں میں لڑائی شروع کر دی تھی۔ہر طرف ریلیاں نکالی گئیں

جن میں کینیا تا کی جیل سے رہائی کا مطالبہ کیا جاتا۔بارک بھی کام کے
بعد سیاسی جلسوں میں جانے لگا اور KANU قیادت سے اس کی شناسائی
ہوئی۔ایسے ہی ایک جلسے میں پولیس آ گئی اور بارک اجتماع کے قوانین کی
خلاف ورزی کرنے کے جرم میں گرفتار ہوا۔اسے جیل ہو گئی۔اس نے
باپ کو پیغام بھجوایا کہ اسے ضمانت کے لیے رقم چاہیے۔لیکن اونیا گو نے
بارک کو رقم دینے سے انکار کر دیا اور مجھ سے کہنے لگا کہ بیٹے کو اچھی طرح
سبق سیکھنے کی ضرورت ہے۔

بارک چند دن میں ہی رہا ہو گیا کیونکہ وہ KANU کا رکن نہیں تھا۔لیکن
اسے کوئی خوشی نہ ہوئی۔کیونکہ وہ سوچنے لگا کہ شاید باپ کی کہی ہوئی بات
درست ہی ہو...... کہ وہ نکما تھا۔وہ بیس سال کا ہو چلا تھا اور اس کے پاس
تھا کیا؟ اسے ریلوے کی ملازمت سے نکال دیا گیا تھا۔وہ اپنے باپ سے
بیگانہ ہو چکا تھا، نہ جیب میں پیسے تھے اور نہ کوئی مستقبل کی امید۔لیکن اب
ایک بیوی اور ایک بچہ تھا۔وہ اٹھارہ سال کی عمر میں کیزیا سے ملا۔وہ اس
وقت کینڈو میں اپنے خاندان کے ساتھ رہتی تھی۔بارک کیزیا کے حسن پر
مر مٹا اور تھوڑا عرصہ عشق بازی کے بعد اس سے شادی کا فیصلہ کر لیا۔اسے
معلوم تھا کہ باپ کبھی بھی جہیز کے لیے رقم نہیں دے گا۔چنانچہ اس نے
مجھ سے سفارش کرنے کو کہا۔شروع میں تو اونیا گو نے انکار کیا اور سارہ بھی
نہ مانی جو پہلے شوہر کی وفات کے بعد واپس ایلیگو آ گئی تھی۔سارہ نے
تمہارے دادا سے کہا کہ کیزیا بس خاندان کی دولت پر نظریں جمائے
ہوئے تھی۔لیکن میں نے اونیا گو سے کہا کہ بارک کا جہیز کے لیے کسی
رشتے دار سے پیسے مانگتے پھرنا اچھی بات نہیں کیونکہ سب کو معلوم ہے کہ
ہم کھاتے پیتے لوگ ہیں۔اونیا گو کو میری بات سچی لگی اور وہ مان گیا۔
بارک اور کیزیا کی شادی کے ایک سال بعد رائے پیدا ہوا۔دو سال بعد اوما

دنیا میں آئی۔

گھر کا خرچ چلانے کے لیے بارک کو کوئی نہ کوئی کام تلاش کرنا تھا۔ آخر کار اس نے ایک اور عرب کے پاس آفس بوائے کے طور پر نوکری کر لی۔ لیکن بارک بہت پریشان حال اور بے قرار رہا۔ ماسینو میں اس کے بہت سے ہم عمر یوگنڈا کی Makarere یونیورسٹی میں جا چکے تھے۔ کچھ ایک تو لندن بھی پڑھنے گئے۔ آزاد کینیا میں واپس آ کر وہ بڑی بڑی نوکریوں کی توقع کر سکتے تھے۔ بارک نے دیکھا کہ ساری زندگی ان لوگوں کا کلرک بن کر ہی گزار دے گا۔

تب خوش قسمتی نے دو امریکی عورتوں کی صورت میں دروازہ کھٹکھٹایا۔ میرے خیال میں وہ کسی مذہبی تنظیم کی طرف سے نیروبی میں پڑھا رہی تھیں۔ ایک روز وہ بارک والے دفتر میں آئیں۔ تمہارے باپ نے ان کے ساتھ گفتگو کی اور جلد ہی وہ اس کی دوست بن گئیں۔ انہوں نے اسے پڑھنے کے لیے کتابیں دیں اور جب دیکھا کہ وہ کافی ہوشیار ہے تو اسے کسی یونیورسٹی میں داخلہ لینے کو کہا۔ بارک نے بتایا کہ اس کے پاس رقم اور نہ ہی سیکنڈری سکول کا سرٹیفکیٹ ہے۔ لیکن ان عورتوں نے کہا کہ وہ اس کے لیے مراسلاتی کورس کا انتظام کر دیتی ہیں جس کے ذریعے اسے مطلوبہ سرٹیفکیٹ مل جائے گا، اور اگر وہ کامیاب ہو گیا تو اسے امریکہ کی کسی یونیورسٹی میں داخلہ لینے میں مدد دیں گی۔

بارک جوش سے بھر گیا اور فوراً مراسلاتی کورس کی درخواست بھیج دی۔ زندگی میں پہلی بار اس نے دل لگا کر کام کیا۔ ہر رات کو اور کھانا کھانے کے دوران بھی وہ اپنی کتابیں پڑھتا رہا۔ چند ماہ بعد وہ امریکی سفارت خانے میں امتحان دینے گیا۔ نتیجہ آنے میں کئی ماہ لگے۔ اس دوران وہ پریشانی کے مارے کچھ کھانا پینا تک بھول گیا۔ وہ اتنا دبلا ہو گیا کہ ہمیں

اس کے بچنے کی امید نہ رہی۔ ایک روز خط آیا۔ میں اس وقت قریب موجود نہ تھی۔ جب اس نے مجھے بتایا تو خوشی سے چلا رہا تھا۔

مگر اب بھی اس کے پاس رقم نہیں تھی۔ اونیا گو اپنے بیٹے کو محنت کرتے دیکھ کر کچھ نرم دل ہو گیا تھا، لیکن یونیورسٹی کی فیس اور باہر جانے کا کرایہ ادا کرنے کے لیے اس کے پاس بھی رقم نہیں تھی۔ گاؤں کے کچھ لوگوں نے مدد کرنا چاہی، لیکن زیادہ تر کو ڈر تھا کہ بارک ان کی رقم لے کر چلا جائے گا اور کبھی واپس نہیں آئے گا۔ چنانچہ بارک نے امریکہ میں یونیورسٹیوں کو خط لکھے۔ وہ لکھتا رہا اور لکھتا رہا۔ انجام کار، ہوائی کی ایک یونیورسٹی نے جواب دیا اور بتایا کہ اسے سکالر شپ مل سکتا ہے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ہوائی کہاں ہے، لیکن بارک کو کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ اپنی حاملہ بیوی اور بیٹے کو میرے پاس لایا اور ایک ماہ کے اندر اندر چلا گیا۔

امریکہ میں کیا ہوا، میں نہیں جانتی۔ بس اتنا پتا ہے کہ دو سال بعد ایک خط کے ذریعے بارک نے بتایا کہ وہ ایک امریکی لڑکی این سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ باری! تم نے سنا ہو گا کہ تمہارے دادا نے شادی کو نامنظور کیا تھا۔ یہ درست ہے، لیکن وجہ کچھ اور تھی۔ دیکھو، اونیا گو کا خیال تھا کہ تمہارا باپ ٹھیک نہیں کر رہا۔ اس نے بارک کو جواب میں لکھا: ”گھر میں ذمہ داری موجود ہوتے ہوئے تم اس گوری عورت سے کیسے شادی کر سکتے ہو؟ کیا وہ عورت تمہارے ساتھ واپس آ کر Luo عورت بن کر رہے گی؟ کیا وہ تسلیم کر لے گی کہ تمہاری پہلے سے ایک بیوی اور بچہ ہے؟ میں نے گورے لوگوں کو ایسے کرتے نہیں دیکھا۔ ان کی عورتیں حاسد ہیں اور نخرے کرتی ہیں۔ لیکن اگر اس معاملے میں میری بات غلط ہے تو لڑکی کا باپ میرے جھونپڑے میں آئے اور بات کرے۔ کیونکہ یہ بڑوں کے معاملات ہیں، بچوں کے نہیں۔“ اس نے تمہارے نانا سٹینلے کو بھی خط لکھا اور اسی قسم کی

باتیں کہیں۔

جیسا کہ تم جانتے ہو، تمہارے باپ نے شادی کر لی۔ تمہاری پیدائش کے بعد کی صورت حال اس نے صرف اونیا گو کو بتائی۔ ہم سب خوش ہیں کہ یہ شادی ہوئی، کیونکہ اس کے بغیر تم اس وقت ہمارے پاس نہ ہوتے۔ لیکن اس وقت تمہارا دادا بہت ناراض تھا اور بارک کا ویزا منسوخ کروانے کی دھمکی دی۔ شاید اونیا گو گوروں کے ساتھ زندگی گزارنے کی وجہ سے سمجھتا تھا کہ وہ گوروں کے رسم و رواج کی تفہیم بارک کی نسبت زیادہ رکھتا تھا۔ یونا۔ جب بارک کینیا واپس آیا تو ہمیں پتا چلا کہ تم اور تمہاری ماں وہیں رہ گئے ہو، اور اونیا گو نے اسی بات سے خبردار کیا تھا۔

بارک کی آمد کے کچھ ہی عرصہ بعد ایک گوری عورت اس کی تلاش میں کیسومو آئی۔ پہلے ہم نے سوچا کہ وہ تمہاری ماں این ہوگی۔ بارک کو وضاحت کرنا پڑی کہ وہ کوئی دوسری عورت روتھ تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ ہارورڈ میں اس سے ملی تھی اور بتائے بغیر پیچھے کینیا تک چلی آئے۔ تمہارے دادا کو اس کہانی پر یقین نہ آیا اور سوچا کہ بارک نے ایک مرتبہ پھر نافرمانی کی ہے۔ بارک روتھ سے شادی کرتے ہوئے ہچکچایا۔ معلوم نہیں کہ وہ بالآخر مان کیسے گیا۔ شاید اس نے محسوس کیا کہ روتھ اس کی نئی زندگی میں زیادہ موزوں تھی۔ یا اس نے سن لیا ہوگا کہ پیچھے سے کیزیا نے خوب مزے اڑائے تھے، حالانکہ میں نے ان باتوں کو محض افواہ قرار دے دیا تھا۔

وجہ چاہے کچھ بھی ہو، لیکن روتھ کیزیا کے ساتھ دوسری بیوی بن کر رہنا قبول نہیں کر سکتی تھی۔ اسی لیے بچے اپنے باپ اور نئی ماں کے پاس نیروبی چلے گئے۔ جب بارک اوما اور رائے کو ہم سے ملوانے لاتا تو روتھ ساتھ نہ آتی اور نہ ہی ڈیوڈ یا مارک کو آنے دیتی۔ اونیا گو نے بارک کے ساتھ براہ

راست اس بارے میں بات نہ کی۔ لیکن وہ بارک کو سنانے کے انداز میں اپنے دوستوں سے کہتا، ''میرا بیٹا بڑا آدمی ہے، لیکن جب وہ گھر آتا ہے تو بیوی کے بجائے ماں کو اس کے لیے کھانا پکانا پڑتا ہے۔''

دوسرے لوگوں نے تمہیں بتایا ہوگا کہ نیروبی میں تمہارے باپ کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔ ہم کبھی کبھار ہی اس سے ملتے اور وہ بہت کم وقت ٹھہرتا۔ وہ ہمیشہ ہمارے لیے مہنگے تحفے اور پیسے لاتا۔ لوگ اس کی بڑی سی کار اور عمدہ کپڑے دیکھ کر بہت متاثر ہوتے۔ لیکن تمہارا دادا متواتر اس کے ساتھ سختی سے پیش آتا رہا، کہ جیسے وہ بچہ ہو۔ اونیا گو بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ وہ چھڑی کے سہارے چلتا اور بمشکل ہی کچھ دیکھ پاتا تھا۔ وہ میری مدد کے بغیر غسل بھی نہ کر سکتا جس پر اسے ضرور شرم آتی ہوگی۔ لیکن بڑھاپے نے اس کی تیز مزاجی پر کوئی اثر نہ ڈالا۔

بعد میں جب بارک کے حالات خراب ہوئے تو وہ بوڑھے سے اپنے مسائل چھپانے کی کوشش کرتا۔ وہ گنجائش نہ ہونے کے باوجود تحائف لاتا۔ البتہ ہم نے نوٹ کیا کہ وہ اب کار کے بجائے ٹیکسی میں آتا تھا۔ اپنی ناخوشی اور مایوسی کے متعلق وہ صرف میرے ساتھ بات کیا کرتا تھا۔ میں اسے کہتی کہ حکومت کے ساتھ معاملات میں اتنی ہٹ دھرمی نہ دکھایا کرے۔ وہ میرے ساتھ اصولوں کی بات کرتا، اور میں کہتی کہ اس کے اصول بچوں کو بہت مہنگے پڑیں گے۔ وہ کہتا کہ میں نہیں سمجھ سکتی، بالکل اسی طرح جیسے اس کا باپ کہا کرتا تھا۔ چنانچہ میں نے کچھ کہنا چھوڑ دیا اور بس سنتی رہتی۔

میرے خیال میں بارک کو اسی چیز کی سب سے زیادہ ضرورت تھی...... کوئی سننے والا شخص۔ حالات بہتر ہو جانے اور ہمارے لیے یہ نیا گھر بنا لینے کے باوجود اس کا دل بوجھل رہا۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ اسی طرح پیش آتا

جیسے اونیاگو اس کے ساتھ پیش آیا کرتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ بچے دور ہو رہے ہیں، لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اب بھی آدمیوں کے ساتھ بیٹھ کر ہنسی مذاق اور شراب نوشی پسند کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے جب وہ اونیاگو کی وفات سے پہلے آخری مرتبہ اس سے ملنے آیا تھا۔ دونوں کرسیوں پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے، بالکل خاموشی سے۔ چند ماہ بعد جب اونیاگو اپنے بزرگوں کے پاس چلا گیا تو بارک نے گھر آ کر تمام انتظامات کیے۔ وہ بہت کم بولا۔ تبھی میں نے اسے بوڑھے کی چیزیں دیکھنے کے دوران روتے ہوئے دیکھا۔

دادی نے کھڑے ہو کر اپنی سکرٹ کو جھاڑا۔ صحن میں حبس ہو رہا تھا۔ ایک پرندے کی تیز آواز نے خاموشی کا پردہ چاک کیا۔ "بارش ہونے والی ہے" دادی نے کہا۔ ہم سب نے اپنی چٹائیاں اور کپ اکٹھے کیے اور گھر کے اندر لے گئے۔

اختتامیہ

میں نے مزید دو ہفتے کینیا میں قیام کیا۔ ہم سب واپس نیروبی آ گئے جہاں مزید دعوتیں، باتیں اور کہانیاں میری منتظر تھیں۔ دادی اوما کے کمرے میں ٹھہری۔ میں ہر رات اُن کی سرگوشیاں سنتے سنتے سو جاتا۔ ایک دن ہم سب گروپ فوٹو بنوانے کے لیے سٹوڈیو میں اکٹھے ہوئے۔ تمام خواتین نے شوخ نیلے، سبز اور پیلے رنگ کے لباس پہن رکھے تھے اور مرد شیو کروا کر صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس تھے۔ مجھے آج بھی موٹی بھنووں والے انڈین فوٹوگرافر کا جملہ یاد ہے کہ یہ بہت ہی خوبصورت تصویر ہے۔

کچھ ہی دن بعد رائے واپس واشنگٹن ڈی سی اور دادی گھر چلی گئی۔ اچانک دن بہت خاموش ہو گئے، اوما اور مجھ پر اداسی چھا گئی، یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اب میں خواب سے بیدار ہو رہا ہوں۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ہمیں احساس ہو رہا تھا کہ ہم بھی اب جلد ہی اپنی اصل زندگیوں کی طرف لوٹ جائیں گے، ایک بار پھر علیحدہ اور جدا۔ اس وجہ سے ہم نے اپنے والد کے آخری بیٹے جارج سے ملنے کا فیصلہ کیا۔

یہ ایک دردناک تجربہ رہا۔ ماں کی اجازت کے بغیر افراتفری میں یہ منصوبہ تیار کیا گیا، ہم زیتونی کے ساتھ گاڑی میں صاف ستھرے ایک منزلہ سکول ہاؤس پہنچے۔ وہاں سکول کے بہت سے بچے ایک ہرے بھرے میدان میں کھیل رہے تھے۔ آدھی چھٹی کے نگران استاد سے تھوڑی بہت بات چیت کے بعد زیتونی ایک بچے کو ہمارے پاس لے کر آئی۔ وہ ایک گول سر والا خوبصورت بچہ

تھا۔اس کی آنکھوں میں ہوشیاری عیاں تھی۔زیٹونی نے جھک کر اوما اور میری طرف اشارہ کیا۔

اُس نے بچے سے کہا،"یہ تمہاری بہن ہے، جو بچپن میں تمہیں اپنے گھٹنے پر بٹھا کر کھلاتی تھی۔ یہ تمہارا بھائی ہے جو امریکہ سے اتنا لمبا سفر طے کر کے تم سے ملنے آیا ہے۔"

بچے نے بہت پُر اعتماد انداز میں ہم سے ہاتھ ملایا مگر اُس کی نظریں میدان میں ہونے والے کھیل پر ہی لگی تھیں جس کو وہ ہماری خاطر چھوڑ کر آیا تھا۔اُس وقت مجھے محسوس ہوا کہ ہم نے یہاں آ کر غلطی کی ہے۔جلد ہی سکول کی پرنسپل یہ کہنے کے لیے اپنے کمرے سے نمودار ہوئی کہ ہمارے پاس ماں کی طرف سے بچے کو ملنے کی اجازت نہیں ہے،اس لیے ہمیں یہاں سے جانا ہوگا۔زیٹونی نے اُس خاتون سے تکرار شروع کر دی مگر اوما نے کہا،"آنٹی وہ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ہمیں چلنا چاہیے۔" گاڑی میں بیٹھ کر ہم نے جارج کو اپنے دوستوں کے پاس میدان میں جاتے دیکھا،وہ فوراً ہی گول سر اور پتلی ٹانگوں والے اپنے ہم عمر لڑکوں میں گم ہو گیا جو گھاس پر ایک گھسے ہوئے فٹ بال کا تعاقب کر رہے تھے۔اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں اُس بوڑھے کے ساتھ اپنی پہلی ملاقات کی یادوں میں کھویا ہوا ہوں،اُس کی موجودگی کی وجہ سے مجھے خوف اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑا،جس کی وجہ سے مجھے اپنی زندگی کے معمے پر غور کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔پھر مجھے یہ سوچ کر تسلی ہوگئی کہ شاید بڑا ہو کر ایک دن جارج خود میرے پاس آئے اور مجھ سے اپنے والد کے بارے میں جاننے کی کوشش کرے،اپنے بہن بھائیوں کے بارے میں جاننے کی کوشش کرے،اگر ایسا کبھی ہوا تو میں ہمیشہ اُس کی مدد کے لیے تیار رہوں گا،اُس کو وہ سب کچھ بتاؤں گا جو مجھے پتا ہے۔

اُس شام میں نے اوما سے پوچھا کہ اُسے Lou کے متعلق کسی اچھی کتاب کے بارے میں پتا ہے تو اُس نے شام کو تاریخ کی اپنی سابق استانی ڈاکٹر رقیہ اوڈیرو سے ملنے کا مشورہ دیا جو بوڑھے دوست بھی تھی۔وہ ایک دبلی پتلی دراز قد خاتون تھی۔جب ہم اُس کے گھر پہنچے تو ڈاکٹر اوڈیرو رات کا کھانا کھانے کے لیے تیار بیٹھی تھی،اُس کے اصرار پر ہم بھی ساتھ شامل ہو گئے۔"تلاپیہ" اور"ugali" کھانے کے دوران اس نے اِرارہ کیا کہ میں اسے پروفیسر کے بجائے رقیہ کہہ کر پکاروں اور پھر مجھ سے کینیا کے بارے میں میرے تاثرات پوچھے۔کیا مجھے یہاں آ کر مایوسی ہوئی؟ جو اُن کا خیال تھا۔میں نے کہا کہ بے شک میں یہاں سے اُتنے ہی سوال لے کر جا رہا ہوں جتنے جواب، پھر بھی مایوسی والی کوئی بات نہیں ہے۔

رقیہ نے گلاس اپنی موٹی ناک کے پاس لا کر کہا،"یہ تو اچھی بات ہے۔جیسا کہ تم جانتے ہو، ہم جیسے مؤرخ ایسی ہی زندگی گزارتے ہیں۔ہم سارا دن بیٹھ کر سوال تلاش کرتے رہتے ہیں۔یہ بہت تھکا دینے والا کام ہے۔اس کے لیے مستقل مزاجی چاہیے۔تم جانتے ہو کہ بہت سے نوجوان سیاہ فام امریکیوں کے ذہن میں افریقہ کا رومانی تصور ہے۔جب میں اور تمہارا باپ جوان تھے تو معاملہ اُلٹ تھا۔تب ہم تمام جواب امریکہ میں ڈھونڈ رہے تھے۔ہارلیم- شکاگو-لینگسٹن-ہیوز اور جیمز بالڈوِن۔ہم اُن سے متاثر تھے،اور کینڈیز سے بھی جو اُن دنوں بہت مشہور تھے۔امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے کا موقعہ بہت اہم تھا۔ایک امیدوں بھرا وقت۔بے شک واپسی پر ہمیں اندازہ ہوا کہ ہماری اعلیٰ تعلیم نے یہاں ہمیں ہمیشہ بھرپور فائدہ نہیں پہنچایا۔یا ہمیں بھیجنے والے لوگوں نے ہم سے فائدہ نہیں اٹھایا۔یہاں اس بکھری ہوئی کر دہ تاریخ سے نمٹنا پڑتا ہے۔"

میں نے پوچھا کہ آخر اس کے خیال میں افریقہ کا دورہ کرنے والے سیاہ فام امریکی نوجوانوں کو مایوسی کیوں ہوتی۔اس نے سر ہلایا اور مسکرا کر بولی:"وہ یہاں مطلق سچائی کی تلاش میں آتے ہیں۔ایسی تلاش کسی بھی شخص کو مایوس کر دے گی۔اس کھانے کی طرف غور کرو۔بہت سے لوگ تمہیں کہیں گے کہ لو مچھلی کھانے والے لوگ تھے۔مگر یہ بات تمام لو لوگوں کے لیے درست نہیں ہے۔یہ صرف اُن افراد کے لیے درست ہے جو جھیلوں کے کناروں پر رہتے تھے۔تاہم، بہت سی صورتوں میں تو یہ اُن کے لیے بھی ٹھیک نہیں ہے۔جھیلوں کے کناروں پر آباد ہونے سے پہلے وہ بھی پڑوسیوں کی طرح چرواہے تھے۔اب اگر تم اور تمہاری بہن تہذیب کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیٹ بھر کر کھانا کھا لو تو میں چائے کا انتظام کروں۔تم نے یہ بھی محسوس کیا ہوگا کہ کینیا کے لوگ اپنی چائے کی پتی کے معیار پر بہت شیخیاں بگھارتے ہیں۔ہماری یہ عادت انگریزوں کی دین ہے۔ہمارے آباواجداد ایسی کوئی چیز نہیں پیتے تھے۔پھر یہاں مچھلی پکانے میں استعمال ہونے والے مسالے ہیں۔یہ بھی اصل میں ہندوستان یا انڈونیشیا سے آئے ہیں۔اس وجہ سے ہمارے سامنے موجود اس سادہ سے کھانے میں بھی صداقت ڈھونڈنا بہت مشکل کام ہے، حالانکہ یہ کھانا افریقی ہے۔"

رقیہ نے اوگالی کا ایک گولا اپنے ہاتھ میں لے کر گھمایا اور سوچ میں ڈوب گئی۔ ''بے شک اپنے حقیقی ماضی کے متلاشی سیاہ فام امریکیوں کو اس کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ اخباروں میں اکثر اُن پر ڈھائے جانے والے مظالم کی کہانیاں چھپتی رہتی ہیں۔ وہ اس خواہش کا اظہار کرنے والی اکیلی نسل نہیں ہیں۔ یورپ میں بھی لوگ اس سوال کا جواب چاہتے ہیں۔ جرمن، انگریز.....، وہ سب ایتھنز اور روم کو اپنا کہتے ہیں جبکہ اُن کے آباواجداد نے تاریخی ورثے کو تباہ کرنے میں مدد دی ہے۔ تاہم، اس سب کو بہت عرصہ بیت چکا ہے، اس لیے اُن کا کام آسان ہے۔ اُن کے سکولوں میں شاید ہی آپ تحریری تاریخ میں یورپی کسانوں پر ہونے والے مظالم کی بات سنیں...... صنعتی انقلاب کے نتیجے میں ہونے والا استحصال اور کرپشن، بے مقصد قبائلی جنگیں۔ یہ بہت شرمناک بات ہے کہ یورپی اپنے ساتھ یہ سلوک کرتے ہیں، بے رنگ لوگ۔ اس لیے گوروں کی آمد سے پہلے کے افریقہ کو سنہری دور تصور کرنا فطری بات ہے۔''

''ایک اصلاح،'' اوما نے کہا۔

رقیہ مسکرا کر بولی: ''سچ عام طور پر سب سے بہترین اصلاح ہوتی ہے۔ تم جانتی ہو کہ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ نوآبادیت نے ہماری تاریخ کو مسخ کر کے ہمارے ساتھ سب سے بڑی زیادتی کی ہے۔ گورے نہ آئے ہوتے تو ہم اپنی تاریخ سے زیادہ بہتر طور پر استفادہ کر سکتے تھے۔ ہم شاید اپنی پرانی روایات پر غور کرتے اور اُن کو قابلِ عمل پا کر دوبارہ اُن پر عمل پیرا ہو جاتے۔ شاید باقی ماندہ میں اصلاح کر کے بہتری لاتے۔ بدنصیبی سے گوروں نے ہمیں مورچہ بند کر دیا ہے۔ اس وجہ سے ہم ایسی بہت سی چیزوں سے جُڑ گئے ہیں جن کی افادیت ختم ہو چکی ہے...... کثرتِ ازدواج، زمین کی مشترکہ ملکیت۔ ان چیزوں کی اپنے دور میں افادیت تھی، مگر اب یہ زیادہ تر صورتوں میں استحصال کا آلہ کار بن گئیں ہیں...... مردوں اور حکومتوں کے ہاتھ میں۔ اگر آپ یہ سب کچھ کہتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ آپ یورپی نظریات سے متاثر ہیں۔''

''تو ہم مطابقت کیسے پیدا کریں؟'' اوما نے پوچھا۔

رقیہ نے کندھے اچکائے۔ ''میں اس سوال کا جواب پالیسی سازوں پر چھوڑ دیتی ہوں۔ تاہم، مجھے شک ہے کہ ہم کبھی یہ ظاہر کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے کہ ہمارے موجودہ حالات

میں اختلافات جیسی مثال وجود ہی نہیں رکھتی۔ ہم صرف انتخاب کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر عورتوں کے ختنے Kikuyu کی اہم رسم ہے۔ یہ پڑوسیوں کے لیے بھی اہم ہے۔ جدید نکتۂ نظر کے مطابق یہ عمل وحشیانہ ہے۔ کم از کم ہم ان علاقوں میں یہ کام ہسپتالوں میں کروا کر خواتین کی اموات کی تعداد تو کم کر سکتے ہیں۔ اس طرح خون کا ضیاع بھی کم ہو گا۔ اس کے برعکس عورتوں کے ختنوں کی رسم کو رکوانے کی کوشش کے باوجود آدھا بھی نہیں کروایا جا سکتا۔ اس سے کسی کو بھی سکون نہیں ملے گا۔ اس لیے ہمیں انتخاب کرنا ہو گا۔ یہ قانون کے نفاذ اور غیر جانبدارانہ تحقیق کے لیے بھی لازمی ہے...... یہ چیز قبائلی وفاداریوں سے متصادم ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ قانون کی حکمرانی قائم کریں اور پھر اپنے قبیلے کے مخصوص ارکان کو مستثنیٰ بھی کر دیں۔ تو کیا کیا جائے؟ اگر آپ نے غلط انتخاب کیا تو اپنی خطاؤں سے سیکھ جائیں گے۔ یہ چیز کارآمد ہے۔''

میں نے انگلیوں کو چاٹا اور پھر ہاتھ دھوئے۔ ''کیا یہاں ایسا کچھ باقی نہیں جو حقیقی معنوں میں افریقی ہو؟''

''اچھا، تو یہ بات تھی، ہے نا؟ یہاں تمہیں یقینی طور پر کچھ مختلف محسوس ہوا ہو گا۔ میں نہیں جانتی یہ کیا ہے۔ شاید افریقی لوگ لمبا سفر بھی بہت تیزی سے طے کر لیتے ہیں، اس لیے اُن کا وقت کے بارے میں نظریہ بہت مختلف ہے۔ یا شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے باقی سب سے زیادہ مصائب برداشت کیے ہیں۔ شاید یہ سرزمین ہی ایسی ہے۔ میں نہیں جانتی۔ شاید میں بھی رومانوی ہو رہی ہوں۔ میں بس اتنا جانتی ہوں کہ زیادہ دیر تک اس سے دور نہیں رہ سکتی۔ لوگ یہاں اب بھی ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں۔ جب میں امریکہ گئی تو مجھے وہ جگہ بہت تنہا لگی۔'' رقیہ نے کہا۔

اچانک پورا گھر اندھیرے میں ڈوب گیا۔ رقیہ نے آہ بھرتے ہوئے کہا کہ آج کل لوڈشیڈنگ بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ میں نے فوراً اپنی جیب سے لائٹر نکال کر دیا تاکہ رقیہ مینٹل پیس میں پڑی موم بتیاں روشن کر سکے۔ اندھیرے میں بیٹھے مجھے زیتونی کی سنائی ہوئی کہانیاں یاد آ رہی تھیں۔ رقیہ نے موم بتیاں روشن کیں، مدھم سی روشنی سے اس کے چہرے پر جو کر جیسا ماسک بن گیا۔

تھوڑی دیر بعد بجلی آ گئی۔ رقیہ نے موم بتیاں بجھائیں اور سکھ کا سانس لیا۔ ''آہ، شہروں میں

آخر کار بجلی آ ہی جاتی ہے۔ جانتے ہو کہ میری بیٹی کی مادری زبان لُو نہیں اور نہ ہی سواحلی بلکہ انگلش ہے۔ جب میں اُس کو دوستوں سے بات کرتے سنتی ہوں تو کچھ سمجھ نہیں آتا۔ وہ بہت سی زبانوں کے مختلف الفاظ بولتے ہیں، کبھی انگریزی، کبھی سواحلی، کبھی جرمن تو کبھی لُو۔ کبھی کبھی تو بہت غصہ آتا ہے۔ میں پھر غصے میں آ کر کہتی ہوں کہ کوئی ایک زبان اچھی طرح سیکھ لو۔'' رقیہ دل ہی دل میں ہنسی ہنسی۔ ''مگر اب میں ہار مانتی جا رہی ہوں، کیونکہ میں کچھ کر بھی تو نہیں سکتی۔ وہ ایک مخلوط دنیا میں رہتے ہیں۔ شاید یہی درست ہو۔ آخر میں، میں بھی ایک ایسی بیٹی کی زیادہ خواہش مند نہیں جو مصدقہ طور پر افریقی ہو، میں چاہتی ہوں کہ وہ مصدقہ طور پر 'وہ' ہو۔''

کافی دیر ہو گئی تھی۔ ہم نے رقیہ کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا اور اپنے راستے پر چل دیے۔ مگر اُس کے الفاظ میرے ساتھ رہیں گے...... میری یادوں کا حصہ بن کر، میرے اپنے پرانے سوالوں کا حصہ بن کر۔ اپنے دورے کے آخری ہفتے کے آخری ایام میں اوما اور میں ٹرین کے ذریعے ساحلی علاقوں کی طرف گئے اور مومباسا کے اولڈ بیچ فرنٹ ہوٹل میں ٹھہرے۔ کسی دور میں یہ بوڑھے کا پسندیدہ مقام تھا۔ یہ ایک پُر وقار اور صاف جگہ تھی۔ اگست کے مہینے میں یہاں جرمن سیاحوں اور امریکی ملاحوں کا ہجوم رہتا ہے۔ ہم نے زیادہ کچھ نہیں کیا، بس سوئمنگ، ساحل پر چہل قدمی اور کیکڑوں کو تیزی سے اپنے مٹی کے گھروں میں جاتے ہوئے دیکھنا۔ اگلے دن ہم مومباسا کے پرانے شہر کی طرف گئے اور Fort Jesus کی سیڑھیوں پر چڑھے۔ سب سے پہلے پرتگالیوں نے بحرِ ہند کی تجارت پر قابو پانے کے لیے یہ قلعہ بنایا تھا، جسے بعد میں عمانی بیڑوں نے تباہ کر دیا۔ تاہم، جب برطانوی ہاتھی دانت اور سونے کی تلاش میں آئے تو اس وقت بھی یہاں ساحلی علاقے پر قابض ہونے کے لیے بہترین اڈہ موجود تھا۔ اب یہ پتھروں کا خالی ڈھانچہ ہے، اس کی بڑی بڑی دیواروں کے اندر مالٹے اور گلاب کے پودے موجود ہیں۔ ساحلِ سمندر کا رُخ کیے ہوئے اس کی بے حس و حرکت توپیں اُس مچھیرے کی مانند معلوم ہوتی ہیں کہ جس کے پاس جال نہ ہو۔

نیروبی واپسی پر اوما اور میں نے کچھ شاپنگ کا فیصلہ کیا۔ ہم نے ایک ایسی بس کے ٹکٹ خریدے جو واقعی سیٹ نمبر دے جاتے تھے۔ تاہم، آرام کا احساس بہت مختصر تھا۔ کچھ دیر بعد ہی اگلی

سیٹ پر بیٹھے مسافر نے اپنی دی ہوئی رقم کے عوض بھرپور آرام حاصل کرنے کی خاطر سیٹ پیچھے کی اور میرے گھٹنے دبا دیے۔ اس کے بعد اچانک بارش شروع ہو گئی اور پانی کھڑکیوں کی درزوں سے اندر آنے لگا۔ ہم نے درزوں میں ٹشو پیپرز پھنسا کر پانی روکنے کی ناکام کوشش کی۔

آخر کار بارش رک گئی، ہم نے کھڑکی سے جھانکا تو ہر طرف بنجر زمین پر کیچڑ اور جھاڑیاں نظر آ رہی تھیں، کہیں کہیں باؤبب (baobab) کے اُجڑے ہوئے درخت بھی تھے۔ اُن کی خالی شاخیں بیا کے بیضوی گھونسلوں سے سجی ہوئی تھیں۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ باؤبب کے درخت پھول پتوں کے بغیر بھی کئی سال تک زندہ رہ سکتے ہیں۔ یہ بارش کی کم ترین مقدار میں بھی گزارا کر لیتے ہیں۔ اُس دھندلی روشنی میں ان درختوں کو دیکھ کر مجھے لوگوں کا یہ عقیدہ سمجھ میں آیا کہ ان درختوں کو خاص طاقت عطا کی گئی ہے، ان میں ہمارے آباؤ اجداد کی روحیں اور بدروحیں رہتی ہیں، اور نسلِ انسانی انہی درختوں کے نیچے وجود میں آئی تھی۔ ان درختوں کی عجیب ہیئت صرف ان عقائد کی وجہ نہیں ہے بلکہ اس دھرتی پر ان کا قبل از تاریخ وجود بھی اس کی اہم وجہ ہے۔

''یوں لگتا تھا جیسے ہر ایک کے پاس اپنی کہانی ہے،'' اوما بولی۔ یہ سچ معلوم ہوتا تھا، ہر درخت کا اپنا کردار تھا، ایسا کردار جو شفیق اور نہ ہی ظالمانہ تھا، مگر صابر تھا، جس میں موجود رازوں تک کبھی رسائی کبھی نہیں ہو سکتی۔۔۔ ایسی دانش جس کو معلوم نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے مجھے پریشانی کے ساتھ ساتھ راحت بھی دی۔ لگتا تھا کہ وہ اپنی جڑیں زمین میں سے کھینچیں گے اور کسی طرف چل پڑیں گے۔

مجھے پہلی مرتبہ کینیا کا دورہ کیے چھ سال ہو چکے ہیں اور اس دوران دنیا بہت بدل گئی ہے۔ میرے لیے یہ نسبتاً سکون کا عرصہ تھا...... کچھ نیا دریافت کرنے کے بجائے خود کو مجتمع کرنے کا عرصہ، ایسے کام کرنے کا دور جو ہمیں آگے بڑھنے کے لیے کرنا ہی پڑتے ہیں۔ میں ہارورڈ لا سکول چلا گیا جہاں تین سال تک میں مدھم روشنیوں والی لائبریریوں میں مقدمات اور آئین سازی کے عمل پر کام کرتا رہا۔ قانون کا مطالعہ کبھی کبھار مایوسی کا سبب بھی بنتا ہے۔ سخت قوانین اور لچکدار طریقۂ کار کو مبہم حقائق پر لاگو کرنا پڑتا ہے۔ یہ عظیم الشان اکاؤنٹنگ کے مانند ہے جس کا مقصد بارسوخ لوگوں کے مالیاتی معاملات منظم کرنا ہے۔

تاہم، قانون صرف یہ نہیں ہے۔ قانون ہمارا حافظہ بھی ہے۔ قانون طویل مکالموں کا ریکارڈ بھی رکھتا ہے جن میں کوئی قوم اپنے ضمیر کے ساتھ دلیل بازی کرتی ہے۔

ہم ان حقائق کو صادق بالذات تسلیم کرتے ھیں۔ ان الفاظ میں مجھے ڈگلس اور ڈیلانی کی روح بولتی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ جیفرسن اور لنکلن کی روح بھی۔ مجھے اس میں مارٹن اور میلکم کی جدوجہد نظر آتی ہے اور آزادی کی طرف گامزن ان لوگوں کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے جنھوں نے ان الفاظ کو زندگی بخشی۔ مجھے ان میں خاردار تاروں میں جکڑے ہوئے جاپانی خاندانوں کی آوازیں آتی ہیں، مجھے لوئر ایسٹ سائیڈ کے کارخانوں میں کام کرتے نوجوان روسی یہودیوں کی آوازیں آتی ہیں، اُن کسانوں کی سسکیاں یاد آتی ہیں جو ٹرکوں میں اپنی بکھری ہوئی زندگی لاد رہے تھے۔ مجھے گارڈنز کے لوگوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں، اور سرحد پار لڑتے لوگوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں...... بھوکے اور پریشان حال لوگ جو ریو گراندے پر سراپا احتجاج تھے۔ مجھے یہ تمام آوازیں خود سے سوال کرتی محسوس ہوتی ہیں؛ یہ تمام آوازیں وہی سوال پوچھتی ہیں جنھوں نے میری زندگی کو متشکل کیا۔ میں کبھی کبھار رات گئے خود کو بوڑھے سے یہی سوالات پوچھتے ہوئے پاتا ہوں۔ ہماری کمیونٹی (برادری) کونسی ہے اور وہ کمیونٹی ہماری آزادی کے ساتھ کیسے میل کھاتی ہے؟ ہمارے فرائض کی حدود کہاں تک ہیں؟ ہم محض طاقت کو انصاف اور محض جذبے کو محبت میں کیسے تبدیل کریں؟ قانون کی کتابوں میں ملنے والے جواب مجھے ہمیشہ ہی تسکین نہیں دے سکے۔ مجھے سینکڑوں ایسے مقدمے نظر آتے ہیں جن میں ضمیر فوری طریقہ کار یا لالچ پر قربان ہو گیا۔ اس کے باوجود مجھے گفتگو سے حوصلہ ملتا ہے، اور مجھے یقین ہے کہ جب تک سوالات پوچھے جاتے رہیں گے تب تک ہمیں باندھے رکھنے والے بندھن ہی غالب آئیں گے۔

کبھی کبھی ایمان ...... جو معصومیت سے بہت مختلف ہے...... کو قائم رکھنا مشکل ہوتا ہے۔

شکاگو واپسی پر مجھے سارے ساؤتھ سائیڈ علاقے میں انحطاط کا عمل اور بھی تیز ہوتا نظر آیا۔ مکانات کی حالت خراب تھی، بچے بدتمیز اور بے قابو ہو رہے تھے، بہت سے متوسط گھرانے مضافات چھوڑ کر جا رہے تھے، جیلوں میں نوجوانوں کی تعداد بڑھ رہی تھی، میرے بھائیوں کا مستقبل تاریک تھا۔ میں شاذ و نادر ہی لوگوں کو اس بارے میں سوال کرتے سنتا ہوں کہ آخر ہم نے ایسا کیا کیا کہ ان

بچوں کے دل اس قدر سخت ہو گئے، یا ہم ان کا اخلاقی انداز درست کرنے کے لیے مل جل کر کیا کر سکتے ہیں۔ اس کے بجائے میں دیکھتا ہوں ہم وہی کر رہے ہیں جو ہمیشہ سے کرتے آئے ہیں...... ہم یوں ظاہر کرتے ہیں کہ جیسے وہ بچے ہمارے نہیں۔

میں نے اس طوفان کا رُخ موڑنے کے لیے اپنا سا کردار ادا کیا۔ میں لیگل پریکٹس کے دوران زیادہ تر کمیونٹی گروپس اور چرچز کے ساتھ کام کرتا رہا، اُن مرد و خواتین کے ساتھ جو خاموشی سے اندرونِ شہر دکانیں اور ہیلتھ کلینک، اور غریبوں کے لیے گھر بنواتے ہیں۔ اکثر میرے پاس امتیازی سلوک کے مقدمے آتے۔ دفتر میں آنے والے لوگ مجھے ایسی باتیں بتاتے ہیں جنھیں اب ہم معدوم تصور کرتے ہیں۔ اکثر موکل اپنی کہانی سنانے کے دوران شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔ جب اُن کے حق میں گواہی دینے کے لیے ساتھ کام کرنے والے سفید فام لوگوں کو بلایا جاتا تو اُن کے چہروں پر بھی یہ احساس نمایاں ہوتا۔ کوئی بھی شخص مسائل کھڑے نہیں کرنا چاہتا۔ پھر بھی کسی موقعے پر مدعی اور گواہ اس نتیجے پر پہنچتے کہ کوئی اصول خطرے میں ہے، کہ سب کچھ ہو جانے کے باوجود دو سو سال قبل کاغذ پر لکھے گئے ان الفاظ کا کچھ تو مطلب ہوگا۔ گورے ہوں یا کالے، سبھی امریکہ کہلانے والی اس کمیونٹی کے دعویدار ہیں۔ وہ ہمارے لیے بہتر تاریخ منتخب کرتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ گزشتہ چند برس کے دوران میں نے اپنے اور دوسرے لوگوں کے ساتھ زیادہ تحمل سے پیش آنا سیکھا ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو یہ میرے کردار کی اُن متعدد بہتریوں میں سے ایک ہے جنھیں میں اپنی بیوی میشیل سے منسوب کرتا ہوں۔ وہ ساؤتھ سائیڈ کی رہنے والی خاتون ہے۔ اس نے پرانی طرز کے بنگلہ نما گھروں میں سے ایک میں پرورش پائی جہاں میں شکاگو میں اپنے پہلے برس کے دوران اکثر جاتا رہتا تھا۔ اسے ہمیشہ ہی سمجھ نہیں آتی کہ میرا کیا کرے۔ گرامپس اور بوڑھے کی طرح وہ بھی پریشان ہوتی ہے کہ میں خواب دیکھتا رہتا ہوں۔ درحقیقت وہ اپنے عملی پن اور مڈ ویسٹرن رویوں کے ساتھ مجھے توت کی یاد بھی دلاتی ہے۔ مجھے وہ موقعہ یاد ہے جب میں اُسے ساتھ لے کر پہلی مرتبہ ہوائی گیا۔ گرامپس نے مجھے کہنی ماری اور کہا کہ میشیل ''خوبصورت'' ہے۔ دوسری جانب توت نے میری ہونے والی بیوی کو ''بہت سمجھ دار لڑکی'' قرار

دیا۔ میشیل کے خیال میں یہ الفاظ میری نانی کی جانب سے اعلیٰ ترین تعریف ہیں۔

منگنی کے بعد میں میشیل کو اپنے خاندان کے ددھیالی حصے سے ملوانے کینیا لے گیا۔ وہ سب کے دلوں میں گھر کر گئی، کیونکہ اس کے ذخیرۂ الفاظ میں لُو زبان کے الفاظ کی تعداد میری نسبت بہت جلد زیادہ ہوگئی۔ ایلیگو میں ہمارا وقت بہت اچھا گزرا۔ ہم نے اوما کو اس کے فلم پروجیکٹ میں مدد دی، دادی سے مزید کہانیاں سنیں، جن رشتے داروں کو میں پہلی دفعہ نہیں مل سکا تھا اُن سے بھی ملاقات ہوئی۔ تاہم، دیہی علاقوں سے دور کینیا کی زندگی مزید مشکل ہوگئی تھی۔ معاشی حالات مزید خراب ہو گئے تھے، جس کی وجہ سے کرپشن اور وارداتوں میں اضافہ ہوا تھا۔ ابھی تک بوڑھے کی وراثت کا مسئلہ چل رہا تھا۔ سارہ اور کیزیا کے درمیان بات چیت شروع ہونے کے آثار تک نہیں تھے۔ ابھی تک برنارڈ، ایبو اور سعید کو مستقل کام بھی نہیں ملا تھا، مگر وہ پُر امید تھے۔ وہ ڈرائیونگ سیکھ رہے تھے، کہ شاید مل کر کوئی گاڑی بھی خرید لیں۔ ہم نے سب سے چھوٹے بھائی جارج سے ملنے کی ایک اور ناکام کوشش کی۔ پہلی مرتبہ کینڈو بے جانے پر ملنے والا میرا طاقتور اور ملنسار کزن ایڈز میں مبتلا تھا۔ وہ بہت کمزور ہو گیا تھا اور بات چیت کے دوران بار بار اُس کا سر ڈھلک جاتا تھا۔ تاہم، وہ پُرسکون اور مجھے دیکھ کر خوش تھا۔ اس نے فرمائش کی کہ میں اُس کو پچھلی ملاقات میں لی ہوئی اپنی اور اُس کی تصویر بھیجوں۔ میرے تصویر بھیجنے سے پہلے ہی وہ چل بسا۔

اس سال اور بھی لوگ فوت ہوئے۔ میری زندگی کے چند بہترین اور نفیس افراد میں سے ایک میشیل کا باپ بھی اپنی بیٹی کی شادی سے پہلے فوت ہو گیا۔ کینسر کے باعث چند ماہ علالت کے بعد گرامپس کا بھی انتقال ہو گیا۔ دوسری عالمی جنگ میں شمولیت کے باعث اُسے کو ہونولولو میں پہاڑیوں پر واقع پنچ باؤل نیشنل قبرستان میں دفن کیا گیا۔ اس چھوٹی سی تقریب میں اُس کے ساتھ گالف اور تاش کھیلنے والے دوستوں نے شرکت کی، تین رائفلوں کی سلامی دی گئی اور بگل بجایا گیا۔

ان صدمات کے باوجود میشیل اور میں نے طے شدہ پروگرام کے مطابق شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ ریورینڈ یرمیاہ اے رائٹ جونیئر نے ٹرینٹی یونائیٹڈ چرچ آف کرائسٹ کے گرجا گھر میں ہماری شادی کروائی۔ استقبالیہ دعوت میں سب لوگ بہت خوبصورت نظر آ رہے تھے۔ میری نئی آنٹیوں کو کیک بہت پسند آیا، میرے نئے انکل اپنی کرائے کے سوٹوں میں اینڈتے پھر رہے تھے۔

جانی بھی موجود تھا، اور [illegible] کے ساتھ قہقہے لگا رہا تھا۔ ہوائی سے میرے پرانے دوست بھی آئے تھے، خاص طور پر میرا روم میٹ حسن۔ اس کے علاوہ اینجلا، شرلی اور مونا، انہوں نے میری اچھی پرورش پر ماں کو خراج تحسین پیش کیا۔ "تمہیں تصویر کے دوسرے رُخ کے بارے میں کچھ نہیں معلوم،" میری ماں نے ہنس کر جواب دیا۔ میں نے دیکھا کہ کم سن مایا کچھ لڑکوں کی پیش رفت کو ناکام بنانے میں لگی ہوئی تھی۔ مجھے غصہ آگیا اور آگے بڑھنے لگا تو میشیل نے مجھے روک لیا اور پُرسکون رہنے کو کہا اور بتایا کہ میری چھوٹی بہن خود ہی اپنا خیال رکھ سکتی ہے۔ یقیناً اس کی بات درست تھی۔ میں نے اپنی ننھی بہن پر نظر ڈالی اور ایک بھرپور جوان، سیانی اور خوب صورت عورت نظر آئی جو اپنی زیتونی جلد اور لمبے کالے بالوں کے ساتھ کسی لاطینی کاؤنٹس جیسی لگتی تھی۔ اس کے پہلو میں کھڑی اوما بھی اتنی ہی حسین لگ رہی تھی، البتہ اس کی آنکھیں کچھ سوجی ہوئی تھیں۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ پوری تقریب میں ایک وہی ایسی تھی جس نے آنسو بہائے۔ جب بینڈ بجنا شروع ہوا تو اُن دونوں نے میشیل کی پانچ اور چھ سال کی لزنز میں جا کر پناہ لی۔ وہ دونوں بچیاں ہماری شادی کی انگوٹھیاں لیے کھڑی تھیں۔ میں آرام سے کھڑا دیکھ رہا تھا۔ لڑکے میری بہنوں کے ساتھ ناچ رہے تھے: وہ سب اپنے رنگ برنگے کپڑوں میں شہزادیاں معلوم ہو رہی تھیں۔

تاہم، رائے واحد شخص تھا جس نے میرا سر فخر سے بلند کر دیا۔ درحقیقت اب ہم اُسے اُس کے لُو نام ابونگو سے پکارتے ہیں۔ دو سال قبل اُس نے اپنے افریقی ورثے کو منوانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اُس نے اسلام قبول کر کے شراب خوری اور تمباکو نوشی چھوڑ دی۔ وہ اب بھی اپنی اکاؤنٹنگ فرم میں کام کرتا ہے اور کبھی کبھار پیسے جمع کر کے واپس کینیا جانے کی بات بھی کرتا ہے۔ جب میں گاؤں میں اس سے ملا تھا تو وہ دادا کے گھر میں اپنے اور اپنی ماں کے لیے لُو ثقافت کے مطابق جھونپڑی بنانے میں مصروف تھا۔ تب اُس نے مجھے بتایا تھا کہ اُس نے درآمد کا کام شروع کر دیا ہے اور اُسے یقین ہے کہ جلد ہی اچھی آمدنی شروع ہو جائے گی اور وہ ایبو اور برنارڈ کو مستقل اپنے ساتھ رکھ لے گا۔ جب ہم دونوں بوڑھے کی قبر پر حاضری دینے گئے تو وہاں کتبہ لگ چکا تھا۔

ابونگو کی زندگی کے اس نئے رُخ نے اُس کو عاجزی اور مثبت سوچ عطا کی۔ شادی کی تقریب میں وہ کالے افریقی گاؤن اور کڑھائی والی سفید ٹوپی میں بہت باوقار لگ رہا تھا۔ کچھ مہمان تو سمجھے

کہ وہ میرا باپ ہے۔ اس نے واقعی اس روز بڑا بھائی بن کر دکھایا۔ ہم سہاگ رات کے حوالے سے مذاق کرتے رہے۔

اُس میں آنے والی تبدیلیاں کسی تناؤ کے بغیر ہی واقع نہیں ہو گئی تھیں۔ وہ عموماً سیاہ فاموں کو یورپی تہذیب کے زہریلے اثرات سے بچانے کی ضرورت پر طویل وعظ دینے کا عادی ہے اور اوما کو یورپی طور طریقے اپنانے پر جھڑکتا ہے۔ اس کے تمام الفاظ اپنے نہیں ہیں، اور اپنے تبدیلی کے دور میں وہ کبھی کبھی بنیاد پرست بھی لگنے لگتا ہے۔ لیکن اس کی ہنسی کا سحر برقرار ہے، اور ہم بلاخوف اس کے ساتھ اختلاف رائے کر سکتے ہیں۔ اپنی تبدیلی نے اسے کھڑے ہونے کی ٹھوس بنیاد مہیا کی ہے۔ اس نے بنے بنائے فارمولوں اور نعروں کو چھوڑ کر اپنے لیے بہترین راہ کا انتخاب شروع کر دیا ہے۔ وہ خود کو اس عمل سے دور نہیں رکھ سکا، کیونکہ اس کا دل بہت کشادہ اور خوش مزاجی سے بھرپور ہے۔ اس نے سیاہ فام انسان ہونے کے بکھیڑے کے سادہ حل تلاش کر لیے ہیں۔

شادی کی تقریب کے اختتام پر میں نے دیکھا کہ وہ مسکرا مسکرا کر ویڈیو بنوا رہا ہے۔ اُسے اُس کے لمبے بازو توت اور میری ماں کے کندھوں پر پھیلے تھے، اُن کے سر بمشکل اُس کی چھاتی تک پہنچ رہے تھے۔ جب میں اُن تینوں کے پاس پہنچا تو اُس نے کہا، ''آہ، میرے بھائی! آج لگتا ہے کہ میری دو مائیں ہیں۔'' توت نے اُس کو تھپکی دی اور کہا، ''اور ہمیں ایک اور بیٹا مل گیا ہے۔'' البتہ ''ابونگو'' کہتے وقت اس کی کنساس لہجہ بولنے کی عادی زبان لڑکھڑا گئی۔ میری ماں کی ٹھوڑی بھی دوبارہ تھر کنے لگی۔ تب ابونگو نے فروٹ پنچ کا اپنا گلاس اٹھایا اور 'چیئرز' کہا۔

''اُن لوگوں کے نام جو آج ہمارے درمیان موجود نہیں،'' اُس نے کہا۔

''اور ایک خوشگوار انجام کے نام،'' میں نے کہا۔

اس کے ساتھ ہی ہم نے ایک ہی سانس میں جام پی لیا۔ اور کم از کم اس لمحے میں نے خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین شخص محسوس کیا۔

❀❀